

خفا
2015

PDFBOOKSFREE.PK

ہر گھر کے لیے



جلد 37 شماره 12

دسمبر 2015ء

قیمت - 60/- روپے

مدیر اعلیٰ : سردار محمد محمود

مدیر : سردار طاہر محمود

نائب مدیران : تسنیم طاہر

ارم طارق

ربیعہ شہزاد

عاصمہ راشد

مدیرہ خصوصی : فوزیہ شفیق

قانونی مشیر : سردار طارق محمود

(ایڈووکیٹ)

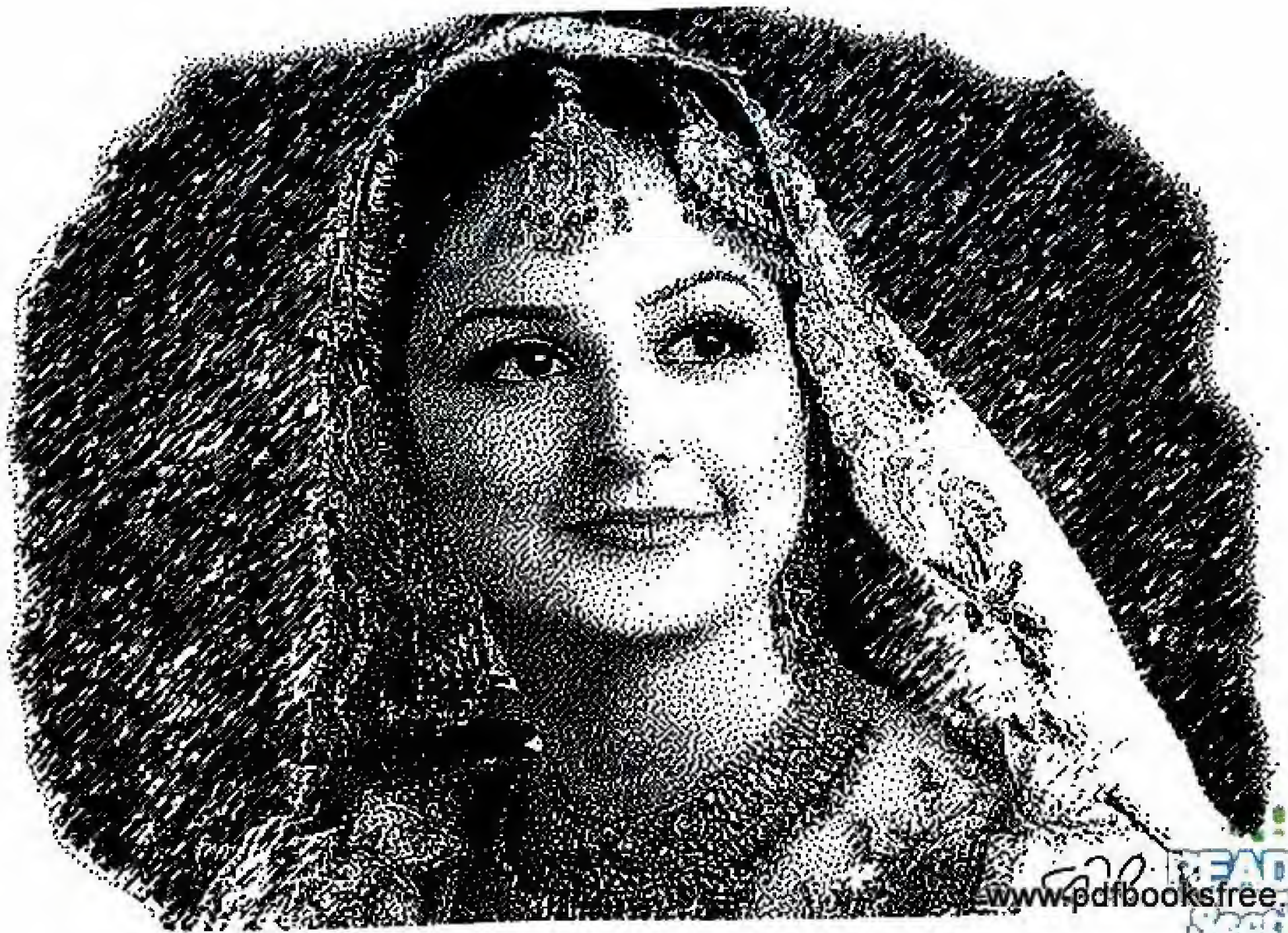
آرٹ اینڈ ڈیزائن : کاشف گوریجہ

اشتہارات : خالدہ جیلانی

0300-2447249

برائے لاہور : افراز علی نازشر

0300-4214400





15 ایک دن حنا کے ساتھ

7 حمد
7 نعت
8 پیارے نبی کی پیاری باتیں سیدنا ہزار



130 پرہیز کے اس پار تھیں
210 اک جہاں اور ہے
16 دل گزیدہ

تاریخ کے چند دور



40 محبت میں جھپکتا موسم
72 اعتبار چھ رنگوں کا

152 بریکنگ نیوز
169 باد صبا بھر جائے
190 تم میں اور بھگیا دسمبر
197 تیر کی چابست کے نام
229 سوئٹن اور تھیلی



104 خواب خوانش اور آرزو
164 زندگی خوبصورت ہے

سردار طاہر محمود نے نواز پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر دفتر ماہنامہ حنا 205 سرکلر روڈ لاہور سے شائع کیا۔
خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ، **ماہنامہ حنا** پہلی منزل محمد علی امین میڈیسن مارکیٹ 207 سرکلر روڈ
اردو بازار لاہور فون: 042-37321690, 042-37310797 ای میل ایڈریس،
monthlyhina@hotmail.com, monthlyhina@yahoo.com



246	تسليم طاہر	235	بیاض	تحريم محمود	حاصل مطالعہ
250	افراح طارق	238	حنا کا دسترخوان	سائر محمود	میری ڈائری سے
255	کس قیامت کے یہ نامے فوزیہ شفیق	243		بقتیس جی	رنگ حنا
		241		مین مین	حنا کی محفل

☆☆☆

انتباہ: ماہنامہ حنا کے جملہ حقوق محفوظ ہیں، پبلشر کی تحریری اجازت کے بغیر اس رسالے کی کسی بھی کہانی، ناول یا سلسلہ کو کسی بھی انداز سے نہ تو شائع کیا جاسکتا ہے، اور نہ کیسی ٹی وی چینل پر ڈرامہ، ڈرامائی تشکیل اور سلسلے وار قسط کے طور پر کسی بھی شکل میں پیش کیا جاسکتا ہے، خلاف ورزی کرنے کی صورت میں قانونی کارروائی کی جاسکتی ہے۔



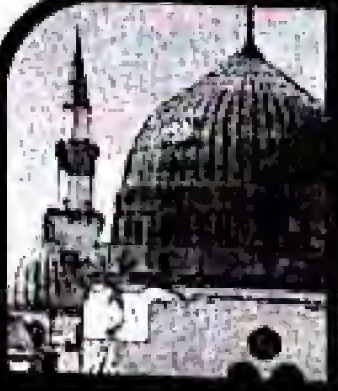
قارئین کرام! دسمبر 2015ء کا شمارہ پیش خدمت ہے۔

اسلام امن و سلامتی کا دین ہے۔ اس میں اپنے پرائے، مرد، عورت، معاشرے کے ہر طبقے کے حقوق کا نہ صرف اقرار کیا گیا ہے بلکہ ان کی ادائیگی پر زور بھی دیا گیا۔ ان حقوق کو حقوق العباد کہتے ہیں اور ان کی ادائیگی کو عبادت کا درجہ دیا گیا ہے۔ انسان اپنی ابتدا سے ہی اپنی بقاء کے لئے دوسروں کی مدد پر انحصار کرتا ہے۔ ماں باپ سے لے کر عزیز واقارب، ہمسائے ارد گرد اور دنیا میں رہنے والے تمام لوگوں کے ساتھ باہمی تعلقات نسل انسانی کی بقاء کی ضمانت ہیں۔ اسلام کی تعلیم ہے کہ اگر ہم اپنے عزیزوں کے حقوق ادا کرتے ہیں تو اس کے ساتھ غیروں کے حقوق بھی ادا کریں۔ حقوق العباد میں سب سے پہلے والدین کے حقوق کا درجہ آتا ہے پھر ان سے متعلق اعزہ واقارب کے حقوق کا درجہ ہے اس کے بعد جیسے جیسے انسانی معاشرہ وسیع ہوتا جاتا ہے۔ ویسے ویسے انسانی تعلقات وسیع ہوتے جاتے ہیں اور دنیا میں موجود تمام مخلوقات سے اس کے خوشگوار تعلقات کی ابتدا ہوتی ہے۔ ہر ایک کے لئے کم از کم حق جو اللہ کے رسول نے بتایا ہے وہ میٹھا بول ہے۔ آپ نے تمام انسانوں کی بہتری اور بقاء کے لئے اپنے کردار سے ایسا نمونہ پیش کیا ہے جو تا قیامت نسل انسانی کی رہبری کرتا رہے گا۔ آپ کو دونوں جہانوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ کوئی بھی طبقہ آپ کی توجہ اور حسن سلوک سے محروم نہ تھا۔ آپ سب سے پہلے خود حقوق العباد ادا کرتے اور پھر دوسروں کو ان کی تاکید کرتے۔ ہم آپ کے اُمتی ہیں۔ آپ کے اسوہ حسنہ کی پیروی ہمارے لئے لازم ہے۔ آئیے دعا کریں کہ ہم اپنے کردار سے ایسا نمونہ پیش کریں تاکہ مسلمانوں کو دہشت گرد کہنے والوں کے منہ بند ہو جائیں گے اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمیں نیک نیتی سے حقوق العباد کی ادائیگی کی توفیق عطا فرمائے آمین۔

سالگرہ اور سال نو: جنوری کا شمارہ حسب سابق ”سال نو“ اور ”سالگرہ نمبر“ ہوگا مصنفین سے گزارش ہے کہ اپنی تحریریں دس دسمبر تک بھیج دیں تاکہ جنوری کے شمارے میں شائع ہو سکیں۔

اس شمارے میں: ایک دن حنا کے ساتھ میں مہمان فرزانہ حبیب، صاعقہ عاطف اور سعدیہ عابد کے مکمل ناول، فرح طاہر اور مبشرہ ناز کے ناولٹ، سباس گل، شبانہ شوکت، سونیا چوہدری، عالی ناز اور سیمابنت عاصم، ام مریم، سدرۃ اہلنتی اور نایاب جیلانی کے سلسلے وار ناولوں کے علاوہ حنا کے سبھی مستقل سلسلے شامل ہیں۔

آپ کی آرا کا منتظر
سردار محمود



نعت رسول مقبول ﷺ

حمد باری تعالیٰ



تو جو اللہ کا محبوب ہوا خوب ہوا
یا نبیؐ خوب ہوا خوب ہوا خوب ہوا

شب معراج یہ کہتے تھے فرشتے باہم
سخن طالب و مطلوب ہوا خوب ہوا

اے شہنشاہ رسل فخر رسل ختم رسل
خوب سے خوب خوش اسلوب ہوا خوب ہوا

فخر آدم کو نہ ہوتا جو فرشتہ ہوا
بنی آدم سے جو منسوب ہوا خوب ہوا

داغ ہے روز قیامت میری شام اس کے ساتھ
میں گناہوں سے جو محبوب ہوا خوب ہوا

داغ دہلوی

میں نے تری آنکھوں میں پڑھا اللہ ہی اللہ
سب بھول گیا یاد رہا اللہ ہی اللہ

پھول میں بسی چاندنی راتوں کی نمازیں
خوشبو ہی ستاروں کی دعا اللہ ہی اللہ

پیڑوں کی صفیں پاک فرشتوں کی قطاریں
خاموش پہاڑوں کی ندا اللہ ہی اللہ

بادل کی عبادت ہے برستا ہوا پانی
آنسو کی غزل حمد و ثنا اللہ ہی اللہ

بشیر بدر

جمل اور صفین اور فتنہ عثمان اور شہادت حسین
رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ان کے سوا بہت سے فساد جو
مسلمانوں میں ہوئے (صحیح مسلم)

فتنوں کا بیان

سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم
سیدنا عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نزدیک بیٹھے
ہوئے تھے، انہوں نے کہا۔

”تم میں سے کس نے رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وآلہ وسلم کو فتنوں کا ذکر کرتے ہوئے سنا
ہے؟“

بعض لوگوں نے کہا کہ۔

”ہاں ہم نے سنا ہے۔“

سیدنا عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا۔

”شاید تم فتنوں سے وہ فتنے سمجھے ہو جو آدمی
کو اس کے گھریباور مال اور ہمسائے میں ہوتے
ہیں۔“

تو انہوں نے کہا کہ۔

”ہاں۔“

سیدنا عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ ”ان
فتنوں کا کفارہ تو نماز اور روزے اور زکوٰۃ سے ہو
جاتا ہے لیکن تم میں سے ان فتنوں کے بارے
میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کس نے
سنا ہے جو دریا کی موجوں کی طرح اٹھ کر آئیں
مگے؟“

سیدنا حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ

جب برائی زیادہ ہو جائے

ام المؤمنین زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا
سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
نیند سے جاگے اور فرمایا۔

”لا الہ الا اللہ خرابی ہے عرب کی اس آفت
سے جو نزدیک ہے آج یا جوج اور ماجوج کی آڑ
اتنی کھل گئی۔“

اور (راوی حدیث) سفیان نے دس کا
ہندسہ بنایا، (یعنی انگوٹھے اور کلمہ کی انگلی سے حلقہ
بنایا)

میں نے عرض کیا ”یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وآلہ وسلم! کیا ہم تباہ ہو جائیں گے، ایسی حالت
میں جب ہم میں نیک لوگ موجود ہوں گے؟“

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔
”جب برائی زیادہ ہوگی۔“ (یعنی فسق و
فجور یا زنا یا اولاد زنا یا معاصی)

(صحیح مسلم)

فتنوں کا نزول

سیدنا اسامہ بن زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے
روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ
کے محلوں میں سے ایک محل پر چڑھے پھر فرمایا۔

”تم دیکھتے ہو جو میں دیکھتا ہوں؟ بے شک
میں تمہارے گھروں میں فتنوں کی جگہیں اس
طرح دیکھتا ہوں جیسے بارش کے گرنے کی جگہوں
کو۔“ (یعنی بہت ہوں گے بوندوں کی طرح مراد

لوگ خاموش ہو گئے، میں نے کہا کہ میں نے سنا ہے۔

سیدنا عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا۔

”تو نے سنا ہے تیرا باپ بہت اچھا تھا۔“

سیدنا حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا۔

”میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

سے سنا ہے آپ فرماتے تھے کہ۔

”فتنے دلوں پر ایسے آئیں گے ایک کے

بعد ایک، ایک کے بعد ایک جیسے بورے کی

تیلیاں ایک کے بعد ایک ہوتی ہیں پھر جس دل

میں فتنہ رچ جائے گا اس میں ایک کالا داغ پیدا

ہو گا اور جو دل اس کو نہ مانے گا تو اس میں ایک

سفید نورانی دھبہ ہو گا یہاں تک کہ اسی طرح

کالے اور سفید دھبے ہوتے ہوتے دو قسم کے دل

ہو جائیں گے، ایک تو خالص سفید دل چکنے پتھر کی

طرح جس کو کوئی فتنہ نقصان نہ پہنچائے گا جب

تک کہ آسمان و زمین قائم رہیں، دوسرے کالا

سفیدی مائل یا الٹے کوزے کی طرح جو نہ کسی اچھی

بات کو اچھی سمجھے گا، نہ بری بات کو بری مگر وہی جو

اس کے دل میں بیٹھ جائے۔“

سیدنا حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ

پھر میں نے سیدنا رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حدیث

بیان کی کہ۔

”تمہارے اور اس فتنے کے درمیان میں

ایک دروازہ ہے جو بند ہے مگر نزدیک ہے کہ وہ

ٹوٹ جائے۔“

(صحیح مسلم)

شیطان کا فتنہ ڈالنا

سیدنا جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ۔

”ابلیس اپنا تخت پانی پر رکھتا ہے پھر اپنے

لشکروں کو دنیا میں فساد کرنے کو بھیجتا ہے، پس اس

سے مرتبہ میں زیادہ قریب وہ ہوتا ہے کہ جو بڑا

فساد ڈالے، کوئی شیطان ان میں سے آ کر کہتا

ہے کہ میں نے فلاں فلاں کام کیا، (یعنی فلاں

سے چوری کرائی، فلاں کو شراب پلوائی) تو

شیطان کہتا ہے کہ تو نے کچھ بھی نہیں کیا، پھر کوئی آ

کر کہتا ہے کہ میں فلاں کو نہ چھوڑا یہاں تک کہ

اس میں اور اس کی بیوی میں جدائی کرادی تو اس

کو اپنے پاس کر لیتا ہے کہ ہاں تو نے بڑا کام کیا

ہے۔“ اعمش نے کہا کہ۔

”اس کو چٹا لیتا ہے۔“

(صحیح مسلم)

فتنہ مشرق کی طرف سے ہوں گے

سیدنا سالم بن عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ

عنہ سے روایت ہے کہ وہ کہتے تھے۔

”اے عراق والو! میں تم سے چھوٹے گناہ

نہیں پوچھتا، نہ اس کو پوچھتا ہوں جو کبیرہ گناہ

کرتا ہو، میں نے اپنے والد سیدنا عبد اللہ بن عمر

رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے سنا، وہ کہتے تھے۔

”میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

سے سنا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے تھے کہ

فتنہ ادھر سے آگے گا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

نے اپنے ہاتھ سے مشرق کی طرف اشارہ کیا

جہاں شیطان کے دونوں سینک نکلتے ہیں اور تم

ایک دوسرے کی گردن مارتے ہو (حالانکہ مومن

کی گردن مارنا کتنا بڑا گناہ ہے) اور موسیٰ علیہ

السلام نے فرعون کی قوم کا ایک شخص مارا تھا اور وہ

غلطی سے مارا تھا (نہ بہ نیت، قتل کیونکہ گھونے

سے آدمی نہیں مارتا) اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا

کہ۔

”تم نے ایک خون کیا پھر ہم نے تجھے غم

سے نجات دی اور تجھ کو آزمایا جیسا آزمایا تھا (طہ ۴۰)۔

قیصر اور کسریٰ کے خزانے

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔
”جب کسریٰ (ایران کا بادشاہ) مر گیا تو اس کے بعد کوئی کسریٰ نہ ہوگا اور جب قیصر (روم کا بادشاہ) مر جائے گا تو اس کے بعد کوئی قیصر نہ ہوگا، (اور یہ دونوں ملک مسلمان فتح کر لیں گے) قسم اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ ان دونوں کے خزانے اللہ کی راہ میں خرچ کیے جائیں گے۔“

(صحیح مسلم)

امت کی تباہی

سیدنا ثوبان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔
”اللہ تعالیٰ نے میرے لئے زمین کو لپیٹ لیا (یعنی سب زمین کو لپیٹ کر میرے سامنے کر دیا) تو میں نے اس کا مشرق اور مغرب دیکھا اور میری حکومت وہاں تک پہنچے گی جہاں تک زمین مجھے دکھلائی گئی اور مجھے دو خزانے ملے ایک سرخ اور سفید اور میں نے اپنے رب سے دعا کی کہ میری امت کو عام قحط سے ہلاک نہ کرے اور ان پر کوئی غیر دشمن ایسا غالب نہ کرے کہ ان کا جھٹھا ٹوٹ جائے اور ان کی جڑ کٹ جائے، (یعنی بالکل نیست و نابود ہو جائیں) میرے پروردگار نے فرمایا۔

”اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! جب میں کوئی حکم دیتا ہوں پھر وہ نہیں پلٹتا اور میں نے تیری یہ دعائیں قبول کیں اور تیری امت کو عام

قحط سے ہلاک نہ کروں گا نہ ان پر کوئی غیر دشمن جو ان میں سے نہ ہو ایسا غالب کروں گا جو ان کی جڑ کاٹ دے، اگرچہ زمین کے تمام لوگ (مسلمانوں کو تباہ کرنے کے لئے) اکٹھے ہو جائیں، (مگر ان کو تباہ نہ کر سکیں گے) یہاں تک کہ خود مسلمان ایک دوسرے کو ہلاک کریں گے اور ایک دوسرے کو قید کریں گے۔“

(صحیح مسلم)

تم اگلی امتوں کی راہوں پر چلو گے

سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔
”البتہ تم اگلی امتوں کی راہوں (یعنی گناہوں میں اور دین کی مخالفت میں) پر چلو گے (نہ یہ کہ کفر اختیار کرو گے) بالشت برابر بالشت کے اور ہاتھ برابر ہاتھ کے، یہاں تک کہ اگر وہ گوہ کے سوراخ میں گھسے تو تم بھی گھسو گے۔“
ہم نے عرض کیا۔

”یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! اگلی امتوں سے مراد یہودی اور نصاریٰ ہیں؟“
آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ (اگر یہ نہیں تو) اور کون ہیں؟“

(صحیح مسلم)

قریش تباہ کرے گا

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

”لوگوں کو قریش میں۔۔۔ سے یہ خاندان (یعنی بنی امیہ) ہلاک کرے گا۔“

صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا۔

”پھر ہمیں کیا حکم ہوتا ہے؟“

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ۔
 ”اگر لوگ ان سے الگ رہیں تو بہتر ہے۔“

(صحیح مسلم)

فتنے میں حصہ لینا

سیدنا ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔
 ”اے شک کئی فتنے ہوں گے، خبردار ہو، وہاں کئی فتنے ہوں گے، بیٹھنے والا ان میں سے چلنے والے (لوگوں سے) سے بہتر ہو گا اور بھاگنے والے (لوگوں سے) چلنے والا بہتر ہو گا، خبردار رہو، جب فتنہ اور فساد اترے یا واقع ہو تو جس کے اونٹ ہوں، وہ اپنے اونٹوں میں جا ملے اور جس کی بکریاں ہوں وہ اپنی بکریوں میں جا ملے اور جس کی (کھیتی کی) زمین ہو، وہ اپنی زمین میں جا رہے۔“

ایک شخص نے کہا۔

”یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! جس کے اونٹ نہ ہوں اور نہ بکریاں اور نہ زمین ہو وہ کیا کرے۔“

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

”وہ اپنی تلوار اٹھائے اور پتھر سے اس کی باڑھ کو کوٹ ڈالے، (یعنی لڑنے کی کوئی چیز باقی نہ رکھے جو لڑائی کا حوصلہ ہو) پھر اپنے بچاؤ میں جتنی ہو سکے جلدی کرے، الہی! میں نے تیرا حکم پہنچا دیا، الہی! میں نے تیرا حکم پہنچا دیا۔“

ایک شخص بولا۔

”یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! بتلائیے کہ اگر مجھ پر زبردستی کریں یہاں تک کہ مجھے دو صفوں میں سے یا دو گروہوں میں سے ایک

لے جائیں پھر وہاں کوئی مجھے تلوار مارے، یا تیر آئے اور مجھے قتل کرے؟“
 آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔
 ”وہ اپنا اور تیرا گناہ سمیٹ لے گا اور دوزخ میں جائے گا۔“

(صحیح مسلم)

مسلمانوں کی لڑائی

سیدنا حنف بن قیس کہتے ہیں۔
 ”میں اس ارادہ سے نکلا کہ اس شخص کا شریک ہوں گا (یعنی سیدنا علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا سیدنا معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مقابلے میں شریک ہوں گا) راہ میں مجھ سے سیدنا ابوبکر ملے کہنے لگے کہ۔“

”اے حنف تم کہاں جاتے ہو؟“

میں نے کہا۔

”میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا زاد بھائی کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔“

سیدنا ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا۔

”اے حنف! تم لوٹ جاؤ، کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے تھے کہ جب دو مسلمان اپنی تلوار لے کر لڑیں تو مارنے والا اور جو مارا جائے دونوں جہنمی ہیں۔“

میں نے عرض کیا یا کسی اور نے کہا کہ۔

”یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! قاتل تو جہنم میں جائے گا لیکن مقتول کیوں جائے گا؟“
 آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ۔
 ”وہ بھی تو اپنے ساتھی کے قتل کا ارادہ رکھتا تھا۔“

(صحیح مسلم)

دو مسلمان گروہوں میں لڑائی

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔
”قیامت قائم نہ ہوگی یہاں تک کہ (مسلمانوں کے) دو بڑے بڑے گروہ لڑیں گے، ان میں بڑی لڑائی ہوگی اور دونوں کا دعویٰ ایک ہوگا۔“ (یعنی دونوں کا دین ایک ہوگا اور دونوں یہ دعویٰ کریں گے کہ ہم اللہ کے دین کے لئے لڑتے ہیں۔“)

(صحیح مسلم)

فتنہ کا بیان

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔
”قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، دنیا فنا نہ ہوگی یہاں تک کہ آدمی قبر پر گزرے گا پھر اس پر لیٹے گا اور کہے گا کاش میں اس قبر والا ہوتا اور اس کے ساتھ دین نہ ہوگا مگر بلا.....“

(صحیح مسلم)

ہرج کا بیان

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ۔
”قیامت قائم نہ ہوگی یہاں تک کہ ہرج بہت ہوگا۔“

لوگوں نے عرض کیا۔
”یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! ہرج کیا ہے؟“
آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

”قتل، قتل“ (یعنی خون بہت ہوں گے)
(صحیح مسلم)

قاتل و مقتول کا بیان

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ۔
”قسم اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ دنیا ختم نہ ہوگی یہاں تک کہ لوگوں پر ایک دن آئے گا کہ مارنے والا یہ نہ جانتا ہوگا کہ اس نے کیوں مارا اور جو مارا جائے گا وہ نہ جانے گا کہ کیوں مارا گیا؟“

لوگوں نے کہا۔

”یہ کیسے ہوگا؟“

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔
”کشت و خون ہوگا، قاتل اور مقتول دونوں جہنمی ہیں۔“

(صحیح مسلم)

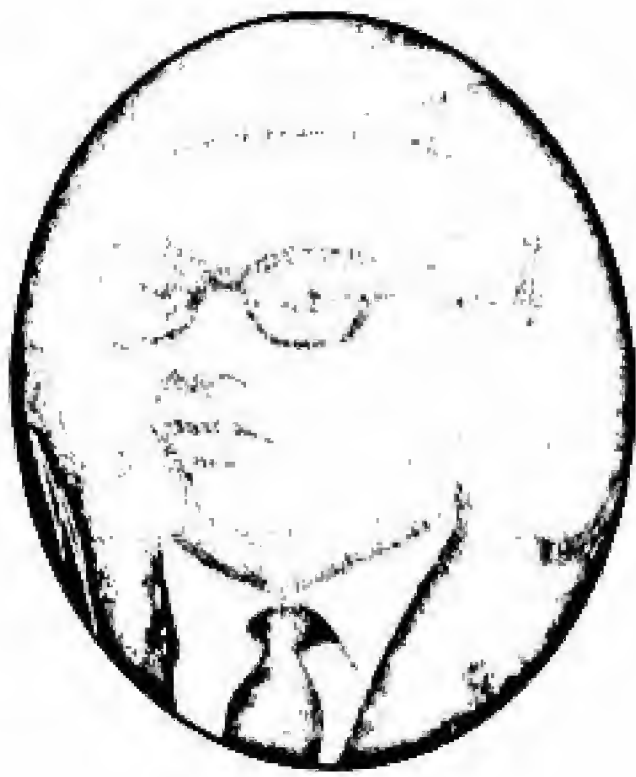
زمین حجاز کی آگ

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

”قیامت قائم نہ ہوگی یہاں تک کہ ایک آگ حجاز کے ملک سے نکلے گی اور وہ بصرہ کے اونٹوں کی گردنوں کو روشن کر دے گی۔“ (یعنی اس کی روشنی ایسی تیز ہوگی کہ عرب سے شام تک پہنچے گی، حجاز مکہ اور مدینہ کا ملک اور بصرہ ایک شہر کا نام ہے)

(صحیح مسلم)





تاریخ کے چند دور

ابن انشا

ہم اور آپ پہن کر خوش رہتے ہیں
بلکہ تھینک یو بھی کہتے ہیں
ایک اور زمانہ ہے آرن اتج

یعنی لوہے کا زمانہ
لوہا وہ دھات ہے
جس کا سب لوہا مانتے ہیں
ہل کا پھل بھی لوہا
کارخانے کی کل بھی لوہا
لوہا مقناطیس بن جاتا ہے
تو چاندی تک کو کھینچ لاتا ہے
سونا کی ایک لوہا کی
سونے والے لوہے والوں سے ڈرتے ہیں
لیکن کوئی کہاں تک رکوائے گا
ہمارے ہاں بھی لوہے کا زمانہ آئے گا
کچا لوہا اور کسی کام نہیں
بس اس سے آدمی بناتے ہیں
جو مرد آہن کہلاتے ہیں
ان کو زنگ لگ جاتا ہے

راہوں میں پتھر
جلسوں میں پتھر
سینوں میں پتھر
عقلوں پہ پتھر
آستانوں پہ پتھر
دیوانوں پہ پتھر
پتھر ہی پتھر

یہ زمانہ پتھر کا زمانہ کہلاتا ہے۔

دیکیں ہی دیکیں
چمچے ہی چمچے
سکے ہی سکے
پیسے ہی پیسے
سونا ہی سونا

چاندی ہی چاندی

یہ زمانہ دھات کا زمانہ کہلاتا ہے۔

لوگ سونے چاندی کو زنجیریں بناتے ہیں
ہمیں اور آپ کو پہناتے ہیں

بلکہ کھا جاتا ہے
پھر بھی لوگ گھورے پر سے اٹھلاتے ہیں
زندہ باد کے نعروں سے جلاتے ہیں

یہ اور دور ہے
لوگ ننگے گھومتے ہیں

کاغذ کا آدمی
کاغذ کے جنگل

کاغذ کے شیر

ذرا نرم ہو تو سب کے سب ڈھیر

کاغذ کے نوٹ

کاغذ کے ووٹ

کاغذ کا ایمان

کاغذ کا مسلمان

کاغذ کے اخبار

اور کاغذ ہی کے کالم نگار

یہ سارا کاغذ کا دور ہے

ننگے ناپتے ہیں

ننگے کلبوں میں جاتے ہیں

ایک دوسرے کو جلسوں میں بنگا کرتے ہیں

عوام تک کے کپڑے اتار لیتے ہیں

بلکہ کھال کھینچ لیتے ہیں

کھالوں سے زر مبادلہ کھاتے ہیں

گوشت کچا کھا جاتے ہیں

نہ چولہا ہے نہ بیخ ہے

یہ زمانہ قبل از تاریخ ہے

ملاوٹ کی صنعت

رشت کی صنعت

www.pdfbooksfree.pk

کوٹھی کی صنعت

پکڑی کی صنعت

حلوے کی صنعت

مانڈے کی صنعت

بیانوں اور نعروں کی صنعت

تعویذوں اور گنڈوں کی صنعت

یہ ہمارے ہاں کا صنعتی دور ہے

کاغذ کے کپڑے

کاغذ کے مکان

اب اس آخری دور کو دیکھئے

پیٹ روٹی سے خالی

جیب پیسے سے خالی

باتیں بصیرت سے خالی

وعدے حقیقت سے خالی

دل درد سے خالی

دماغ عقل سے خالی

شہر فرزانوں سے خالی

جنگل دیوانوں سے خالی

یہ خلائی دور ہے

لوگ تو ہم کے غبارے پھلاتے ہیں

معبون فلک سیر کھاتے ہیں

رویت ہلال کمیٹیاں بناتے ہیں

آسمان کے تارے توڑ لاتے ہیں

ڈٹ کے دبے نوش فرماتے ہیں

بیت الخلا میں مدار پر پہنچ جاتے ہیں

ہمارے ہاں کا خلائی دور یہی ہے

سب سے پہلے حنا اسٹاف اور تمام قارئین کو محبت بھرا سلام۔

میرا اسم گرامی شاید اب اتنا مانوس نہ رہا ہو، قلمی سفر طے کرتے مجھے پورے تین سال مکمل ہو چکے ہیں مگر خود کو ابھی بھی طفل مکتب اور ادب کے سمندر میں ایک معمولی سا قطرہ سمجھتی ہوں، مجھے مطالعے کا شوق بچپن ہی سے تھا مجھے یاد ہے وہ پل جب امی بازار سے کوئی سودا سلف لانے کے لئے کہتی تو اخبار کے ٹکڑے میں لیٹے حرف پہلے میرے ذہن میں اترتے پھر وہ مطلوبہ شے امی تک رسائی حاصل کرتی جب اپنی سینئرز مصنفات کو پڑتی تھی تو حیران رہ جاتی تھی کہ ایسا لگتا تھا جیسے یہ کوئی کتاب نہیں بلکہ طلسماتی دنیا ہے جہاں ہماری رائرز اپنی ساحرانہ شخصیت سے لفظوں کا ایسا طاسم پھونکتی ہیں جو ہمارے اذہان اور دل کو ایک ان دیکھی محبت کی زنجیر میں جکڑ لیتے ہیں اور آج فوزیہ جی کی اپنائیت بھری فرمائش نے مجھے بھی حوصلہ ہوا کہ ایک دن حنا کے ساتھ ساتھ اپنی قارئین کے ساتھ بھی گزاروں۔

جی جناب! میں بھی ایک عام سی لڑکی ہوں عام سی سوچ، پسند و ناپسند ہیں صبح کا آغاز اذان کی خوبصورت سحر انگیز آواز سے ہوتا ہے نماز فجر کے بعد کچھ وظائف وغیرہ پڑھتی ہوں پر سکون ٹھنڈی ہوا میں چہل قدمی اچھی لگتی ہے اس کے بعد سورج بابا جب تھوڑا بیدار ہو جاتا ہے تو ناشتہ (امی یا بہن کے ہاتھ کا بنا ہوا) کرتی ہوں پھر اسکول جانے کی تیاری کرتی ہوں (ارے یہ ان نہ ہو پڑھنے کے لئے نہیں بلکہ میں NISCO اور NED سے بعد تین سال سے درس و تدریس

کے شعبے سے وابستہ ہوں) اسکول سے واپس آ کر نماز ظہر کی ادائیگی کے بعد لنچ کرتی ہوں پھر کچھ دیر آرام کر کے نماز عصر کی ادائیگی کے بعد نہم اور دہم کے طالبات کو ٹیوشن پڑھاتی ہوں، نماز عشاء تک فراغت نصیب ہوتی ہے تو کچن کا رخ کرتی ہوں (آہم میں تھوڑی بہت سکھڑ بیٹی بھی ہوں جناب) رات کی روٹیاں اور کھانا بنانا میری ذمہ داری ہے رات کے کھانے سے فارغ ہو کر اگر موڈ ہوا تو ٹی وی دیکھتی ہوں مگر ہمارے گھر کیبل جیسی خرافات نہیں صرف پی ٹی وی اور پاکستانی ڈرامے دیکھتی ہوں، فلموں سے کوئی لگاؤ نہیں، اس کے بعد میرا اپنا وقت ہوتا ہے فیس بک اور ای میلز ضرور چیک کرتی ہوں اگر اپنا آفیشنل کام ہو تو وہ مکمل کرتی ہوں یا پھر کوئی نیا ناول یا افسانہ لکھنے بیٹھ جاتی ہوں، پھر میرا قلم ہوتا ہے اور صفحہ قرطاس پر بکھرتے لفظوں کا ذخیرہ ساتھ ساتھ ایف ایم سننا پسند ہے، تقریباً گیارہ بجے سوئے کے لئے لیٹتی ہوں مگر مطالعہ کے بغیر نیند نہیں آتی، لہذا نیند کی وادی میں جانے سے پہلے کوئی نہ کوئی کتاب ضرور ہاتھ میں ہوتی ہے اس کے بعد نیند کی دیوی ہم پر مہربان ہو جاتی ہے، آئیٹھ الکرسی اور درود شریف کا ورد کرتے خود کو پرسکون نیند کے آغوش میں دے دیتی ہوں۔

اس طرح رب کے فضل سے ایک مصروف ترین مگر خوبصورت دن کا اختتام ہو جاتا ہے۔

اس دعا کے ساتھ اجازت خوش رہے خوشیاں بانٹیں کیونکہ یہ زندگی بہت حسین مگر مختصر ہے لہذا اس کے ہر پل کو دل سے انجوائے کریں۔

☆☆☆

رات گھنٹی تاریک اور خاموش تھی، بلکہ پر ہول تھی، فضا پہ سناٹا طاری تھا جب ہوا چلتی تو درختوں کے پتے ایسے شور مچانے لگتے گویا اس سناٹا پر ایک آہ بھنگ رہا ہو، مگر اس ٹائم پہ اس جگہ اگر وہ بلا جھجک آگئی تھی تو اس تبدیلی کی وجہ بھی وہی شخص تھا جسے اس نے خود یہاں کا مکین بننے پہ مجبور کر ڈالا تھا، یہ وہی شخص تھا، جس کے متعلق اس پہ بھی انکشاف ہوا تھا اس کے بغیر نہیں رہ سکتی، یہ احساس دیر پا نہیں تھا، جیسا خود ہی اسے خود سے توڑ کر یہاں پھینک دیا، مگر پھر کیا ہوا؟ سکون تو پھر بھی نہ ملا، اس کے ساتھ ساتھ وہ خود بھی اسی ویرانے کی باسی بنی گئی، دن تو جیسے تیسے گزر جاتا، رات گزارنی مشکل تھی، خشک پتوں کی اس کے قدموں تلے دم توڑتی آواز اس کی اپنی سسکیوں میں گھٹ گئی، قبرستان اس وقت بھی ہمیشہ کی طرح تاریک اور سناٹا تھا، برگد کا قبروں پر چھایا ہوا سایہ اور بھی ماحول کو ہیبت ناک بنا رہا تھا، تاریک آسمان پہ بادل اکٹھے ہونا شروع ہوئے تو ہواؤں میں تیزی آگئی، جیسا برگد کی بوڑھی شاخیں جھولنے لگیں، اس کا سسکیوں سے لرزتا وجود برگد کی شاخوں سے نوٹ کر بھرتے پتوں کی ماند ڈولنے لگا، معاوہ یکدم گھٹنوں کے بل زمین پہ گر گئی، اس کے دونوں ہاتھ قبر کی پائنتی کی جانب باہم جھکڑے لرز رہے تھے، آنسو تسلسل سے بہہ رہے تھے۔





”مجھے معاف کر دو پلیز۔“ وہ گویا سسکی، تیز ہواؤں نے اس سرگوشی کو بکھیر دیا، بجلی وقتے وقتے سے چمکنے لگی تھی، اس کی پوزیشن میں فرق نہیں آیا، یہاں تک کہ ہوائیں تیز ہوئیں اور بوندا باندی شروع ہو گئی۔

”سلیمان!“ وہ بے قراری سے سسکی اور قبر پہ اوندھی گر گئی۔

”تمہیں یاد ہے..... تم نے..... تم نے کہا تھا، سلیمان کسی کو اپنی طرف مائل نہیں کرتا، متوجہ نہیں کرتا، کھینچتا نہیں۔“ اس کی آواز غم کی شدتوں سے ٹوٹ رہی تھی، بے حد بوجھل تھی۔

”لوگ خود ہی کھینچے چلے آتے ہیں (اس نے شاید احتیاطاً لڑکیاں نہیں کہا، کہ اس کا دل نہ ٹوٹے) لوگ سلیمان کے ساتھ چلنا چاہتے ہیں، سلیمان کا ہاتھ تھامنا چاہتے ہیں، سلیمان انہیں ساتھ تو چلنے دیتا ہے، مگر ہاتھ کسی کو نہیں تھماتا، اگر ہاتھ تھمائے گا تو لوگ جب پھٹریں گے ان کا دل بھی ٹوٹے گا اور سلیمان دل توڑنے کے کبیرہ گناہ کے ارتکاب سے ڈرتا ہے، وہ لوگوں کو اپنے ساتھ چلنے دیتا ہے، آخر کتنی دیر وہ اس کے ساتھ لمبے راستے پہ چلتے جائیں گے؟ سلیمان کو تو بہت دور جانا ہے، راستہ بھی بہت الگ بہت جدا، وہ کتنی دیر اس کے ساتھ چلیں گے؟ کیا فرق پڑ جائے گا؟ سلیمان تو اک دن اڑنے لگے گا، تب وہ کیا کریں گے؟ اڑنے کے لئے پر کہاں سے لائیں گے؟ سلیمان تو کسی کو ہاتھ نہیں دیتا، پر کہاں سے دے گا؟“ وہ اس کا ہاتھ نہ تھام سکی۔

وہ اس کے ساتھ اڑ نہ سکی

تو اس کے بھی پر کاٹ دیئے

اسے زمین پہ گرادیا

اسے زمین میں دبا دیا

اب وہ کہاں جا سکتا تھا

اب وہ کہیں نہیں جا سکتا تھا، اب وہ صرف اس کا تھا، صرف اس کی ملکیت، اس کی آنکھ سے بکھرتے آنسو تھے اور چہرے کی یاس مسرت میں بدلنے لگی، سسکیاں مسکراہٹ میں مسکراہٹ بنی س قہقہوں میں ڈھل گئی۔

قبرستان میں چھایا سناٹا نسوانی سسکیوں کے بعد بتدریج قہقہوں سے ٹوٹا چلا گیا، سناٹا تاریکی اور بہت گہرا احساس، لمحے خاموشی سے سرکتے رہے، آدھے چاند کے اوپر بادل تیر رہے تھے، کبھی وہ ان میں چھپ جاتا کبھی نکل آتا، درخت دم سادھے کھڑے تھے معمول کے مطابق، یہ منظر یہ آہٹیں یہ آوازیں، کچھ بھی ان کے لئے غیر معمولی نہ ہو، وہ عادی تھے ان سب کے۔

☆☆☆

محبت تو بارش ہے

جسے چھونے کی خواہش میں

ہتھیلیاں تو گیلی ہو جاتی ہیں

مگر ہاتھ ہمیشہ خالی رہتے ہیں

گاڑی کو پھر زوردار جھٹکا لگا تو اوجھستی ہوئی غانیہ کی آنکھ پوری طرح کھل گئی، اس نے لیٹے لیٹے

بازو پھیا کر انگڑائی لی اور چہرے پہ بے زاری و اکتاہٹ سجائے اٹھ کر بیٹھ گئی، گاڑی کے شیشے تاریک ہونے کے باوجود باہر اٹھنے والا گرد و غبار کا طوفان وہ دیکھ کر اندر اٹھتی یا گواری کے باعث ہونٹ باہم بھینچ ڈالے، بالوں کو سمیٹ کر خوب صورت سے بینڈ میں جکڑ رہی تھی جب گاڑی نے ایک بار پھر غوطہ سا کھایا، کچھ اس طرح کہ وہ کسی طور بھی اپنے سر کو چھت سے ٹکرانے سے نہ بچا سکی، ایک لمحے کو صرف تاریکیاں ہی اس کی آنکھوں میں نہیں چھائیں، اسے لگا اس کی گردن کی ہڈی بھی چنچ گئی ہو، دونوں ہاتھوں سے گردن سہلاتے اس نے سخت احتجاجی انداز میں پایا کو دیکھتے بھیکتی آنکھیں کرب بھرے انداز میں جھپکی تھیں، ڈرائیونگ میں مصروف پاپے کچھ کہا بھی تھا، شاید اسی حوالے سے کیئر فل رہنے کی تاکید، جسے سمجھنے کے وہ اب قابل نہیں رہی تھی، اس کے حواس اس کا ساتھ چھوڑتے محسوس ہوئے پہلے سے برہم موڈ کچھ اور بھی سیخ پا ہوا۔

”ابھی اور کتنی دور ہے گاؤں پاپا.....؟“ خاصی تاخیر سے یہ سوال کیا تو گردن کی تکلیف میں کمی ضرور آئی تھی موڈ میں برہمی کا ناگوار ی کا نقطہ عروج پہ ہی پہنچا ہوگا۔

”بس بیٹے! چند منٹ اور ہے انتظار کے، آپ نے تو ویسے بھی سارا سفر سو کے کاٹا۔“ انہوں نے اس کا بے زار کن خفا خفا سا چہرہ بیک و یو مرر سے جانچا اور شفقت سے مسکرائے، ان کی مسکراہٹ بہت تروتازہ تھی، حالانکہ وہ پچھلے کئی گھنٹوں سے مسلسل ڈرائیور کر رہے تھے، ان کی تازگی کی وجہ اسے معلوم تھی، یہ اپنوں سے ملنے کی خوشی تھی جو فرصت کا احساس بن کر انہیں سرشار اور ہشاش بشاش ظاہر کر رہی تھی۔

”آپ کافی پیس گے پاپا؟“ اس نے تھرموس کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے انہیں مخاطب کیا، تھکان کا گہرا احساس اس کے اعصاب کو شدید قسم کے تناؤ سے لبریز کرتا جا رہا تھا۔

”نومانی چائلڈ! کافی بلکہ چائے میں اب گھر پہنچ کے پیوؤں گا اماں اور بھائی جان کے ساتھ، چند منٹ کی بات ہے اب تو۔“ بات کے اختتام تک وہ بے ساختہ مسکرائے تھے، غانیہ نے کوئی تبصرہ کیے بغیر ہاتھ کھینچ لیا، اس کا ارادہ بھی بدل گیا تھا، توجہ گاڑی کے ساتھ لگ کر بھاگنے والے بچوں نے کھینچ لی، جو کہ نانی لباس میں ملبوس موسم کی سختی سے بے نیاز شور مچاتے مگن نظر آ رہے تھے یہ بڑی سی چمکتی مگر دھول میں الٹی گاڑی ان کے لئے اتنی دلچسپی کا باعث تھی کہ کھیل چھوڑ چھاڑ ساتھ ہو لئے تھے، جیسے ہی پاپا نے بریک لگایا، بچوں کا قافلہ خود بخود ختم گیا، اب وہ کچھ فاصلے پر ٹھہرے اپنی معصوم آنکھیں پٹپٹا کر پچھلے دروازے سے برآمد ہونے والی لڑکی کو دیکھ رہے تھے، جس کے کئے ہوئے بال شانوں پر لہراتے تھے اور لباس جینز شرٹ پہ مشتمل تھا، بھلا دیکھا گیا تھا آس پاس اس سے قبل کوئی ایسا عجوبہ، وہ سب ایک دوسرے کے کانوں میں سرگوشیاں کرتے اور دبی دبی ہنسی بنتے اس کی جانب اشارے کرنے میں مصروف تھے، غانیہ نے اک سرسری نگاہ ان پہ ڈالی اور جھک کر اپنا شولڈر بیک گاڑی کی سیٹ سے اٹھانے لگی، سورج اپنے سفر کے آخری مرحلے پہ آ پہنچا اور تھکا تھکا تھا، آگ کا یہ نارنجی گولہ پردہ مغرب میں ڈوبنے کی مکمل تیاری کر چکا تھا، ماحول میں نارنجی رنگ اپنی تمام تر یاسیت سمیت جلوہ گر تھا، کچے کچے نیم پختہ مکانات اور درخت اسی رنگ کی لپیٹ میں آئے خاموش اور طول نظر آتے تھے، گرد کا ہلکا غبار اور دور کہیں چلتی پن چکی کی آواز کا تاثر قائم ہوا

پاپا نے گاڑی کا دروازہ لاک کرنے کے بعد غانیہ کو اپنے ہمراہ آنے کا اشارہ کیا، غانیہ کے قدم اٹھے تو کتنی ہی نظریں بھی ساتھ عازم سفر ہوئی تھیں، یہ گلی محلے کی وہ خواتین تھیں جو گاڑی کی آواز سن کر جس کے ہاتھوں مجبور دروازوں سے جھانکنے لگیں تھیں مگر اس الٹا یاڈل لڑکی کو دوپٹے سے بے نیاز اتنے اعتماد سے چلتے پا کر ان کی آنکھیں بھی حیرت سے ابل پڑی تھیں، جبکہ غانیہ ان سب نظروں سے بے نیاز پاپا سے مخاطب تھی۔

”آپ نے دادو کو فون کر کے اطلاع تو دے دی تھی نا پاپا؟“

”نہیں..... فون تو نہیں کیا تھا، مگر اماں کو میری آمد کی خبر ہوگی یقیناً۔“ وہ جتنے اعتماد سے مسکرائے غانیہ اسی قدر جھلاہٹ سے بھر گئی، اسے یہ بات بہت چڑاتی تھی کہ بنا اطلاع اچانک کسی کے سر پہ سوار ہو جایا جائے، ہر ایسی کینٹس کے خلاف ہونے والا کام اسے ہرگز پسند نہیں آ سکتا تھا۔

”اک کال کرنے میں کیا حرج تھا پاپا؟ نہیں کر سکتے تھے تو مجھے کہا ہوتا۔“ وہ کسی طور بھی اپنی ناگواری نہیں دبا سکی، پاپا کھنکارے تھے، کہ ابھی وہ لوگ گھر سے کچھ فاصلے پہ تھے مگر تاؤ جی دروازے سے نکلتے انہیں دیکھ کر ٹھٹھکے اور ایک دم جیسے خوشی سے نہال ہوتے بائیں پھیلا کے ان کی جانب تیزی سے بڑھ آئے۔

”جی آیاں نوں، جی آیاں نوں، میری سوہنی دھی وی آئی ہے، بھئی بلے بلے، یار جیالے تو نے زندگی میں پہلی واری کوئی ڈھنگ کا کم کیا ہے قسم سے۔“ بھائی کے ساتھ غیر متوقع طور پہ جتنی کو دیکھ کر وہ کچھ اس طور سرت سے لبریز ہوئے کہ بھائی کو بھی بھول گئے، اسے بازو کے حلقے میں لے کر ساتھ لگایا، ماتھا چوماسر پہ بوسہ لیا اور اسی طرح نہال نظر آتے پلٹ کر اندر آوازیں دینے لگے۔

”اماں تیرا یقین پھر جیت گیا، آگیا تیرا پتر اور نال تے دیکھ ہو رکون آیا۔“ وہ خوشی سے لرزتی آواز سمیت کہتے غانیہ کو اپنے ہمراہ لئے اندر بڑھنے لگے، پاپا بھی تفاخر بھری مسکان کے ہمراہ ساتھ تھے، آن کی آن میں سب ان کے گرد اکٹھے ہو گئے، کینر، سہیل، تائی ماں اور دادو، وہی والہانہ انداز وہی بھرپور استقبال، غانیہ ایک کے بعد دوسرے معانقے سے شپٹائی ہوئی نظر آ رہی تھی، کہ سہیل پہ نگاہ پڑی، جس کا چہرہ ہنسی روکنے کی کوشش میں سرخ ہوا جا رہا تھا، وہ مزید کنفیوژ ہوئی۔

”بے فکر رہیں، ہمارے ہاں لڑکوں کا لڑکیوں سے گلے ملنے کا رواج نہیں ہے۔“ وہ ہنسی ضبط کرتا چھیڑنے سے باز نہیں آیا، غانیہ نے ترچھی نگاہوں سے اسے دیکھا اور مصافحے کو بڑھا اس کا ہاتھ نظر انداز کر دیا۔

”معذرت، ہمارے ہاں اس رواج کے ساتھ لڑکوں سے ہاتھ ملانے کا بھی رواج نہیں ہے۔“ اس کے انداز میں محسوس کی جانے والی ناگواری کے ساتھ تیکھا جتلاتا انداز بھی نمایاں تھا، جہاں سہیل کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑا، وہیں تاؤ جی کی اطلاع پہ مہمانوں کی آمد کی اطلاع پا کر چھت سے اتر کر اسی جانب آتا غیب ضرور طیش سے بھر گیا۔

”ظاہر ہی باطن کا آئینہ قرار پاتا ہے بی بی! متضاد باتوں پہ اعتبار تو نہیں ہنسی ضرور آ سکتی ہے۔“ زمانے بھر کی خشک سرد اور پھنکار لی آواز لب و لہجہ دھیمہ مگر اپنے اندر طیش کا اک طوفان

سموئے ہوئے غانیہ کو پہلے ششدر پھر اشتعال سے بھی بھر گیا جبکہ وہ اپنے الفاظ کی سنگینی سے بے نیاز سپاٹ انداز میں پاپا سے ملنے میں مصروف ہو چکا تھا، غانیہ اس کی محض ایک جھٹک ہی دیکھ سکی۔
”بہت معذرت! دراصل یہ کچھ خفا سے رہتے ہیں سب سے، الفاظ بے شک سخت استعمال کرتے ہیں مگر دل.....“

سہیل صورت حال کی گہمیرتا سے خائف وضاحت و صفائی پیش کرنے میں مصروف ہوا تھا کہ غانیہ جو خفت و سبکی کے ساتھ تضحیک کے احساس سمیت جھلستی لب بھینچے گھر سے باہر جاتے شخص کی چوڑی پشت کو گھورے جاتی تھی، نگاہ کا زاویہ بدل کر سہیل کی جانب متوجہ ہوئی۔
”کون تھے یہ حضرت اور انہیں اتنی جرأت کس نے دی کہ.....“

”بڑے بھائی ہیں، بلکہ بڑے سے چھوٹے۔“ سہیل پہلی بات کا ہی جواب دے سکا، دوسری بات کا جواب بھلا کیا بنتا تھا، غانیہ نے ہونٹ سختی سے بھینچ لئے، پہلا تجربہ ہی تلخ اور ناگوار رہا تھا، وہ ایک دم مزید بدگمان مزید بد دل ہوئی، تائی جان دادو اور دیگر افراد کی محبت اہمیت اور توجہ بھی اس سلگتے سبکی کے احساس کو ختم نہیں کر سکی تھی، جو اس شخص کے الفاظ کے نشتر اسے چھو چکے تھے، پاپا نے اس کے لباس پہ دے انداز میں خود بھی تنقید کی تھی۔

”بیٹے کوئی اور ڈریس پہن لو۔“ اور وہ اتنی سی بات کہہ کر فارغ ہو گئی تھی۔
”پاپا میں کسی کی خاطر خود کو نہیں بدل سکتی۔“

اور اب اسے لگ رہا تھا یہ الفاظ اسے نیزے پہ گاڑھ گئے ہیں، اسے کوئی غلط کیسے بلکہ جتنا بھی دے ثابت بھی کر دے، ایسا آج تلک نہیں ہوا تھا، اسے پہلی بار کسی بات نے ایسے ڈس ہارٹ کیا تھا، اضطراب کسی خنجر کی مانند اندر گڑھ گیا، جی نہیں نہانے کو گئی تو اکلوتا شلوار سوٹ ہی اٹھا سکی جو پاپا نے ہی آتے ہوئے اس کے بیگ میں خود ملازمہ سے کہہ کر رکھوایا تھا۔

(بہ تہذیب..... پینڈو کے پینڈو ہی رہتے ہیں، یعنی جہالت کی حد ہو گئی، ایسی بھی کیا بے لحاظی کہ منہ پہ رکھہ ڈالا، پتا نہیں خود کو کیا سمجھتے ہیں، مولوی کہیں کا) نہانے اور کپڑے پہننے کے دوران وہ خود ہی کلکتی رہی تھی۔

”غانیہ!“ کنیز دروازہ سے باہر ہی پکار رہی تھی، اس نے میئر برش پٹخ دیا۔

”سب چائے پہ تمہارا ہی انتظار کر رہے ہیں۔“ وہ اس کی ہم عمر لڑکی جھکے شرمیلے انداز میں اس سے مخاطب تھی، غانیہ نے بیڈ کی پانکٹی پہ دھرا دوپٹہ اٹھا کر کاندھے پہ ڈال لیا۔

”چلو۔“ اس کے انداز میں بے دلی تھی، کنیز اس کے ہمراہ ہوئی، دروازے سے باہر قدم رکھتے ہی بڑا سا آنکھن سامنے تھا، اس نے اکتاہٹ آمیز نگاہ اطراف میں ڈالی اور جی بھر کے بے زار ہو گئی۔

یہاں دلچسپی کے قابل کچھ بھی نہیں تھا، بے حد وسیع و عریض کچا صحن، جس میں جا بجا چار پائیاں چھٹی تھیں، ہر لمحہ بڑھتی تاریکی کو ننگنے کی سعی میں مصروف بلکہ ہلکان سواٹ کا مریل سا بلب جس پہ ماہ و سال کی گردش نے اپنا اثر چھوڑا تھا، جی بھی اس کا شیشہ دھندلا چکا تھا مکمل طور پہ۔
یہ زرد روشنی غانیہ کی آنکھوں کے لئے نامانوس ہی نہیں چہن اور عجیب سی وحشت جگانے کا بھی

باعث بن رہی تھی، اسی زردنا کافی روشنی میں اسے آنگن میں کھڑے سکھ چین اور پیری کے درخت جن بھوتوں سے مشابہہ لگنے لگے تھے، جن کی ہوا سے ڈولتی شاخوں کا عکس دیواروں اور فرش پر لرزاں مزید بے چینی اور خوف کا باعث تھا۔

”چائے لے نا پتری۔“ تاؤ جی نے اس کی خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے مخاطب کیا، دادی پہلے ہی اسے آتے پا کر اپنے پہلو میں جگہ دے چکی تھیں، اس کے نم بالوں پہ شفقت بھرا ہاتھ پھیرا اور خواہ مخواہ مسکرائے گئیں۔

”میری دھی کتنی سوتی ہے۔“

غانیہ کو کچھ بھی اچھا نہیں لگا، نہ چاہت نہ چائے پہ اصرار، اس نے یہاں آنے کے بعد بالخصوص درزیدہ نگاہ سے اس شخص کو کھوجا تھا جو نظر نہیں آسکا، تاکی جان نے خود پیالی اٹھا کر محبت سے اسے پیش کی، وہ انکار نہیں کر سکی تو ایک گھونٹ سے زیادہ بھی نہیں لے سکی، لکڑی کے ایندھن پہ پکنے والی چائے میں موجود دھوس کی مہک اس کے نازک مزاج پہ گراں گزری تھی۔

”چائے بھی پسند نہیں آسکی آپ کو۔“ سہیل کے سوال پہ وہ اچھا خاصا چونکی، یقیناً اس کے چہرے کے تاثرات ہی ایسے تھے کہ وہ بالکل درست قیافہ لگا چکا تھا۔

”بھی“ سے کیا مراد ہے آپ کی؟“ اس کا مزاج تو برہم تھا ہی، سوال ٹیکھا بھی کر گیا، سہیل آہستگی مگر شائستگی سے ہنس رہا تھا۔

”بجھدار کو تو اشارہ کافی ہوتا ہے ڈیر کزن۔“ اس کا انداز ہلکا پھلکا تھا، غانیہ ہونٹ بھیچے اسے دیکھے گی۔

”جانے بھی دیں ناں اب پیاری لڑکی، کسی فرد واحد کی وجہ سے اپنا موڈ خراب نہیں کرتے، ویسے اس لباس میں آپ بہت بہت زیادہ اچھی لگ رہی ہیں۔“ اس نے ہاتھ سے پسندیدگی کا اشارہ دیا تھا، غانیہ کے سیاٹ چہرے پہ یکخت مخی چھاتی چلی گئی۔

”اگر آپ کو یہ خوش فہمی ہے کہ میں لڑکوں سے تعریف کروا کے خوش ہونے والوں میں شامل ہوں تو.....“ اس کی بات سہیل کے بلند ہوتے تھپے میں دب گئی تو لب باہم بھیختی وہ خفا نگاہوں کا زاویہ بدل گئی تھی۔

”اتنی بدگمان تو نہ ہوں اب، بھئی ایک بندے کی وجہ سے آپ سب کو اسی لپیٹ میں لے لیں گی تو زیادتی ہوئی ہم سب سے، ویسے بھی میں تعریف اپنی بہن کی کر رہا ہوں، سمجھیں۔“ وہ اس کا سر تھک کر کہہ دیا تھا، غانیہ اب کے واقعی ریلیکس ہوئی تھی، اپنی باتوں میں مگن تینوں بزرگوں نے لمبے بھر کو توقف کرتے ہوئے انہیں دیکھا مسکرائے اور پھر سے مصروف ہو گئے۔

”میں اور چائے بنواتا ہوں کینر سے کہہ کر۔“ وہ اٹھتا ہوا بولا، غانیہ بے اختیار بوکھلا اٹھی۔

”نہیں..... پلیز نہیں، اس زحمت میں نہ ڈالیں انہیں۔“

”مہمان باعث رحمت ہوا کرتے ہیں یہاں، ہمیشہ کونوٹ کر لیں۔“ وہ انگلی اٹھا کر بڑا مدبر بنا، غانیہ کھپاسی گئی۔

”چلیں آپ کے لئے کچھ ٹھنڈا لاتا ہوں، ٹھیک ہے۔“ وہ اٹھ تو چکا تھا، مسکراتا ہوا پلٹ گیا،

غانیہ منع بھی نہیں کر سکی۔

”اودف۔“ پھسر نے اس کے پیر پہ کاٹا تھا، وہ بلہلا کر نیچے جھک گئی، اندھیرا چھاتے ہی پھسروں کی اجارہ داری قائم ہو چکی تھی، وہ کبھی ہاتھ مٹلتی کبھی تڑپ کر بازو سہلانے لگی، پایا پتا نہیں اپنے خاندان کی کون سی گتھیاں سلجھانے میں مصروف تھے، وہ بالآخر بے زار ہو کر انہیں ٹوک گئی۔

”واپس کب چلنا ہے پاپا؟“ وہ ان کے پاس آ کر ضدی بچی کی مانند مچلی، تو حاضرین نے حیرت سے اسے دیکھا۔

”صبح چلیں گے ٹائیٹے، اب رات ہو چکی ہے۔“ پاپا کے لہجے میں جتنا رسان تھا وہ اس قدر ششدر رہ گئی، دم بخود انہیں دیکھنے لگی۔

”واٹ، مگر جب آرہے تھے تو آپ نے نہیں بتایا تھا کہ۔“ وہ روہاسی ہوتی بات ادھوری چھوڑ گئی۔

”پتری اک رات تے رکوناں ادھر ہمارے پاس۔“ تاؤ جی نے پہلے کنیز کو بلا کر پھسر بھگانے والی دوالا لانے کا کہا پھر اسے دلار سے مخاطب کیا، وہ کچھ نہیں بولی۔

سہیل کی لائی بوتل بھی اس نے اصرار کے باوجود نہیں چھوئی، نہ کھانا کھایا، دادی جان سمیت سبھی میزبان بتفکر اور بے چین نظر آنے لگے۔

”میری دھی رانی روٹی کھالے پہلے، پھر سو جانا، میں منپے سے کہتی ہوں، اج اپنا کمرہ خالی کر دے، وہاں ٹھنڈی مشین لگی ہے، ویسی ہی جیسی شہروں میں لگی ہوتی ہیں گھروں میں۔“ تائی ماں کے لہجے میں اطلاع بہم فراہم کرتے تفاخر سا اتر آیا، غانیہ کچھ نہیں بولی، یہ بات اس کے لئے بھی اطمینان کا باعث تھی کہ اس قدیم نظر آتے صدیوں پرانے گھر میں ایئر کنڈیشنر جیسی سہولت بھی میسر آ سکتی ہے، سب کے اصرار پہ اس نے کھانا بھی بس زہر مار کیا تھا۔

اسے پھر وہی دھویں کا مسئلہ درپیش ہوا تھا، عجیب سی بے بسی نے اس کا احاطہ کر لیا تھا۔

”مجھے پتا ہے تم نے کھانا نہیں کھایا۔“ کنیز نے جس بل دودھ کا بڑے سائز کا گلاس پیش کیا، اس کی نظروں کی حیرت کے جواب میں وہ مسکرا کر بولی تھی، غانیہ کے لبوں پہ تشکرانہ مسکان اتر آئی۔

”تھینکس۔“ وہ واقعی ممنون ہوئی، ورنہ خالی پیٹ تو شاید وہ سونے سے بھی قاصر رہتی۔

”تم دودھ پی لو تو میں تمہیں دیر کے کمرے میں چھوڑ آتی ہوں، چاچے نے تو دادی کے ساتھ ساری رات جاگ کے گلاں باتاں کرنی ہیں، سالوں بعد ملنے پہ اتنا تو ان کا حق بنتا ہے۔“ کنیز کی مسکراہٹ بتا رہی تھی مہمانوں کی آمد سے کتنی خوشی حاصل ہوئی ہے، غانیہ خاموشی سے دودھ کے گھونٹ بھرتی اسے کچن کے کام نپٹاتے دیکھتی رہی، اس وقت وہ جہاں موڑھے پہ بیٹھی تھی، وہ غالباً کچن تھا، لکڑی کے چارستونوں کے آسیرے کھڑی چھت کے نیچے مٹی کا چولہا تھا، جس کی پھلی پچی دیوار دھویں سے مکمل طور پہ سیاہ پڑ چکی تھی، کھانے پینے سے متعلق سبھی سامان بہت سادہ انداز میں وہیں رکھا تھا، چولہے میں آگ روشن تھی اور بڑے سے تیلے میں ابھی بھی کچھ ابل رہا تھا، شاید

دودھ پانی۔

مواکنیز نے ڈھیر ساری پتی اور چینی اٹلتے دودھ میں جھونکی تو اسے اندازہ ہوا، کنیز سب کے لئے دودھ پتی بنانے میں مصروف ہے، شاید گاؤں کے لوگ رات کو چائے پینے کے عادی تھے۔
 ”تم یہاں پھر آؤ گی غانیہ؟“ جلتی ہوئی لکڑی کو پوہے سے کھینچ کر اس نے پانی کے پھینٹے ڈال کر بجھاتی ہوئی کنیز ایکدم سے اسے مخاطب کر گئی تھی، غانیہ کی ساری توجہ بجھتی ہوئی آگ اور کھلی لکڑی سے اٹھتے دھوئیں کی جانب تھی، اس سوال پہ پونک گئی۔

”بالکل نہیں، خدا نے کرے کہ میں یہاں دوبارہ آؤں، آئی میں یہاں رہنا بہت مشکل ہے، سہولیات کے بغیر زندگی کا تصور ہی محال لگتا ہے اب تو۔“ اس نے خالی گلاس واپس کرتے ہوئے صاف گوئی سے انکار کر ڈالا تو ایک لمحے کو نگاہ کنیز کے بجھتے پھرے پہ بھی چلی گئی، جو بالکل پھیکا پڑ گیا تھا، اسے خفیف سی شرمندگی نے آن لیا۔

”آئی ایم ساری فار دیٹ، اگر تمہیں برا لگا مگر۔“

”کوئی بات نہیں، ویسے جتنی پیاری تم خود ہو، تمہارا دل بھی بہت صاف ہے۔“ کنیز نے مسکرا کر گویا اس کی خفت کم کرنا چاہی تھی، غانیہ بے ساختہ ہنس دی۔

”کیا اس کے جواب میں، میں تمہاری تعریف کروں؟“ اس کا انداز خفیف سی شرارت لئے بہت شوخ قسم کا تھا، کنیز بے اختیار جھینپ کر سرخ بڑنے لگی۔

”ہرگز نہیں، بس پھر سے یہاں آنے کا وعدہ کر لو کافی ہے، دراصل اماں ابا کے ساتھ ساتھ دادی بھی بہت خوش ہیں تمہیں یوں اپنے درمیان دیکھ کر، ہم سب کی یہ شدید خواہش ہے کہ تم ہمارے ساتھ گھلوملو۔“ کنیز کے لہجے میں جوانو کھا اصرار تھا اسے سمجھے بغیر وہ اسے اس کی محبت سے تعبیر کرتی محبوب سی ہو گئی تھی۔

”سفر بھی بہت لمبا تھا، پھر اتنا خوفناک بھی، میری ہڈیاں پسلیاں ہل گئی ساری۔“ اس نے منہ بسورا، مواکنیز کے منہ پہ بجھتی روشنی کو محسوس کرتی گہرا سانس بھر کے جیسے کسی منطقی فیصلے پر جا پہنچی تھی۔

”بھئی اس کا ایک آسان حل ہے، تم لوگ وہاں شہر آ جاؤ۔“ وہ اپنے تئیں گویا اسے بہلا رہی تھی، کنیز محض رسمی سا مسکرائی۔

”تھکی ہو گی تم، آؤ تمہیں کمرے تک چھوڑ آؤں۔“ کنیز نے چائے ڈھک دی تھی، غانیہ نے کاندھے اچکا دیئے، تھک تو وہ واقعی بہت گئی تھی، اٹھتے ہوئے اس نے دوپٹہ کھینچ کر کاندھے پہ درست کیا، برآمدے سے اتر کر کمرے میں جانے کو محن میں قدم رکھا ہی تھا کہ بیرونی دروازہ دھماکے سے کھول کر جو لوگ اندر داخل ہوئے ان میں سب سے آگے دس گیارہ سال کا شکل سے ہی بدتمیز نظر آنے والا وہ بچہ تھا جس نے غانیہ کو دیکھ کر بے اختیار سیٹی بجائی تھی۔

”اوائے ہوئے، کڑی تے بالکل میم لگتی ہے۔“ وہ اس کے گرد باقاعدہ گھوم کر چپکا تھا، غانیہ ٹھٹھکی سی گئی۔

”چپ بدتمیز، پھمپی ہے تیری، سلام کر۔“ ایک موٹی کسی قدر بھدی عورت نے بچے کو دھپ رسید کرتے کھسیانی ہنسی ہنستے اصلاح کی، ساتھ ہی اپنا موٹا سانولا ہاتھ مصافحے کو اس کی جانب بڑھا

”یہ بڑا بدتمیز ہو گیا ہے، آپ غصہ نہ کرنا۔“ غانیہ کیا کہتی، محض اسے دیکھ کر رہ گئی، مرد نے غانیہ کے سر پہ ہاتھ رکھا، خیریت دریافت کی، کنیز نے ان لوگوں کا تعارف بڑے بھائی حبیب ان کی مسز اور بیٹے ہمایوں کے طور پہ کروایا۔

”یہ بھائی ہمارے، منیب ویرے سے بڑے، ہمایوں کے علاوہ ان کی ایک بیٹی اور بھی ہے۔“ کنیز کے تعارف کروانے پہ وہ کھینچ تان کر مسکراہٹ لبوں پہ لانے میں کامیاب ہو رہی گئی۔

”ہم چاچے سے ملنے آئے ہیں، آؤ نا تم بھی بیٹھو ہمارے ساتھ۔“ کنیز کے اشارے پہ وہ جیسے ہی آگے بڑھی، بھر جائی نے ارادہ بھانپ کر ہی بڑے خلوص سے دعوت دی تھی، غانیہ بے ساختہ جزبز ہوئی اور یوں کنیز کو دیکھا گویا اسی کو اس مشقت میں نجات دہندہ سمجھتی ہو۔

”سفر کی تھکان ہے، غانیہ آرام کرنا چاہتی ہے بھر جائی۔“ کنیز کی نرمی سے کی گئی مداخلت بھی بھر جائی کو خار بن کر چھٹی چھٹی چہرے پہ کرسٹلی کے ساتھ نئی وترشی کا تاثر گہرا ہوتا چلا گیا۔

”تو چپ ای رہ کنیزو! کچھے اتنا تو معلوم ہو گا کہ ہم چاچے اور اس کی دھی کا سن کر ہی ملن واسطے آئے ہیں، ورنہ ادھر ایسی بھی کوئی محبت نہیں امنڈی پڑ رہی کہ دوڑیں لگانے کی ضرورت پڑے آ۔“ جاہلانہ انداز کے تیکھے پن سمیت انہوں نے بااٹال کنیز کو جھاڑ کر رکھ دیا، کنیز کا رنگ یکا یک کتنا پھیکا پڑ گیا تھا، غانیہ حیران و ششدر اور خائف نظر آنے لگی، اس نے لا تعلق نظر آتے بھا حبیب کی جانب دیکھا، جن پہ بیوی کے ہاتھوں بہن کے ذلیل ہونے کا ذرہ برابر بھی اثر دکھائی نہیں دیتا تھا، اسے یہ سب بے حد آکورڈ لگا، اتنی معمولی بات پہ ایسی بدتمیزی کی کیا تک بنتی تھی بھلا؟

”کنیز صحیح کہتی ہے، میں واقعی تھکی ہوئی ہوں۔“ وہ ناچاہتے ہوئے بھی تڑخ کر کہہ گئی، بھر جائی جو کنیز کی مزید خاطر داری کا ارادہ باندھے ہوئے تھیں، اچھا خاصا چونک کر اس کی سمت متوجہ ہوئیں تو آنکھوں میں تحیر ہی تحیر نظر آتا تھا، معاً انہوں نے خود کو سنبھالا اور چاچا پوسانہ انداز میں قدرے مسکرائیں۔

”اچھا اچھا..... کوئی بات نہیں، تم سو جاؤ، پر صبح ہمارے گھر ضرور پھیرا مارنا، تیرے وڈے پرا کا گھر ہے، اپنا ہی سمجھو۔“ اس کا گال سہلا کر کہتی ہوئیں وہ اپنا سابقہ تاثر مٹانے میں کوشاں تھیں، غانیہ کچھ نہیں بولی، وہ بدتمیز بھی نہ ہی اس قدر بداخلاق، اس وقت جو بھی نئی یا ناگواری اس کے اندر اتری تھی وہ کنیز کے ساتھ بھر جائی کے اہانت آمیز سلوک کا ہی رد عمل تھا، اس کا یہ مطلب بھی نہیں لیا جاسکتا تھا کہ محض چند گھنٹوں میں ہی اسے کنیز سے جذباتی یا دلی وابستگی ہو گئی تھی البتہ بھر جائی کا متکبرانہ انداز ضرور سہہ نہیں پائی، کنیز کا ہاتھ پکڑ کر قدم بڑھاتے اس نے پلٹ کر بھی نہیں دیکھا۔

”ارے..... ارے..... بھی رکو..... یہی ہے ویر کا کرا۔“ قطار میں بنے کمروں میں سے ایک کے آگے پہنچ کر کنیز کے قدم رکے وہ البتہ ضرور آگے بڑھ گئی تھی، تب کنیز نے ہی اسے روکا تھا، غانیہ نے پلٹ کر پیچھے دیکھا، کچی لکڑی کا براؤن دروازہ نیم دا تھا، جس کا رنگ موسم کی شدتوں

کا مقابلہ کرتا جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا اڑا ہوا تھا، اس کے باوجود اس کی حالت یہاں کے دیگر کمروں کی نسبت قدرے بہتر تھی، کہ غسل کے لئے بھی کنیرا سے یہیں لا چکی تھی، وہ امید رکھ سکتی تھی کمرے کی حالت اس کی شاہانہ فطرت کے تقاضوں کے عین مطابق نہ سہی مگر گزارا بہر حال ہو سکتا تھا، نیم وا دروازے پہ خوبصورت پرنٹ کے گرے پردے سے روشنی چھن کر باہر آتی تھی، پر وہ اندر چلنے والے پنکھے کی ہوا کے دوش پہ دھیرے دھیرے لرزتا جا رہا تھا، کنیر نے آگے ہو کر دروازے پہ آہستگی سے دستک دی۔

”ویر میں آ جاؤں؟“ جواب میں مردانہ بھاری آواز کا محض ہنکارا بھرا گیا، کنیر نے دروازہ دھکیل کر پورا وا کر دیا، اب اندرونی منظر کی راہ میں پردے کی دیوار تھی، جو ہولے ہولے لہراتی آگے پیچھے جاتی تو اندر کا منظر ذرا سا وا ہو جاتا کنیر نے اس نرم دیوار کو ہاتھ سے ہٹا کر پرے کرتے ہوئے اندر قدم رکھ دیا، غائب ہچکچاہٹ آمیز گریز سمیت وہیں چوکھٹ پہ کھڑی رہ گئی، نرم دیوار لہراتی ایک مرتبہ پھر درمیان میں حائل ہو گئی۔

”تم یہاں اگر اپنی معزز مہمان کو لائی تھیں تو انہیں یہ بھی بتایا ہوتا کہ کسی غیر مرد کے ذاتی استعمال کے کمرے کو اپنی بے تکلفی سے استعمال نہیں کرتے، اگر کر بھی لیا ہے تو کم از کم آثار مٹا دینے چاہیے، اتنی تمیز تو کسی بھی باشعور انسان کو ہونی چاہیے۔“

وہ جیسے کنیر کا ہی منتظر تھا، اس کی شکل دیکھتے ہی برس پڑا، جہاں کنیر بوکھلائی باہر کھڑی غائبی کی پیشانی الگ تپ اٹھی، مخاطب کا سر دنجیدہ لہجہ رہانت آمیز انداز اس پہ تضحیک و توہین کے لاتعداد نئے باب وا کر گیا، وہ جہاں جیسے کھڑی کی کھڑی رہ گئی، غلطی تو اس کی واقعی تھی، عادت کے مطابق اس نے ہاتھ لینے کے بعد واش روم سے اپنے کپڑے نہیں اٹھائے تھے، اس کا اسٹائلش سا بیگ جس میں اس کے مزید کپڑے اور دیگر سامان تھا وہ بھی وہ کھلا ہوا ہی بستر پہ چھوڑ گئی تھی، یہ سوچے بنا کہ یہاں نہ تو ماما تھیں نہ اس کی ملازمہ کو جو اس کے لباس کے انتخاب سے لے کر ہاتھ لینے کے بعد تک کا بکھیرا سمیٹتی، کتنی خراب عادت تھی اس کی جسے ممانازک مزاحیہ گردانتیں اور نرمی سے ٹوکا کرتی تھیں آج اس کی شدید سبکی کا باعث بن چکی تھی۔

”مم..... میں ابھی اٹھا لیتی ہوں دیر۔“ کنیر بوکھلائی جا رہی تھی اور شاید غلبت میں کپڑے سمیٹ بھی رہی تھی۔

”ظاہر ہے تم ہی سمیٹو گی۔“ وہ تنک کر کڑواہٹ سے کہتا اٹھا اور اپنے سامنے کھلی ہوئی فائل زور سے بند کر دی۔

”وہ..... وہ یہاں غائبی کو سونے کو بولا ہے اماں نے۔“ اسے باہر جاتے پا کر کنیر نے خائف ہوتے پھنسی پھنسی آواز میں کہا، منیب کو جیسے دھچکا لگا تھا، وہ یکدم رک کر جھٹکے سے مڑا اور اسے بے دریغ گھورا۔

”دماغ ٹھیک ہے تمہارا؟“ وہ جیسے خود پہ ضبط کھو کر دھاڑا۔

”میں ایک مرد ہو کے پسند نہیں کرتا کہ میرے بستر پہ کوئی انجان خاتون شب ب سری کریں، وہ محترمہ انہیں اس بات کا خیال نہیں ہے اور ہاں یہ بستر کی چادر تبدیل کر دینا، ابھن ہو رہی ہے

مجھے۔“ بے لچک تنفر بھرے انداز میں کہتا وہ اگلے لمحے دروازے سے باہر تھا اور سناٹے کی زد پہ آئی ہوئی سب کچھ سنتی غانیہ کا سکتہ اسے روہرو پا کے ہی اک چھناکے سے ٹوٹا، وہ اگر بروقت سرعت سے پیچھے نہ ہٹ جاتی تو یقیناً وہ اپنے دھیان میں اس سے ٹکرا جاتا، ایک لمحے کو تو منیب بھی اس صورتحال سے ساکن سا رہ گیا، اس کے کہاں گمان میں تھا کہ وہ یہاں باہر کھڑی ہوگی، اس کے چہرے سے بھاپ نکل رہی تھی اور رنگ بالکل سرخ تھا، محض اک نظر کا تصادم تھا، اگلے لمحے وہ پلٹ کر تیزی سے وہاں سے بھاگ گئی، منیب پھر بھی اپنی جگہ پہ کھڑا رہا، اس کی آنکھوں سے بہنے کو تیار آنسو وقتی سہی مگر ندامت کا باعث ضرور بن گیا، مگر یہ لمحائی احساس ہی تھا، اگلے لمحے وہ پھر اسی حد تک سفاک ہو چکا تھا، مشتعل ہو چکا تھا۔

”اگر یہ موصوفہ اتنی ہی سہل پسند اور عیش و آرام کی عادی تھیں تو یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی۔“ وہ سر جھٹکتا ہوا باہر چلا گیا۔

غانیہ واپس اسی جگہ آ کے تھم گئی جہاں کچھ درقبل وہ کنیر کے ساتھ موجود تھی، برآمدہ لمبا اور سنسان تھا، آخری سرے پہ ایک چارپائی بھی موجود تھی، جس پہ بستر ڈھیر تھے، شاید یہ اتنی سی جگہ اسٹور کا کام دیتی تھی، وہ بے دم سی اسی چارپائی پہ ڈھے گئی، اس کی سماعتوں میں ابھی تک اس شخص کی سرد پھنکاروں کی دھمک اتر رہی تھی، بغیر وجہ کے اس طرح معتب و ذلیل ہونے کا تو اس کے پاس تصور تک نہیں تھا، جی بھی شدید احتجاج اس کے اندر پھیل چکا تھا، وہ اتنی مضطرب اور وحشت زدہ تھی کہ جب تک کنیر اسے ڈھونڈتی وہاں تک پہنچی، شدید غیض اور اضطراب کی کیفیت میں وہ اپنے ہونٹ چل چل کر زخمی کر چکی تھی، محض اک نظر میں کنیر اس کے اندر کی کیفیت جان کر بے تحاشا بے چینی محسوس کرتی اس کے پاس آ بیٹھی۔

”دیر کے رویے کی میں معافی مانگتی ہوں غانیہ، وہ دل کا برا نہیں ہے، بس جب کبھی بکھار جب بہت پریشان ہوتا ہے تو اسے خود بھی پتا نہیں چلتا اس نے کس سے کیا کہا؟“

کچھ دیر تک بے قرار نظروں سے اسے دیکھتے رہنے اور ہاتھ مسلنے کے عمل سے گزرنے کے بعد وہ بالآخر ہمت مجتمع کر کے بول پڑی، غانیہ کو شدید اختلاف ہوا تھا، جیسے اس بیان سے، جی بھی حلق میں بے تحاشا کڑواہٹ گھل گئی، اس نے بولنے سے قبل گلے میں اتری کمی کو اندر اتارا پھر تنک کر بولی تھی۔

”تمہیں معذرت کرنے کی ضرورت نہیں ہے کنیر، ہر انسان اپنے ظرف اور نیچر کے مطابق ہی کسی کے ساتھ برتاؤ کیا کرتا ہے، بیشک تم برا مناد مگر میں کہنا چاہوں گی کہ مجھے تمہارا بھائی ہرگز نارمل شخصیت نہیں لگا، بغیر وجہ کے کسی کو اپنے کسی نقصان یا انتقام کا نشانہ بنانا اور ایذا دینا سبکی پن کی علامت ہی سمجھا جائے گا، بہر حال تم ٹینشن فری رہو، رویوں کی پرکھ مجھے بھی ہے، جو کچھ ہوا اس میں تمہارا قصور نہیں میں جانتی ہوں اور پلیز کمرے سے میرا بیگ ضرور ابھی لا دو۔“ اپنی بات مکمل کر کے اس نے ایسے آنکھوں پہ بازو دھریا گویا اب مزید بات نہیں کرے گی، کنیر جواب تک بے بس نظر آتی تھی بالکل روہانسی ہو گئی۔

”ارے..... یہاں کیوں..... تم اندر چلو ناں، میں تمہیں پنکھا چلا دیتی ہوں۔“ کنیر بوکھلا کر

بولی تھی۔

”میں ٹھیک ہوں، تم جاؤ۔“ اب کے اس کا لہجہ اس کی آواز میں رکھائی تھی، اس کا کلاہر گزرتے لمحے کے ساتھ آنسوؤں سے بھرتا جا رہا تھا، کنیز محل سے پلٹ گئی، کچھ دیر بعد لوٹی تو بازوؤں کے حلقے میں صاف ستھرا بستر تھا۔

”غانیہ..... اٹھو..... پلیز بستر تو بچھانے دو مجھے۔“ غانیہ جس کی آنکھوں کی بے تاب نمی کنپٹیوں سے بہہ کر گردن تک اتر چکی تھی پھر سے اس کی موجودگی محسوس کرتی ساکن ہو کر رہ گئی، غیر محسوس انداز میں اس نے نمی کو آستین سے پونجھا اور قدرے تاخیر سے اٹھی، نیم تاریکی کے باوجود کنیز اس کی نرم بھیگی پلکوں کو محسوس کرتی دل کو کتنا بوجھل پارہی تھی، اس کا بس نہ چاہا خود سے نظریں چرائی اس میدانے جیسی اجلی چاندنی جیسی شفاف نازک لڑکی کو اس نے بازوؤں میں بھر لے، کتنی دلربائی تھی اس کے ہر نقش میں، کیسی سحر انگیزی تھی اس کی سیاہ گھور آنکھوں میں، خمیدہ دراز پلکیں جو اضطرابی کیفیت میں بار بار اٹھتی گرتی تھیں اور اس نیم اندھیرے میں جگمگ جگمگ کرتا ہوا اس کا جھلملاتا ہوا چاندی جیسا سراپا گویا دنیا کی ساری خوبصورتی اور حسن سمٹ کر یہیں آ گیا تھا۔

لیکن اک وہ ویرنیںب تھا جسے شاید اب کچھ نہیں بھاتا تھا، پتا نہیں وہ لڑکیوں سے اتنا بدکنے کیوں لگا تھا، کیوں اتنی خار کھانے لگا تھا، وجہ تو واضح تھی، وہ جانتی بھی تھی، مگر یادداشت یہ ٹھہری گرد کی طرح اس وقت کی ناخوش گواریت کو جھاڑ کر پھر سے اٹھانا پھپھانا نہیں چاہتی تھی، جتنی بستر بچھا کر پیڈشل فین چلا کر وہاں سے بوجھل قدموں سے لوٹ گئی، ویرانی دیر کے کمرے سے ہی نہیں اس کے دل سے بھی لپٹی ہوئی تھی۔

☆☆☆

انہوں نے نماز کے بعد سلام پھیرا اور دعا کو ہاتھ بلند کر دیئے، دل بھاری تھا، غم سے پھٹنے کو تیار..... آنکھ کی نمی بے قراری سے پلکوں کی دہلیز پھلانگتی گالوں پہ اتر آئی، ان کی ہر دعا کا مرکز ان کا راج دلاران کا بھائی ہی ٹھہر رہا تھا، معارفہداری کے آخری سرے پہ ہونے والی آہٹ جس پہ ان کے کان ہمہ وقت لگے رہتے تھے انہیں چونکا گئے، منہ پہ عجلت میں ہاتھ پھیرتے وہ جائے نماز تہہ کیے بغیر اٹھی تھیں اور لپک کر دروازے تک آئیں۔

سیاہ شکن آلود لباس میں دراز قامت ان کا بے حد وجیہہ و تشکیل بھائی کی محض ایک جھلک ہی نظر آسکی، وہ تڑپ کر پیچھے لپکی تھیں۔

”مون..... مون..... میری بات سنو۔“ وہ بھاگ کر ان کے پیچھے پورٹیکو تک آئیں مگر تب تک وہ گاڑی میں بیٹھ کر جا چکا تھا، وہ سخت روہانسی ہوئیں وہیں سیڑھیوں پہ بیٹھ کر سر تھام گئیں، اتنے دنوں بعد وہ کمرے سے نکلا تھا، وہ بھی اس طرح کہ وہ اس کی شکل دیکھ سکیں نہ آواز سن پائیں، دکھ کی شدتوں کے باعث ان کے ر کے ہوئے آنسو پھر سے بہہ نکلے۔

”بی بی جی؟ آپ کے لئے فون ہے۔“ ملازمہ اطلاع سمیت حاضر تھی، انہوں نے بے دلی سے سر اٹھایا تو چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔

”کون ہے؟“

”تحريم بي بي هي۔“ ملازمہ کے جواب پہ وہ يکدم اٹھ گئیں، تيز تيز چلتیں فون اسٹینڈ تک آئیں، جہاں ريسورکر يڈل کے ساتھ الٹا رکھا ہوا تھا۔
 ”السلام علیکم!“

”وعلیکم السلام آیا! بھائی جان کا بتائیں مجھے، سخت پریشانی ہو رہی ہے ان کی طرف سے۔“
 تحريم چھوٹے ہی بولی تھیں، انداز میں فکر مندی بھی تھی اضطراب بھی۔
 ”کیا بتاؤں بہن؟ ہنوز ہے صورتحال۔“ ان کی گلوگیر آواز مزید بھرا گئی۔
 ”کیا مطلب؟“ تحريم ٹھنکیں۔

”بھائی کہاں ہیں؟“

”چلی گئی۔“ وہ تسکین۔

”بچے؟“ تحريم کی آواز پھنس سی گئی، انہوں نے سرد آہ بھری۔

”لے گئی ساتھ ہی ڈائن۔“ وہ مزید خود پہ ضبط نہ کر سکیں اور بے ساختہ ہچک کر رو پڑیں، دوسری جانب تحريم پہ جیسے غم و غصے کے پہاڑ ٹوٹ پڑے، بولنے کے قابل بھی نہ رہی۔
 ”بھائی جان کیا کر رہے تھے؟ بچوں کو کیسے جانے دیا؟“ تحريم بپھری گئی تھی اس اطلاع پہ۔
 ”بیٹا ماں کے بغیر نہیں رہتا تم جانتی ہو، اتنا سمجھدار تو ہے، دوسرا بچہ کیا وہ بیچارا اس منحوس کا پیٹ پھاڑ کر نکال لیتا۔“ وہ کلس کر بولی تھیں، تحريم یوں خاموش تھیں جیسے کچھ کہنے کو باقی نہ رہا ہو۔
 ”اب کیا ہوگا آپا، ہمارا ایک ہی بھائی ہے، یہی بچے ہمارا کل اثاثہ تھے، ہر صورت بچے واپس لائیں، ہماری نسل ہے وہ۔“ تحريم ضبط گنوا کر رو پڑیں، ان کے آنسو تو بد دستور بہہ رہے تھے۔
 ”آج تین دنوں کے بعد نکلا ہے مون کمرے سے، نہ کچھ کھایا نہ پیا گھر سے چلا گیا، اللہ جانے کیا ارادے تھے۔“ ان کے اندر کا سہم ان کی آواز سے عیاں تھا۔

”ضدی تو اتنے ہیں لالہ، ہزار لڑکیاں تھیں جو آس مند تھیں، مگر شادی اپنی مرضی سے کی، انجام دیکھ لیا؟ ایسی عورتیں گھر نہیں بسایا کرتیں۔“ تحريم بیک وقت غم و غصے کا شکار تھی۔
 ”اچھا چھوڑو، اللہ سے دعا کرو بہتری کی، میں کب تک اپنا گھربار چھوڑے یہاں بیٹھی رہوں گی، مون کوئی حتمی فیصلہ کرے تو میں بھی واپس سدھاروں ان کا روز فون آتا ہے۔“ انہوں نے شوہر کا حوالہ دے کر بات سمیٹی، تحريم محض سرد آہ بھر کے رہ گئی۔

☆☆☆

اگلی صبح اس کی آنکھ گھر میں گونجتے مختلف شور اور آوازوں سے کھلی، ساری رات چھروں کی یلغار اور گرمی کی شدت کے باعث وہ بہت بے چین رہی تھی، ایک لمحے کو بھی مجال ہے آنکھ لگی ہو، حالانکہ بیچاری کنیر نے تو اپنے تئیں اسے آرام فراہم کرنے کی پوری کوشش کی تھی، مگر وہ سہولیات کی عادی تھی، یہاں بے آرام رہی تھی تو کچھ ایسا عجیب بھی نہیں تھا، اس نے کسلندی سے کروٹ بدل کر آنکھیں کھولیں تو گاؤں کے مخصوص ماحول کی نکھری ستھری خوش گوار صبح اپنی تمام تر تازگی کے ساتھ مسکرا رہی تھی، بیری کے درخت کے چھوڑے تنے سے اسی پل ایک گلہری منہ میں روٹی کا ٹکڑا دبائے بھاگتی دیوار پار غائب ہو گئی۔

”کنیر بیٹے غانیہ کو جگا دیا ہوتا۔“ اس نے صحن سے پپا کی آواز سنی، مگر نفلی اتنی شدید بھی کہ گردن موڑ کر اس جانب نہیں دیکھا۔

اس کے خیال میں کل شام سے رات تک جتنی بھی اس کی ذلت ہوئی اس میں سارا ہاتھ ہی پپا کا تھا، انہیں ہی شوق تھا اسے اپنے رشتوں سے ملانے کا، نہ وہ رات رکتے نہ وہ کم ظرف انسان اتنی معمولی بات پہ اسے دو کوڑی کا کر کے رکھتا، اس نے لیٹے لیٹے یونہی نگاہ کا زاویہ بدل کر بیری کے درخت کی شاخوں کو کھوجا، جن سے چھتی سورج کی شفاف روشنی بہت بھلی معلوم ہو رہی تھی، پر اب رات دکنے والے جگنوؤں کا کہیں نشان تک نہیں تھا، منڈیر پہ بیٹھا کوا اپنی کریہہ آواز سے فضا کے خاموش سینے پہ سلوٹیں ڈالنے لگا، اس نے بو جھل سانس کھینچا اور اٹھ کر بیٹھتے ہوئے ہاف سیلوز سے جھانکتے اپنے بازوؤں پہ نگاہ کی، سفید مٹلیں بے حد شفاف و گداز مرمریں کلائیوں پہ جگہ جگہ چھڑکے کائے کے سرخ نشان نمایاں تھے، جنہیں سہلاتے اس کے چہرے پہ کدورت اور بے بسی پھیل گئی، کچر کی گرفت سے آزاد شانوں پہ بکھرے بالوں کو خفیف سے جھٹکے سے پیچھے گراتے اس نے کس احساس کے تحت بے اختیاری کی کیفیت میں پللیں اٹھائی تھیں، مگر دل تلخی و تنفر سے بھر گیا، تنے ہوئے نقوش اور سلکتی آنکھوں میں ناگواریت کا گہرا تاثر لئے وہ اپنے کمرے کی دہلیز پہ کھڑا اس کی سمت ہی متوجہ تھا، بلکہ باقاعدہ گھور رہا تھا، انداز کی حقارت اتنے فاصلے سے بھی محسوس کی جانے والی تھی، غانیہ سے نگاہ چار ہوتے ہی اس نے بے حد تنفر سے نگاہ کا زاویہ بدلا اور جھٹکے سے پلٹ کر وہاں سے چلا گیا، غانیہ کو ایک بار پھر شدید دھچکا لگا تھا جیسے، وہ بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی، اس درجہ کدورت کی وجہ کا سرا ڈھونڈتی ہوئی جو ظاہر ہے ملنے سے رہا تھا جیسی جھنجھلا گئی۔

(لگتا ہے پاگل ہے، جاہل انسان، کیوں پیچھے پڑ گیا ہے میرے، بس چلے تو شاید زبان کے نشروں اور نظر کے تیروں سے مار ڈالے)

کنیر اسے جاگتے پا کر اس کے پاس آ کر خفیف سا مسکرائی، صحن کے کونے میں موجود واش روم میں جانے اسے بہت الجھن بہت خفت محسوس ہوئی تھی، باہر آئی تو کنیر ہاتھ میں صاف ستھرا تولیہ اور صابن لئے اس کی منتظر تھی، اسے دیکھ کر ہنڈ پپ کی طرف اشارہ کیا۔

”وہاں آ جاؤ منہ ہاتھ دھلو دو۔“ اس کے انداز میں جو پذیرائی و محبت تھی وہ اب غانیہ کو گزشتہ رات کا ازالہ محسوس ہوئی بوجھ لگنے لگی۔

”رہنے دو، میں خود کر لوں گی۔“ غانیہ نے صابن اس کے ہاتھ سے لیتے نلکے کی ہتھی سے کنیر کا ہاتھ ہٹانا چاہا، تو کنیر نرمی سے مسکرا دی۔

”تم سے نہیں چلے گا۔“

”کیوں نہیں چلے گا؟“ غانیہ نے صاف صاف برا منایا اور زبردستی اس کا ہاتھ ہٹا کر نلکے کی ہتھی کو پکڑ کر زور زور سے اوپر نیچے کیا، پاپ کے منہ سے پانی کی دھار دو جھٹکے کھا کر چھوٹے سے پختہ فرش پہ گری جس کے اطراف پڑھی اینٹ کی حد بندی کر کے اسے کھرے کی شکل دے دی گئی تھی۔

جھنجھٹے دور تلک اڑے، غانیہ نے جیسے اس پہ جتلاتی نگاہ ڈالی، گویا اپنے کارنامے پہ داد چاہی،

جواباً کنیر بے ساختہ ہنس دی تھی، یونہی ہنستے ہوئے وضاحت بولی تھی۔
 ”لیکن تم اسے چلانے اور منہ دھونے کا کام اک ساتھ نہیں کر سکتیں۔“ وہ گویا اس کی ناتجربہ کاری پر محفوظ ہو رہی تھی جو غانیہ کو بالکل اچھا نہیں لگ سکا۔
 ”کیوں نہیں کر سکتی آخر؟ تم جاؤ خود ہی کروں گی میں۔“ وہ خفیف سی جھلاہٹ سمیت خود سری سے بولی، اس سے قبل کہ کنیر کچھ کہتی تب سے یہ بے کار بحث سنتا ہوا منیب برہم و درشت انداز میں مداخلت کیے بغیر نہ رہ سکا۔

”تمہیں خدمت خلق کے اس شوق سے فی الحال ہاتھ ضرور کھینچ لینا چاہیے کنیر فاطمہ! وہ بھی اس صورت میں جبکہ سامنے والا نہ صرف بد مزاج بلکہ کسی کا احسان بھی قبول کرنے پر آمادہ نہ ہو۔“ سرد بخیدہ لہجہ ترچھا کاٹ دار انداز اہانت و تضحیک تو جیسے لازم و ملزوم تھے اس کے لہجے میں پھندے ٹانگنے کے لئے، غانیہ کی پشت اس جانب تھی جہاں وہ اسے دیکھنے سے قاصر رہی تھی، مگر ایک بار پھر بغیر کسی قصور یا غلطی کے ہونے والا حملہ اسے ضرور شل کر کے رکھ گیا۔

وہ جیسے کرنٹ کھا کر پلٹی تو نگاہ اس کے سرد چہرے سے جاملی، جہاں تاثرات میں امنڈنے والی حقارت کے سوا اور کوئی جذبہ نہیں تھا، اس نے کچھ بولنا چاہا، مگر غم و غصے رنج کی شدید کیفیت کا ایسا شدید اثر تھا کہ زبان جیسے گنگ محسوس ہوئی، کنیر البتہ بہت گھبرا گئی تھی۔

فی الفور پلٹی تو چہرے پر بے بسی رقم تھی، یوں جیسے جاننا نہ چاہتی ہو مگر اس شخص کے سامنے انکار کی تاب بھی نہ ہو، اس کی نگاہ غانیہ سے ملی تو آنکھوں میں خفت کے ساتھ معذرت اور نرمی بھی صاف محسوس کی جاسکتی تھی۔

”مجھے کتنی دیر ہو رہی ہے، اندازہ ہے تمہیں؟“ وہ کنیر یہ برسا تھا، کنیر نے اک نظر اسے دیکھا، اس نگاہ میں شکوہ رنج خفگی کیا کچھ نہ تھا، مان رکھنے والے اگر مان توڑنے لگیں تو انہیں کیسے روکا جاسکتا ہے، وہ جانتی تھی ایسا وہ کب کرتا ہے، وہ اس بے خفا نہیں تھی، شاید ہو ہی نہیں سکتی تھی۔
 ”آپ کی روٹی پکا کے رکھی ہے میں نے۔“ وہ محض منمنائی۔

”صرف پکانے سے کیا ہوتا ہے، نکال کر دوگی تو کھاؤں گا ناں۔“ وہ پھر بلاوجہ بھڑکا، کنیر اب کے کچھ نہیں بولی، اس کی روٹی جو بھی سے ترہتر تھی چنگیر میں رکھی، کٹوری دہی سے لبریز کی ساتھ میں اچار نکال دیا، سلور کا پڑا گلاس چائی سے لسی کا بھرا اور ناشتہ اس کے سامنے پیش کر دیا، اب وہ چائے گرم کرنے کو رکھ چکی تھی، ساتھ ابلے ہوئے انڈے چھیل رہی تھی۔

”تمہیں میں نے وہ کاٹھ کباڑ کمرے سے لے جانے کو کہا تھا، ابھی تک وہیں دھرا ہے۔“ وہ شریں ناشتہ کرتا بھی زہر ہی اگل رہا تھا، کنیر چونک سی گئی۔

”کون سا کاٹھ کباڑ؟“ جواب میں منیب نے کچھ کہنے کے بجائے محض اسے گھورا۔

”وہ..... غانیہ کا سامان۔“ وہ گھگھیاٹی، منیب نے بے بسی کے ساتھ غصے کا بھی گھونٹ بھرا۔

”وہ بیگ میں ڈال تو دیا تھا میں نے۔“ کنیر کے جواب پر اس نے گلاس پیچ دیا۔

”اور وہ بیگ ابھی تک وہیں پڑا ہے، خدمتوں سے فرصت ملے تو اور بھی کہیں جھانکو۔“ وہ

بد مزگی و بداخلاقی کی انتہا پہ تھا۔

”چائے تو پی لو ویر۔“ اسے اٹھتے پا کر کنیر بولھائی۔

”پورے دس منٹ برباد کرائے تم نے، اب وقت بالکل نہیں ہے میرے پاس۔“ وہ اس ناراضگی سے کہتا باہر نکل گیا، غانیہ خاصی تاخیر سے خود کو سنبھال کر اس قابل ہو سکی تھی کہ کنیر کو دیا چیلنج قبول کر سکے، مگر اس کام میں وہ جتنا تنگ ہوئی پھر ہی جان سکی تھی کنیر نے کچھ غلط بھی نہ کہا تھا، صابن لگے ہاتھوں سے نلکا چاٹنا کم از کم اس کے لئے اک دشوار مرحلہ ضرور تھا، جب کر بھی لیتی تو پانی تک جب رسائی حاصل کرتی وہ اسے اپنی پہنچ میں آنے کی اجازت دیئے بغیر کھرے کی پختہ زمین پر گر کر اپنی حیثیت کھو بیٹھتا اور غانیہ محض ہنسنے لگتی رہ جاتی۔

”اچیلنج قبول کرنا آسان مگر اسے اچھو کرنا اسی قدر دشوار ہوا کرتا ہے بی بی، مگر آپ غالباً جوش میں حواس کو رخصت کرنے کے قائل ہیں۔“ جھلائے ہوئے انداز میں پاؤں پٹختے اس نے زہر میں بجھی یہ ملاستی آواز سنی اور اسی زاویے پہ جامد ہو کر رہ گئی، معاثر کے عالم میں نا چاہتے ہوئے بھی پلٹ کر دیکھا، تک سک سے درست تاؤ جی کا یہ سپوت اک نئے مگر دلکش اور چھا جانے والے روپ میں رو برو تھا، مگر بات کرنے کے طریقے سے دیکھنے کا انداز تک وہی بے رحم سفاک اور جارح تھا، غانیہ نے اندر اندر تاٹش دبا لیا، وہ لب بست کھڑی رہی تھی، اپنی ضد یا بھرم کو قائم رکھنے والی اس کوشش نے اسے خاصے بے ڈھنگے انداز میں بھگو ڈالا تھا، جیسی اس پدمزاج غصیلے آدمی کو پھر سے اس پٹنر کا موقع ہاتھ لگا، وہ جا چکا تھا، غانیہ اسی پوزیشن میں کھڑی تھی، وہ یہ نہیں سوچ رہی تھی وہ شخص ایسے کیوں کر رہا تھا، وہ یہ سوچ رہی تھی صرف اسی کے ساتھ کر رہا تھا؟

☆☆☆

رات تاریک اور سرد تھی، اتنی سرد کہ آتش دان میں دہکتی آگ اور وجود پہ لپٹا دبیز کبل بھی اس سرد پن کو ختم کرنے سے قاصر تھا، اس نے کروٹ پھر بدلی اور منہ تکیے میں دے لیا۔
نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی، بس کچھ آہٹیں تھیں، کچھ آوازیں تھیں اور کچھ سرگوشیاں بھی، پیار بھری سرگوشیاں، وہ اتنی بے قراری محسوس کر رہی تھی کہ اٹھ کر بستر چھوڑ دیا، اس کا شب خوابی کا لبادہ سرسرایا اور ریشمی پنڈلیوں تک ڈھلک گیا، لمبے گھنیرے سنہرے بال نازک پشت پہ آبشاروں کی مانند گرے تھے، کھڑکی کے نزدیک آکر اس نے پردہ سرکایا، گلاس ونڈو باہر پھیلے دھندلے غبار سے دھندلایا جا رہا تھا۔

”کس قدر تاریک رات ہے۔“ اس کا دل بھرایا، اس نے سراٹھا کر آسمان سے کوئی تارہ کھوجنا چاہا، آسمان پہ چاند نہیں تھا۔

”زندہ رہنے کے لئے چاند کتنا ضروری ہے، چاند نہ ہو تو۔“ اس نے سرخ بستہ گلاس ونڈو سے ٹیک دیا، اک آنسو ٹپکا اور دور تک پھیل گیا۔

”اگر کوئی چاند کو خود ہاتھوں سے نوچ کر پھینک دے تو؟ میں نے خود تمہیں نوچ کر پھینکا، میں نے خود.....“ اس کی سسکیاں بڑھی تھیں، وہ بے ساختہ رو دی۔

”میں نے خود کو خود اندھیروں کے حوالے کیا، یہ جانے بغیر کہ چاند کے بغیر گزارہ ممکن نہیں۔“ وہ اب شدتوں سے رو رہی تھی، اسے گنوا کر اس نے اب تک ایک ہی کام ڈھنگ سے کیا تھا،

رونے کا کام، یہ ہی کام وہ ابھی پوری دل جمعی سے کر رہی تھی۔
 عین عشق کماٹی وچ نشر ہوئی
 ردی گئی میں دین ایمان وچوں
 شام ویکھدیاں شام قضا ہوئی
 بھل گئی نماز دھیان وچوں
 چڑھی شوق شراب دی آن مستی
 کلمہ پڑھاں میں مکیزی زبان وچوں
 محمد بونیا یار دی ویکھ صورت
 گنیاں سورتاں بھل قرآن وچوں
 وہ انہی اشعار کی زندہ تفسیر تھی، وہ واقعی عتاب زدہ تھی۔

☆☆☆

کل شب گلی میں میں نے
 موت کو دیکھا
 وہ بالکل اس زندگی جیسی تھی
 جیسی زندگی میں
 تمہارے بغیر جی رہا ہوں

اس کے کمرے میں بے حد اندھیرا تھا، قبر جیسا اندھیرا، گہبیر، ہولناک، جہازی سائز بیڈ پر وہ بالکل ساکن لیٹی تھی، مگر اس کے دل و دماغ میں ویسا ہی اضطراب تھا جیسا گاؤں میں گزاری اس شب اس کے اندر سرسرا رہا تھا، حالانکہ یہ اس کے تمام تر جدید سہولیات سے مزین لکڑی بیڈروم تھا، جس میں اے سی کی کولنگ سے لے کر فضا میں پھیلا ایر فریشنز تک سب کچھ اس کی پسند اور ذوق کے عین مطابق تھا، مگر سکون پھر بھی وہیں رہ گیا تھا، وہیں اسی پسماندہ گاؤں کے بے حد پسماندہ سے گھر میں، کتنے دن ہو گئے تھے اسے گاؤں سے لوٹے۔

کتنے ہی دن ہو گئے تھے، اس جان لیوا وحشت میں مبتلا کر دینے والے انکشاف کو سہتے، جسے وہ خود بھی قبول کرنے میں متاثر رہی تھی، مگر کب تک؟

اس نے جانا تھا وہ اس شخص کی بد مزاجی سے لے کر ہر طنز یہ جملے کو اگر وہاں خاموشی سے سہہ آئی تھی تو اس کے پیچھے بھی اس جذبے کا آغاز کار فرما تھا۔

اسے اعتبار نہ آتا تھا وہ اس شخص سے محبت کر بیٹھی ہے، جو اس سے اللہ واسطے کا کوئی بیر باندھ چکا ہے، جس کی بد مزاجی سے غرور و تکبر تک کا ہر احساس اسی کے لئے وقف تھا، کیوں؟

یہ کیوں ایسا جال تھا جس میں وہ اس کھوج میں پھنس گئی تھی، جس سے نکل نہیں پا رہی تھی کہ اتنا ہی سوچا تھا اس نے اسے کہ بس اس کو سوچنے کے قابل رہ گئی۔

یہ بھی نہیں تھا کہ اس شخص میں محبت کے قابل کچھ نہیں تھا، وہ تو تھا ہی ایسا کہ اسے دیکھا جائے اور محبت ہو جائے، یہ اس کا رعب حسن ہی تو تھا کہ وہ ہر بار اس سے سامنے اپنی زبان کو گنگ ہوتا

محسوس کرنے لگتی تھی، عجیب یہ ہوتا کہ اسے دیکھا جائے اور پھر بھی محبت نہ ہو، یہی ممکن نہ تھا، حالانکہ اس شخص کے کسی رویے میں بھی ایسی گنجائش نہ نکلتی تھی کہ کس ایسے احتمالاً جذبات کی آبیاری کا امکان پیدا ہوتا، لیکن یہ بھی سچ ہے کہ محبت ہی وہ سرکش دے لگام جذبہ ہے جو اختیار سے ہمیشہ باہر رہا ہے اور ہمیشہ وہیں نمود پاتا ہے جہاں سے بدلے کی گنجائش نہ نکلتی ہو، وہ اس کی حد تک سفاک منہیت کو پاگئی، تو ہار گئی، یہ سوچ اسے رلانے کو کافی تھی آیا وہ اس شخص کے کس انداز پہ خود کو لٹا آئی۔

ایک اور بھی تکلیف دہ پہلو تھا کہ اس سفر پر خار کا انجام کیا ہونا تھا، اذیت انگیز بات یہ تھی کہ وہ بہر حال اس شخص کے آگے پسپا ہو گئی تھی جس کے دل میں محبت تو دور کی بات وہ اسے عزت کی نگاہ سے بھی نہیں دیکھتا، بلاشبہ محبت ازل سے مشکل راستوں کو ہمسفر کرتی آئی ہے مگر اس کے نصیب میں شاید کچھ اضافی کٹھانیاں تھیں، صرف اس شخص کے مزاج کے رنگ ہی انوکھے نہیں تھے، اس کی قسمت کہ اس کے اپنے گھر میں بھی اس کے خلاف اک محاذ کھل جاتا تھا، لیکن ان گزرنے والے دنوں نے اسے اس کی شدت نے یہ ضرور بتلادیا تھا کہ اسے ہر صورت یہ کٹھانیاں طے کرنی ہیں، ہر رکاوٹ کو عبور کرنا ہے اور ہر مشکل کو سہہ جانا ہے، کچھ بھی ہو جاتا مگر..... منیب چوہدری سے دستبرداری کو دل آمادہ نہ تھا، نہ ہو سکتا تھا۔

☆☆☆

شام دھیرے دھیرے ڈھانے لگی، افق کے پار سورج ڈوب رہا تھا، آتشی گلابی رنگ کی ایک واضح لکیر گاڑی کے ساتھ ساتھ بہت دور تک دوڑتی رہی، صحرا جیسے وسیع آسمان پر قدرت نے چراغ جلا دیا تھا، جو افق کے پار دور تک آسمان کو جلا دینا چاہتا تھا، مغرب کا وقت تھا، اس نے اپنی جلتی ہوئی آنکھیں رگڑ ڈالیں، واچ مین اسے دیکھ کر مودب ہو کر جھکا اور لپک کر گیٹ کھولنے لگا، گاڑی بحری کی سرخ روش پہ پھیلتی سفید ستونوں کی چھت والے وسیع پورٹیکو میں جا رہی، وہ جیسے ہی دروازہ کھول کر باہر آیا اس کے انتظار میں سوکھتیں وہ تیزی سے اس کے راستے میں آگئیں۔

”آگیا میرا بیٹا!“ انہوں نے شفقت و محبت سمیت کہتے اس کے مضبوط چوڑے شانوں کو چھوا، وہ تھکا ہوا متحائل لگتا تھا، ہاتھ میں موجود خوبصورت کور سے بھی فائل دوسرے میں منتقل کرتے سرخ و سفید چہرے سے نادیدہ پسینہ پونجھنے لگا، قدموں کی رفتار ہنوز بھی، نہ بہت تیز نہ سست، آنکھوں پہ سن گلاسز تھے، جو بہت جتے تھے اسے، اس پہ اس کی باوقار شاہانہ حال، وہ کسی ریاست کا شہزادہ لگتا تھا، دراز قامت، غضب کا مردانہ روپ، ٹھنکا دینے والی پرسنالٹی، آنکھوں کا حسن تو جان لیوا تھا، ان کا دل دکھ کے انوکھے احساس سے لبریز ہونے لگا، (کوئی ایسے حسین چہرے سے بھی نفرت کر سکتا ہے؟) انہوں نے دکھ میں مبتلا ہوتے اچنبھے میں خود اپنے آپ سے سوال کیا تھا۔

”کچھ کھاؤ گے؟“ وہ اس کے ہمراہ چلتیں اس کے کمرے تک آگئی تھیں، وہ فائل رکھ کر دراز لاکھڑ کر رہا تھا، یونہی جھکے جھکے سر کو نفی میں ہلا ڈالا، انہوں نے ہونٹ بھیج لئے۔

”تو کیا جوگ لو گے اس حرافہ کی خاطر؟“ وہ بالآخر پھٹ پڑیں، بلکہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیں، وہ جیسے کھڑا تھا اسی زاویے پہ ٹھہرا رہ گیا، معاً پلٹا تھا اور انہیں شانوں سے تھام لیا، مگر وہ تو سنبھلی سی

بچی کی مانند اس کے چوڑے سینے سے لگ کر بے حال ہونے لگیں۔

”نہیں دیکھی جاتی یہ حالت مجھ سے تمہاری، مون اولاد سے بڑھ کر تمہیں چاہا، کیوں خود کو برباد کرتے ہو بتاؤ؟“ وہ ردو کر ہلکان ہوئی جاتی تھیں، اس نے ان کا چہرہ بہت نرمی و رومان سمیت ہاتھوں کے پیالے میں لے لیا۔

”اپنے بھائی کو اتنا کمزور سمجھتی ہیں آپا؟“ وہ بہت کرب سے مسکرایا، گاسز اتر چکے تھے، اب جان لیوا حسن کی مالک آنکھوں کی تباہ کن خوبصورتی اور حزن نمایاں تھا۔

”میں ہرگز برباد نہیں کر رہا خود کو، نہ کوئی جوگ لوں گا، ٹیک اٹ ایزی۔“ وہ ان کے آنسو پونجھ رہا تھا، انہیں قدرے سکون آیا، مگر غیر یقینی اپنی جگہ تھی۔

”پھر یہ سب کیا ہے؟“ وہ شاکی ہوئے بغیر نہ رہ سکیں، اب کے اس نے جواباً ہونٹ بھیج لئے۔

”اماں کی وفات کے بعد یہ دوسرا کٹھن مرحلہ ہے میری زندگی کا آپا، تھوڑا وقت دیں، میں خود کوسمیٹ لوں۔“ وہ نظریں چرا رہا تھا، انہوں نے بغور اسے دیکھا، گویا اس کے اندر کا بعید پانے کی متمنی ہوں۔

”کیا کرنے والے ہومون؟“ وہ ہولنے سی لگیں۔

”جو وہ چاہتی ہے۔“ وہ بو جھل آواز میں کہہ گیا اور یوں بیٹھ گیا جیسے بہت تھک گیا ہو۔

”یعنی طلاق دے دو گے؟“ سوال کرتے انہیں لگا خود اپنا کلیجہ نوچ رہی ہوں، اب کی بار جواب میں محض سر ہلایا گیا، وہ گنگ سی اسے دیکھتی رہیں، انہیں اس کی شادی کا دن یاد آیا، جب سب کی مخالفت کے باوجود دونوں اک دوسرے کو پا کر بے حد مسرور تھے۔

”اور بچے؟“ وہ جیسے سہمی سہمی بولیں، جانتی تھیں وہ کرتا وہی تھا جو اس کا اپنا دل چاہے، باقی کوئی لاکھ سرچ لے، اب بھی اس کی ہاں ناں میں گویا اس کی زندگی کا فیصلہ مشروط ہوا۔

”بچے بھی۔“ جواب مل گیا اور وہ بے جان ہوتی یوں بیٹھ گئیں جیسے کبھی کھڑی نہیں ہو سکیں گی۔

”یہ کیسے کر سکتے ہو تم مون؟“ وہ بے ساختہ و بے اختیار رو پڑیں۔

”قانونی تقاضا ہے آیا! مجبوری ہوگی، جیسی تو یہ فیصلہ اتنا کٹھن ہو رہا ہے میرے لئے۔“ اس کی آواز مزید بو جھل ہو گئی، کمرے میں جیسے موت کا سناٹا چھا گیا، اس کے بعد بہت دیر بیت گئی دونوں سے کوئی نہیں بول سکا، وہ خاتون تھیں رو سکتی تھیں، وہ مرد تھا کیسے رو لیتا، وہ نہیں رو سکتا تھا۔

☆☆☆

شدت درد میں آئی نہ کوئی کی رات بھر
درد پھر درد رہا الٹا بھی لکھا سیدھا بھی لکھا

اس کی کیفیت بے حد بے دھیانی کی تھی، اسی غفلت بھرے انداز میں وہ کانٹے سے سلاکس کو بھنبھوڑ رہی تھی، اسی غفلت میں ماما کی نظروں کا عمیق جائزہ بھی ڈوبتا جا رہا تھا، جو عام حالات میں اسے خائف کرنے کو کافی ہوا کرتا، انہوں نے جوس کا سیپ لے کر بلوریں جار واپس میز پر رکھ دیا،

مگر اس طرح کہ شیشے سے شیشہ ٹکرانے کی آواز پیدا ہو، وہ ہونک جائے اور ان کی فنگلی کو محسوس کرے، لیکن وہ غافل تھی، غافل رہی پچھلے پندرہ منٹ سے اس کی یہی کیفیت تھی، وہ اسی طرح ناشتے کی میز پر موجود تھی، اس کے سامنے دنیا کی بہترین نعمتیں بھی ہوئی تھیں، مگر وہ ان سب سے غافل تھی، ان سمیت وہ کیسے برداشت کرتی تھی۔

اس سے قبل بھی جب انہوں نے اسے چائے بنانے کا کہا تو چائے ٹی پاٹ سے کپ میں انڈیلے وہ بے خیال تھی، اتنی ڈالی کہ چائے کپ کے کناروں سے چھلک گئی، وہ تب ہڑبڑائی تھی، مستعد ملازمہ نے با سرعت کپ اس کے سامنے سے ہٹایا میز صاف کی، تب سے اب تک غانیہ کے حلق سے کچھ نہیں اترتا تھا، مگر جو اسے دو سے تین بار ٹوک چکی تھیں اس کی کیفیت کو اچنبھے و تشویش کی نگاہ سے دیکھتے غصے سے بھرنے لگیں۔

”کالج کیوں نہیں جا رہی ہو غانیہ؟ یونو واٹ تمہارے ایگزیم قریب ہیں مگر تمہیں ہوش نہیں ہے، یعنی حد ہو گئی صاحبزادی کو اس کے ایگزیم کے متعلق بھی مجھے انفارم کرنا پڑ رہا ہے۔“ تمام تر ضبط کے باوجود اس کا لہجہ کڑا اور درشت ہو چکا تھا، غانیہ یوں چونکی گویا گہری نیند سے ہڑبڑا کر جاگی ہو اور خالی نظروں سے انہیں دیکھنے لگی، مگر کو چراغ یا کرنے کا باعث اس کی نظروں کا یہی استفہامی انداز تھا، یعنی یہ اہمیت تھی اس لڑکی کے نزدیک ان کی باتوں کی۔

”کچھ سمجھ تو نہیں آئی ہو گی تمہیں کہ کیا بکواس کر رہی ہوں میں؟“ وہ جس طرح ابلیں جس طرح تڑکی تھیں، غانیہ صرف سنبھلی نہیں خائف بھی نظر آنے لگی، مگر کارویہ ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا تھا مگر وہ اپنے اصولوں میں بہت سخت تھیں۔

”آج پھر اتالیٹ جاگی تم کہ کالج ٹائم اور ہو چکا تھا، آخر چاہتی کیا ہو تم؟“ جس وقت مگر اسے اتنے کڑے انداز میں جھاڑ جھاڑ رہی تھیں پتا اسی بل تیار ہو کر ڈانٹنگ ہال میں آئے تھے۔

”کچھ تو فضلہ اور اسد سے عقل چمکی ہوئی، ماشاء اللہ دونوں ہائر ایجوکیٹڈ ہیں، امریکہ جیسے ملک میں دونوں ہی اعلیٰ پوسٹ پر ہیں، اک تم ہو، مجھے نہیں لگتا گریجویٹیشن بھی کمپلٹ کر سکو، کل فضلہ کا فون آیا، نواب زادی اپنے کمرے سے نہیں نکلی۔“ مگر کا غصہ کسی طور کم ہونے میں نہیں آ رہا تھا، آخری شکایت پتا سے ہی لگائی، کرسی کھینچ کر نشست سنبھالتے پتا دانستہ کھنکارے اور نگاہوں ہی نگاہوں میں گویا غانیہ سے اس گرج چمک کی وجہ دریافت کرنی چاہی مگر جواب میں وہ محض آنسو بھری نظروں سے ہی انہیں دیکھ سکی۔

”ہو کیا گیا بیگم صاحبہ! ارلی مارننگ ہماری گولڈن فیری کی اتنی سخت کلاس کیوں لگا دی آپ نے؟“ انہوں نے اپنے لئے مگ میں چائے نکالتے مداخلت ضرور کی مگر اسی کے حق میں تو مگر کا جلال مزید بڑھا۔

”ابھی سے سن لیں، اس معاملے میں آپ کچھ نہیں بولیں گے جمال! پہلے ہی آپ کا لاڈ پیار سے اول درجے کی ٹی بنی چکا ہے، تین ماہ بعد پورے اٹھارہ سال کی ہو جائے گی مگر اب تک۔“

”ہو جائے گا گریجویٹیشن بھی مسز! لیکن پلیز اس وقت تو بچی کو ناشتہ کرنے دیں دیکھیں میری شہزادی کا کتنا سامنہ نکل آیا ہے۔“ پتا نے نرمی سے ٹوکے سائیڈ پھر بھی اسی کی لی تو مگر انہیں

گھورے بغیر نہ رہ سکیں۔

”یہ اتنا سامنے میری وجہ سے نہیں اس دن سے نکلا ہوا ہے جس روز سے گاؤں سے لوٹی ہے، کچھ کھاتی پیتی ہی نہیں، جانے کون سا آسیب چمٹ گیا ہے۔“ ماما کا اصل غصہ ظاہر ہو ہی گیا، غانیہ پہلے بے ساختہ چونکی پھر اپنی جگہ سہم سی گئی، اگلے لمحے خود کو سنبھالتی تیزی سے اٹھی تھی، ماما کے الفاظ اسے بھک سے اڑا کر رہ گئے تھے، کس قدر درست قیافہ تھا ان کا اس کا خائف ہونا بنتا تھا، البتہ پپا نے خاص دھیان نہیں دیا کہ جانتے تھے بیشتر عورتوں کی طرح وہ بھی سرالی عزیزوں سے خار کھاتی تھیں۔

”کم آن بیٹے! ناشتہ تو۔“

”مجھے بھوک نہیں ہے پپا!“ وہ بھرائی آواز میں کہتی کرسی دھکیل کر اٹھ گئی۔

”غانیہ بیٹھو یہاں اور ناشتا.....“ ماما کی سختی سے شروع کی گئی تنبیہ بھی ادھوری رہ گئی، وہ تیز قدموں سے ڈائننگ ہال کا دروازہ بار کر گئی تھی، غیر یقین و حیرت کے باعث ماما کا منہ کھلا رہ گیا، پپا نے بامشکل مسکراہٹ دبائی مگر ماما دیکھ چکی تھیں، جیسی تیخ پا بھی ہو چکی تھیں۔

”دیکھ رہے ہیں اپنی بے جا حمایت کا نتیجہ؟“ وہ غرائیں اور گویا پنچے جھاڑ کر ان کے پیچھے

پڑیں۔

”آپ غصہ تھوک کیوں نہیں دیتیں؟“ پپا نے لا چاری سے انہیں دیکھا۔

”اس کے رنگ ڈھنگ بھی تو دیکھیں، خدا کی پناہ، مجھے تو ڈر لگنے لگا ہے اس سے اور یہ سب

تب سے ہو رہا ہے جب سے یہ گاؤں.....“

”گاؤں آخر آپ کے حواسوں پہ کیونکر سوار ہو گیا ہے نازنین؟“ وہ عاجز ہو کر رہ گئے، جوابا

ماما نے انہیں کھا جانے والی نظروں سے گھورا۔

”وجہ جانتے ہیں آپ کو کیوں سوار ہو گیا ہے، آپ اسے لے کر ہی کیوں گئے آخر؟ مجھے تو

آپ کے ارادے بھی مشکوک لگ رہے ہیں؟“ وہ روہا سی ہوتی جا رہی تھیں، پپا ا یکدم سنجیدہ نظر آنے لگے۔

”اپنے خدشات کو زبان نہ دو نازنین بیگم! برسوں قبل کی وہ بات کب کی اپنی اہمیت کھو چکی،

ایسا وہاں کسی کے بھی گمان میں نہیں اب اور زبردستی کے قائل نہیں میرے رشتے.....“ وہ کسی حد تک

جارحانہ موڈ میں واضح کر رہے تھے، ماما نے یوں سر جھٹکا جیسے ان کی بات کو سرے سے اہمیت نہ دی

ہو۔

”سب جانتی ہوں جتنے وہ صابر و شاکر ہیں، وہ تو ہر طرح جال پھیلائیں گے کہ کسی طرح یہ

کام ہو جائے، مگر پھر سن لیں جمال، اگر کبھی آپ نے ایسا کیا تو میرا برا ہوا منہ دیکھیں گے، میں ہر

گز ان گنواروں سے کوئی تعلق استوار نہیں کر سکتی۔“ وہ پھنکار پھنکار کر کہہ رہی تھیں، پپا نے چائے

کالگ واپس رکھ دیا، نازک فریم کے گلاسز اتار کر سائیڈ پر رکھے اور انہیں دیکھ کر مسکرائے۔

”تعلق تو استوار ہو چکا نازنین بیگم!“ ان کا انداز اطلاعیہ تھا یا طنز آمیز ماما سمجھنے سے قاصر

رہیں، البتہ دھک سے ضرور رہ گئیں، بلکہ ہاتھ میں پکڑا کاٹنا بھی چھوٹ گیا۔

”واٹ؟“ ان کا رنگ فق ہوا۔

”کیا کہا آپ نے؟“ ان کے چہرے پر زلزلے کے آثار نمایاں ہونے لگے، پاپا دلچسپی سے تبسم خیز نظروں سے انہیں دیکھتے رہے۔

”وہی جو تم نے سمجھا۔“ پاپا نے معنی خیزیت سے کہتے انہیں مزید ہولایا اور وہ جیسے بے ہوش ہونے کے قریب جا پہنچیں۔

”کیا سمجھا میں نے؟“ ان کی آواز سرسرائی، کانپنے لگی، معاوہ ایک دم بھر کر انھیں اور طیش بھرے انداز میں ان کا گریبان پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا۔

”کہیں..... کہیں آپ نے اس برسوں پرانے عہد کے مطابق میری بیٹی..... کی زندگی برباد تو نہیں کر دی؟ اپنے پہلے سے بہا ہتا بیٹے دو ہا جو سے اولاد والے سے، میری بیٹی کا نکاح تو نہیں کر آئے؟ بولیں جمال..... بولیں، سچ بولیں گے، ورنہ مر جاؤں گی میں؟“ وہ ہراساں تھیں، گویا بے ہوش ہونے کے قریب، پاپا گھبرا گئے، شپٹا گئے، مذاق ان کے گلے پڑ چکا تھا، انہوں نے جان کنی کے عالم میں جاتی بیوی کو با مشکل سنبھالا، قسمیں کھانے لگے۔

”مذاق کر رہا تھا میں نازنین! کیا ہو گیا ہے یار۔“ وہ ان کے ہاتھ سہلاتے یقین سوئپ رہے تھے۔

”ایسا بڑا فیصلہ کیسے کر سکتا ہوں میں، پاگل ہو تم؟“ وہ ان کی شک بھری نظروں اور بے اوسان سانسوں کی بدولت ہر لمحہ مضطرب وضاحتوں پہ وضاحتیں پیش کرتے تھے۔

”میرا مطلب تو اپنے اور تمہارے تعلق کے حوالے سے تھا احق۔“ وہ پھر تو صبح دے رہے تھے اور دروازے پہ ساکن گھڑی غانیہ کو لگتا ہے وہ پتھر کی ہو گئی ہے، وہ تو آفس سے آنے والا پاپا کا فون سن کر انہیں اطلاع دینے آرہی تھی کہ ایسے ایسے انکشافات ہوتے چلے گئے، بات اگر گاؤں اور اس کے مکینوں کی نہ ہوتی تو بھلا سب کچھ بھلا کر وہ چپکے سے سب سننے کی متمنی ہوتی، برسوں قبل اس کا سنجوگ کس سے ہوا تھا؟ اس کا دل دھک دھک کرتا تھا۔

تاؤ جی کے بیٹوں میں سے تو شادی شدہ صرف بھاجیب تھے، کیا وہ ان سے منسوب تھی؟ وہ چاہتی بھی تو یقین نہ کر پاتی، پاپا ایسا کر سکتے تھے؟ نہیں ہرگز نہیں، بھاجیب تو اس سے بہت بڑے تھے، کم از کم بھی تو پندرہ بیس سال..... پھر..... پھر۔

وہ پلٹ گئی، غیر یقین سی، غیر یقین تھی۔

کیا اس شخص کی نفرت کا سرا اسی کڑی سے ملتا تھا؟ وہ سوچ سوچ کر پاگل ہوئی جاتی مگر جواب نہیں ملتا تھا، وہ جواب کس سے لیتی، سمجھ نہیں آئی تھی، بے بسی سی بے بسی تھی۔

اذیت سی اذیت، وہ جلے پیر کی بلی کی مانند پورے کمرے میں چکراتی پھرتی تھی جب ماما اس کے کمرے میں آگئیں، آہٹ پہ اس نے پلٹ کر انہیں دیکھا، اس کی نظریں پہلی مرتبہ انہیں دیکھتے عجیب تھیں۔

”تم مجھے سچ بتاؤ غانیہ، تمہیں ہوا کیا ہے، کچھ نہیں چھپاؤ مجھ سے بیٹے۔“ وہ اسے مخاطب کر چکی تھیں، انداز میں فکر مندی بھی تھی، محبت بھی اضطراب بھی تھا، عجیب سی وحشت بھی، وہ انہیں

قرآن شریف کی آیات کا احترام کیجیے

قرآن مجید کی مقدس آیات اور احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی دینی تعلیمات میں اضافہ اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حسرتی سے غور و نظر کریں۔

دیکھتی رہی، یہاں تک کہ آنکھوں میں پھیلتی نمی کے باعث نگاہوں میں ان کا چہرہ دھندلا گیا، اس نے ان کے ہاتھ اپنے کاندھوں سے ہٹا دیئے۔

”اک بات آپ بھی مجھے بتا دیں پہلے ماما! پراس..... میں آپ سے کچھ نہیں چھپاؤں گی۔“ وہ بولی تو اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی، ماما چونکیں ضرور مگر سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا تھا۔

”ہاں بولو بیٹے؟“

”بچپن میں پپا نے مجھے تاؤ جی کے بیٹے سے منسوب کیا تھا؟ کس بیٹے سے منسوب کیا تھا؟“ بیٹے نے بول دیا تھا اور ماما کو سکتہ کر ڈالا، ان کا برسوں کا خوف ان کے سامنے تھا، وہ ایک دھچکے سے نکل کر آئی تھیں، مزید دھچکا ان کی برداشت چھین لے گیا۔

”تمہیں یہ سب کہاں سے معلوم ہوا؟“ وہ حواس میں آئیں تو چیخ پڑیں۔

”اس بات کو چھوڑ دیں ماما؟“ غانیہ کا سرمہ انداز انہیں لگا زمین ان کے قدموں تلے سرکنے لگی۔

”منیب سے..... اور سن لو..... میں کبھی تمہاری اس سے شادی نہیں ہونے دوں گی، سنا تم نے؟ اس کے باوجود بھی کہ اس کے ظاہری حسن کی وجہ سے تم اس پہ مر مٹی ہو تب بھی۔“ انہوں نے پاگلوں کی مانند اسے دھکا دیتے ہوئے چلاتے ہوئے کہا تھا، غانیہ گرتے گرتے بچی۔

”منیب سے؟“ اسے لگا خوش بخشتی نے اسے چھو لیا ہے۔

”ہاں منیب سے ہی، مگر یہ رشتہ اسی وقت اپنی اہمیت کھو گیا تھا، جب اس نے اپنے گھر والوں کی مرضی کے بغیر پسند کی شادی کی اور پھر اسے طلاق دے دی، میں..... میں اپنی بیٹی کی شادی اس سے نہیں کروں گی، امپا سبل۔“ وہ اور بھی بہت کچھ کہہ رہی تھیں ہجانی انداز میں غانیہ کو مگر کچھ نہیں سن رہا تھا اب منیب شادی شدہ تھا؟

اسے لگا اس کی خوش چھین گئی ہے، وہ اس دنیا کی سب سے بد بخت لڑکی بن گئی تھی، آن کی آن میں ہی، اس کی اولاد بھی تھی، وہ زمین پہ بیٹھتی چلی گئی۔

سب کچھ غلط ملط ہوتا چلا گیا، سب کچھ ہی الٹ پلٹ ہوتا جا رہا تھا، ہنسی تاراج کیسے ہوتی ہے، ایسے انہی چند لمحوں میں معلوم ہو گیا، روگ کیسے لگتے ہیں، اس نے چند سیاعتوں میں جان لیا، سیاعتوں میں شور تھا، بہت شور، بشارتوں میں تاریکیاں اتر رہی تھیں، اس کا ہر تعلق حواس سے کٹنے لگا۔

(باقی اگلے ماہ)

محبت میں بھیگتا موسم

سائنس کا طائر



اہمیت دکھ کی نہیں ہوتی، دکھ دینے والے کی ہوتی ہے، کچھ دوست کھیل ہی کھیل میں زندگی سے کھیل جاتے ہیں، کیا وہ واقعی ہی دوست ہوتے ہیں؟

شاید وہ دوست نہیں ہوتے، آستین میں ملنے والے سانپ ہوتے ہیں، جنہیں جب بھی آزمایا جائے وہ ڈسے بغیر رہ نہیں سکتے۔

اس کا دوست بھی کچھ ایسا ہی ثابت ہوا تھا، نام کا سلطان تھا، نیت کا بے ایمان اور اس وقت انتہائی نازک صورتحال میں ارسلا کے گھر میں موجود ڈرائنگ روم کے عین وسط میں بے حد حیران، ششدر، متحیر اور نادم کھڑا تھا، یہ پشیمانی اس چال کے لئے تھی جو اسی پہ الٹی جا چکی تھی۔

شاید وہ اس صورت حال کو سمجھ نہیں پا رہا تھا؟ یا سوچ رہا تھا، اس کے ساتھ ہوا کیا ہے؟ یا اس کے ساتھ کیا کیا گیا تھا؟

اپنے تئیں اس نے بڑی شاطر چال چلتے ہوئے گیم کھیلنے کی کوشش کی تھی، شاید اس کی گیم کامیاب ہو جاتی، اگر بیچ میں ماہ پارہ نام کی کالین نہ آ جاتی، اس کے آ جانے سے سلطان کی گیم کا پانسہ الٹ گیا تھا، وہ نامراد ہو گیا، ناکام ہو گیا۔

اور یہ پشیمانی محض ناکامی کے لئے ہی نہیں تھی بلکہ دوست کی نگاہوں سے گرنے کی وجہ سے بھی تھی، اس گھر کے ڈرائنگ روم میں اپنے دوست کو غیر متوقع دیکھ کر سلطان کے حواس جاتے رہے تھے، اس کی بنی ہوئی جھوٹی کہانی کی مالا ٹوٹ پھوٹ گئی تھی اور اس کا جھوٹ کھل کر سامنے آ گیا تھا، سلطان مارے ذلت، رہانت اور پشیمانی کے بھونچکا رہ گیا۔

جبکہ کھڑکی کے اندر زرتار کپڑوں میں بھی دوہن سوچ رہی تھی، اگر غلط فہمی دل میں زیادہ دیر رہے تو بدگمانی کو جنم دیتی ہے اور بدگمانی فاصلوں

مکمل ناول



کا باعث بنتی ہے، نہ وہ بدگمان ہوتی نہ غلط فہمیوں کے جال میں پھنستی اور نہ ان کے درمیان دوریوں کی اونچی دیواریں کھڑی ہوتیں، سفر سے آیا تھکا ہارا مسافر فی الوقت ساری تھکان بھلا کر اپنے دوست کو آئینہ دکھانے کے بعد سوچ رہا تھا۔

”اگر تم بیچ میں نہ آتے تو یہ سنہرا وقت بھی نصیب میں نہ آتا، تم بیچ میں ”فصیل“ بن کر آگے تو یہ سنہرا وقت بھی میرا نصیب بنا، چلو تمہیں اس سنہری کھڑی اور دلنشین ملن کی ساعت کے بدلے معاف کرتا ہوں۔“ جبکہ ہر چیز سے بے نیاز چال چلنے والے کو اپنی چال کے اٹنے کا صدمہ غم زدہ کر رہا تھا، وہ لئے پئے قدموں سے ناکام لوٹ رہا تھا۔

☆☆☆

یہ ایک سلگتی ہوئی دوپہر تھی۔

دوپہریں سلگتی ہوتی ہیں یا نہیں، لیکن اسے سلگتی نظر آتی تھیں، ان دنوں تو ہر دوپہر سلگ رہی تھی، گرم، تپتی ہوئی، پر حدت، یوں لگتا تھا آگ برس رہی ہے، ہر طرف آگ ہی آگ تھی، اندر بھی آگ، باہر بھی آگ۔

کیا ساون کی گیلی دوپہریں بھی سلگتی ہیں؟ کیا پر نیم سے پہرے بھی سلگتی ہیں؟ ساون تو نام ہی نمی اور سیلاہٹ کا تھا، ساون آتے تو بادلوں کے ہنڈولے لاتے، ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے آتے، کبھی پورا دن بوندوں کی پازیبیں بجتی تھیں یا پورا دن آسمان بادلوں میں گھرا رہتا تھا، یوں کوئی دوپہر پر پیش نہیں تھی، فضا میں خشکی اور نمی محسوس ہوتی تھی۔

پھر بھی اسے ہر دوپہر گرم محسوس ہوتی، پر حدت، پر پیش، آگ اگلتی ہوئی، یہ آگ اندر بھی یا باہر؟ آگ کدھر تھی؟ آگ کہاں تھی؟ آگ کہاں سے آئی تھی؟

اور وہ کسے بتاتا؟ اور وہ کسے بتاتا؟ آگ تو وہاں سے آئی تھی جس کی طرف اس کا گمان نہیں تھا، اس کا ایتقان نہیں تھا اور آگ وہاں سے آئی تھی، جس کی طرف اس کا تخیل، سوچ، فکر اور خیال تک نہ جاتا تھا۔

☆☆☆

فون کی گھنٹی بجی تو پھر ایک تو اتر سے بجتی چلی گئی تھی۔

”ٹرن، ٹرن، ٹرن۔“ ہر آواز کے ساتھ ایک پیغام آتا تھا، التجاؤں میں ڈوبا، سسکتا، پر نیم اور اس کا دل ہر گھنٹی پہ یوں دھڑکتا جیسے آخری بار دھڑک رہا ہو، جیسے آخری بار اپنے ہونے کا احساس دلا رہا ہو۔

”عدم حکم! تم پہ منکر محبت کا الزام آتا ہے، تم ایسی باغی یا دوگرداں تو نہیں تھی، پھر عدم تعمیل میں ایسی تاخیر کیوں؟“

اور وہ اپنے ایذا کا کیا سبب بتاتی، اس کی روایات اور دنیاوی معیار کی زنجیروں میں پابند سلاسل کر دیا گیا تھا۔

ہر گھنٹی پہ اس کا دل دھڑکتا، سلگتا، تڑپتا اور پھر ایسے چپ سداھ لیتا جیسے سینے کی دیواروں تلے دب گیا ہو، کبھی نہ اٹھنے کے لئے، کبھی نہ دھڑکنے کے لئے اور کبھی جو دل مجرم کو عدالت مجاز میں کھڑا کر کے سوال کیا کرتا۔

”بتا تو، منکر محبت کا نافرمان کیوں ہوا؟ تجھے سزائے گناہ سے سرفراز کیا جائے؟“ تو وہ پورے اختیارات والی اس کچھری میں صف ماتم بچھا لیتی، اتنے بین کر بی کے آسمانوں کے پردے تک ہلا کر رکھ دیتی، اونچی آواز میں چلاتی اور ایک ایک باختیار نفس کا گریبان پکڑ کر آہ و فغاں کرتی۔

”میرے دل کے ساتھ منافقت کا رویہ روا نہیں رکھا گیا، میرے ساتھ عدل نہیں کیا گیا،

تھا، نہ گمان نہ وہم، یہ ایک تلخ ترین دل کو چیر دینے والی سچائی تھی، کہ زیان احمد پردیس میں اپنی الگ دنیا بسا چکا تھا۔

☆☆☆

ارسلہ کا تعلق ایک خوشحال گھرانے سے تھا۔ اس کے والد کا اپنا بزنس تھا، دو بھائی تھے، وہ بھی والد کے ساتھ بزنس کرتے تھے، ارسلہ کی امی گھریلو خاتون تھیں، گھر میں روپے پیسے کی تنگی نہیں تھی، ہر طرح کی خوشحالی تھی۔

لیکن ارسلہ کا گھرانہ ماڈرن یا آزاد خیال نہیں تھا، گو کہ بہت دقیانوسی بھی نہیں تھے، پھر بھی روایات اور پرانی اقدار کا پاس رکھا جاتا تھا۔

ارسلہ کو ایک حد تک بس آزادی تھی، کالج سے گھر آنا اور انکلوٹی سہیلی ماہ پارہ کے گھر جانا، وہ بھی کبھی کبھار کیونکہ امی کو ماہ پارہ کے گھر بھی جانا اتنا پسند نہیں تھا۔

بس یہ تھا کہ ماہ پارہ اور ارسلہ اکٹھے کالج جایا کرتی تھیں، واپس بھی اکٹھے آتی تھیں، دونوں میں اچھی دوستی تھی، سو ماہ پارہ اکثر اس کے گھر میں پائی جاتی تھی۔

ان کا کالج بھی قریب تھا، پیدل صرف بیس منٹ لگتے، وہ دونوں باتوں باتوں میں کالج پہنچ جاتی تھیں۔

ماہ پارہ کا گھر کالج کے زیادہ قریب تھا، آگے کالج اور پھر نوٹو اسٹیشن کی چھوٹی دوکانیں، اس سے آگے چھوٹے موٹے اسٹال تھے۔

وہ دن بڑا خوشگوار تھا، اس دن ارسلہ کمپیوٹر لیب سے نکل کر باہر آئی تو ماہ پارہ کچھ نوٹس لہراتی اس سے ٹکرا گئی تھی، ارسلہ ارے ارے کرتی بمشکل گرنے سے بچی تھی۔

”ہوا کے گھوڑے پہ کیوں سوار ہو؟“ ارسلہ نے حواس باختہ ہو کر پوچھا، اس کے ہاتھ سے

میرے دل کے گنبد کو توڑ توڑ کر چور کیا گیا۔“ لیکن اس کی ساری تڑپ، اذیت، درد اور آنسوؤں کو ایک مدہم اور ٹھنڈی آواز دبا ڈالتی تھی۔

”ارسلہ! اٹھو اور دسترخوان بچھا دو، دیکھو، سکینے بی نے کھانا تیار کر لیا؟ آج کے بعد تم کھانا لگاؤ گی پورا وقت خاموشی کی بکل اوڑھ کر جانے کون سا مراقبہ کرتی ہو۔“

امی کا ٹھنڈا ٹھار لہجہ ارسلہ کو حواسوں میں لے آتا تھا، اس کے لاشعور میں بجتی فون کی گھنٹیاں خود بخود خاموش پڑ جاتی تھیں اور وہ حواسوں میں آ کر حیرانگی سے فون کی طرف دیکھتی رہتی، وہ فون جس کی کیبل کٹ چکی تھی، جو بے جان تھا، جس کے اندر سے کوئی آواز نہیں آ سکتی تھی، نہ اس سے کوئی نمبر ڈائل کیا جاسکتا تھا۔

تب ارسلہ کسی ستارے کی طرح پارہ پارہ ہو جاتی، ٹوٹ کر بکھر جاتی، بکھر کر ارزاں ہو جاتی، اس کے باوجود دل تھا کہ اپنی ڈگر سے ہٹا نہیں تھا، دل تھا کہ اپنی ڈگر کو چھوڑتا نہیں تھا اور دل کا مکین اس کے ہر کرب سے بے نیاز اپنی الگ دنیا بسا کر شاد، مطمئن اور مسرور تھا، ایک اور دنیا کا باسی، ایک اور نگر کا مکین۔

ساری تکلیف وہ حقیقتوں کے انکشاف ہو جانے کے بعد بھی ارسلہ کا دل اپنی ضد پہ اڑا ہوا تھا، کچھ بھی ماننے کو تیار نہیں تھا، کچھ بھی تسلیم کرنے سے انکاری تھا۔

اسے لگتا جیسے سب کچھ جھوٹ ہو، غلط ہو، ایک فرسودہ اور من گھڑت فسانہ ہو، جو اس کے کانوں میں اترتا ہو وہ جھوٹ کے پلندوں اور جھوٹی کہانیوں کے سوا کچھ نہ ہو۔

لیکن یہ سب وہ دل کی تسلی کے لئے خیال اور گمان کرتی تھی، حالانکہ یہ سب نہ کوئی جھوٹ

کتابیں بھی گر گئی تھیں۔

”بات ہی کچھ ایسی ہے۔“ اس نے پھر سے نوٹس لہرائے تھے، ارسلہ نے اپنی کتابیں اٹھاتے ہوئے طنز یہ کہا۔

”بڑی خوش لگتی ہو؟ کیا خزانہ ہاتھ لگ گیا ہے تمہارے۔“ اس کے طنز پہ ماہ پارہ بے ساختہ مسکرائی تھی۔

”خزانہ ہی سمجھ لو۔“ ماہ پارہ نے اس کا بازو کھینچا اور گراؤنڈ تک لے آئی، چھٹی کا وقت قریب تھا، اب وہ بیرونی گیٹ کی طرف جا رہی تھیں، گیٹ سے باہر نکل کر ماہ پارہ گھر کی طرف جانی سڑک پہ مڑنے کی بجائے مخالف سمت جانے لگی تو ارسلہ نے بے ساختہ پوچھا تھا۔

”کہاں جا رہی ہو؟“ ارسلہ کی آنکھوں میں واضح حیرانی تھی، تب ماہ پارہ نے نوٹس ایک مرتبہ پھر اس کی آنکھوں کے سامنے لہرائے تھے۔

”اس خزانے کو فوٹو اسٹیٹ کروانے، دو کاہیاں کرواؤں گی، ایک تمہاری ایک میری۔“ ماہ پارہ نے مسکرا کر کہا تو ارسلہ بھی بے ساختہ خوش ہو گئی تھی۔

”یہ نوٹس کہاں سے ملے؟“

”تم آم کھاؤ، گٹھلیوں کی طرف دھیان مت دو۔“ ماہ پارہ نے شان بے نیازی دکھائی تھی، ارسلہ بھی مسکرا دی۔

یہ نوٹس یقیناً آمنہ کے تھے، وہ اپنے نوٹس کسی کو نہیں دیتی تھی، بلکہ ہوا تک نہیں لگنے دیتی تھی، جانے ماہ پارہ کیسے اپنی چکنی باتوں میں اسے پھنسا کر نوٹس اڑا لائی تھی۔

”ویسے اس کنجوس نے نوٹس دے دیئے؟“ ارسلہ کو جیسے یقین نہیں آیا تھا۔

”دیئے ہیں، ابھی لے کر آئی ہوں۔“ ماہ پارہ نے مصنوعی کالرا کڑائے تھے۔

”مان گئی ہونا تم مجھے۔“

”کہاں سے کرواؤں گی فوٹو اسٹیٹ؟“ ارسلہ نے باتوں باتوں میں جب دائیں طرف دیکھا تو وہ دوکان بند بھی جس سے یہ سب اپنے کاغذات وغیرہ فوٹو اسٹیٹ کرواتی تھیں۔

”تھوڑا سا آگے جانا ہوگا، سلطان بھائی کے دوست نے نئی دوکان بنائی ہے، ہم وہیں سے نوٹس فوٹو اسٹیٹ کروا لیتے ہیں۔“ ماہ پارہ تیز تیز چل رہی تھی، ارسلہ کو بھی اس کا ساتھ دینا پڑا، اسے بھی نوٹس آج ہی فوٹو اسٹیٹ کروانے کی جلدی تھی، کیونکہ آمنہ کے مزاج کا تو سب کو ہی پتا تھا۔

ماہ پارہ آگے آگے تھی، ارسلہ اس کے پیچھے، پھر ماہ پارہ ایک چھوٹی سی کیبن نما دوکان میں گھس گئی تھی، ماہ پارہ نے مسکرا کر اپنی فائل اور نوٹس وہاں موجود ایک خوش شکل نوجوان کو پکڑا دی تھی، اس نے ماہ پارہ کو دس منٹ کے لئے انتظار کرنے کا کہا تھا، مگر اس کی نگاہ شاپ کے باہر کھڑی ایک گھبرائی گھبرائی سی لڑکی پہ پڑی تھی، اسی پل ارسلہ نے بھی بے ارادہ ہی اسے دیکھا تھا، دونوں کی نظریں ملیں اور بے ساختہ جھک گئی تھیں پھر اسی طرح بے ارادہ ہی دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا، دونوں کے دل یک بارگی دھڑکے اور دھڑکنوں نے جیسے تال بدل لئے تھے، جیسے ایک دم سر بدل لئے تھے۔

یوں لگا باہر سلگتی دھوپ کو ابر باراں نے ڈھک لیا ہو، یا آسمانوں نے زمین پہ سایہ کر لیا ہو، یا تنک ہواؤں نے اپنا رخ بدل لیا ہو، یا گھٹاؤں نے زمین پہ سجدہ کیا ہو، باہر رنگ بدل گئے تھے یا اندر کے موسم پھل رہے تھے۔

یہ لمحوں میں کیسی کا یہ پلٹ تھی؟ ایک ساتھ دھڑکنوں میں کیسا بھونچال آیا تھا، یہ کیسا زلزلہ آیا

تھا، جیسے چناروں کے پارنوید صبح کا اعلان چل رہا ہو، جیسے سرزمین دل پہ گوئی دے قدموں چل رہا ہو، ارسلہ کو لگا وہ لمحوں میں مٹی ہو گئی ہے، وہ اپنے آپ میں نہیں رہی، وہ کسی اور میں ڈھل گئی ہے، اس کا دل اختیار کی ہر حد سے تجاوز کر رہا تھا، ارسلہ کی ہتھیلیاں پسینے سے تر ہوتی تھیں اور اس کا ماتھا احساسات کے اس نئے کھیل کی جذباتی لہر سے نمناک ہو چکا تھا، اس نے خود کو گرنے سے بچانے کے لئے دروازے کا سہارا لیا تھا۔

اور یہی کیفیات زیان احمد کے دل کی دھڑکنوں کو بے ترتیب کر رہی تھیں، وہ بھی اندرونی تبدیلی پہ متعجب اور حیران تھا، آخر دل کی دنیا میں کیا حشر برپا ہوا تھا؟ آخر زیان احمد لمحوں کے اس کھیل میں کیا سے کیا ہو چکا تھا۔

یہ کون تھی جو اک نگاہ بے ارادہ سے اس کا چین سکون اور دل جیسی متاع چرا کر لے گئی تھی؟ اس سے کام کرنا محال تھا، اس سے اپنے قدموں میں گرے کاغذات اٹھانا محال تھا، اس سے جھک کر پھر اٹھنا محال تھا، وہ اپنے بے اختیار ہوتے دل کو اختیار میں کرتا ہوا بمشکل اس فسوں خیز لمحے کی قید سے خود کو چھڑاتا کام میں لگ گیا، دس منٹ بعد نوٹس فوٹو اسٹیٹ ہو چکے تھے، اس نے ماہ پارہ کی طرف نوٹس بڑھائے۔

”آئندہ کچھ بھی فوٹو اسٹیٹ کروانا ہو تو سلطان سے کہنا، خود دوکان پہ مت آنا۔“ یہ ایک واضح تنبیہ تھی، صرف ماہ پارہ کے لئے نہیں، شاید کسی اور کے لئے بھی، ماہ پارہ نے نوٹس کی ایک کاپی ارسلہ کی طرف بڑھا دی تھی، پھر مسکراتے زیان کا شکر یہ ادا کیا۔

”زیان بھائی! آپ کا بہت شکریہ اور سلطان کی تو بات مت کریں، وہ اگلے سال بھی ہمارے نوٹس فوٹو اسٹیٹ بھی نہ کراتا۔“ زیان

اس کی بات سمجھ کر سر ہلا گیا۔
ارسلہ ان دونوں کی گفتگو سے بے نیاز سامنے دیوار پہ چسپاں موبائل نمبر کو دیکھ رہی تھی، جیسے گاہکوں کی سہولت کے لئے چسپاں کیا گیا تھا، ارسلہ نے اس نمبر کو اتنی مرتبہ دیکھا کہ زہن میں نقش ہو گیا، ایک ایک ہندسہ دماغ کی سلیٹ پہ کھنڈ گیا تھا، وہ نمبر جو زیان احمد کا تھا، جو دیوار پہ چسپاں تھا، اب ارسلہ فاروق کے دل کی دیواروں پہ جگہ جگہ لکھا جا چکا تھا۔

آخر یہ کیوں ہوا تھا؟ آخر ایسا کیوں ہوا تھا؟ یہ ایک ایسا سوال تھا جس کا جواب فی الحال کسی کے پاس بھی نہیں تھا سوائے آنے والے وقت کے۔

☆☆☆

اس نے کہیں پڑھا تھا، جو راستوں کے عشق میں گرفتار ہو جاتے ہیں، منزلیں ان سے دور ہو جاتی ہیں اور وہ یعنی ارسلہ فاروق، رستوں کے عشق میں نہیں، منزلوں کے عشق میں گرفتار ہونا چاہتی تھی، یہ اس کی نادانی اور کم فہمی کے سوا کیا تھا؟ کیا رستوں پہ چلے بغیر منزل کا حصول ممکن تھا؟ اور رستہ چاہے پھولوں کا ہی کیوں نہ ہو، پیدل چلنے والوں کو تھکا ڈالتا ہے اور اس نے تو پیدل چلنے کا ہی نہیں، اندھا دھند چلنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

پھر محبت کب سوچ اور سمجھ بوجھ کی وادیوں میں پڑاؤ ڈالنے دیتی ہے، یہ تو عقل اور فہم کو دھتکار کر اپنی من مانی کرتی ہے، منہ زور ہوتی ہے، اپنی مرضی کرتی ہے، سرکش ہوتی ہے، چڑھ چڑھ کے آتی ہے، اس نے اپنے اندر پنپنے والے تذبذب کو دھیرے دھیرے اکھاڑ پھینکا تھا، تذبذب وہ مقام تھا، جہاں آگے جانے کی ہمت نہیں تھی اور واپس جانا بھی ممکن نہیں تھا، وہ آگے

بڑھتی یا پیچھے ہٹتی؟

گلابی دوپہر کی ایک نظر نے دل کی دنیا میں
آگ سلگا دی تھی، وہ آگ کی پیش نے دل مضطر کو
ابھی تک بے چین کر رکھا تھا۔
وہ کیا کرتی؟ کیسے کرتی؟

اس ایک نظر کو لوٹا کر واپس کیسے لاتی؟ اس
آواز کا سحر کیسے اتارتی؟ جس کا فسوں سر چڑھ کر
بولتا تھا، کون تھا جو اس معاملے میں ارسال کی
اعانت کرتا؟ طلب کرتی؟ جو ارسال کو مژدہ سناٹا
اور نیا لے رنگوں کے سارے مکڑی جیسے اندیشوں
کا جال ٹوٹ جاتا، کیا اسے ماہ پارہ کو اپنے دل پہ
ہونے والی واردات کی خبر دینی چاہیے تھی؟ کیا
اسے ماہ پارہ کو بتانا چاہیے تھا؟ کیا اسے ماہ پارہ
کے گھر جانا چاہیے تھا؟

اس کے لئے امی سے اجازت کیسے ملتی؟
پہلے ماہ پارہ کے گھر اس کی والدہ ہوتی تھیں، اب
بھائی بھی آگیا تھا جو لندن پڑھنے گیا ہوا تھا، جب
اسے اس کا بھائی سلطان واپس آیا تھا تب سے تو
ارسلہ بالکل بھی اس کے گھر نہیں جا رہی تھی، امی کو
پسند نہیں تھا، وہ ارسال پہ کم از کم اس حوالے سے
کافی روک ٹوک رکھتی تھیں۔

جب اسے کوئی چارہ کار نظر نہ آیا تو اس نے
اپنے موبائل سے ماہ پارہ کو کال کی، یہ موبائل بھی
ابو نے حال ہی میں لے کر دیا تھا، کیونکہ ایک دو
مرتبہ کالج سے آتے ہوئے ایسی صورت حال بنی
کہ ارسال کو گھر اطلاع دینے میں بڑی دقت کا
سامنا ہوا تھا، تب ابو نے اسے موبائل لے دیا
تھا۔

وہ لاؤنج سے اٹھ کر اوپر اپنے کمرے میں آ
گئی تھی، پھر اس نے محتاط انداز میں ماہ پارہ کا نمبر
ملایا، کافی دیر تیل جاتی رہی تھی مگر کسی نے کال
یک نہیں کی، ارسال بار بار ٹرائی کر رہی تھی، معاً

کسی نے فون اٹھا کر ہیلو کہا تو ارسال نے جلدی
سے کال کاٹ دی، شاید دوسری طرف ماہ پارہ کا
بھائی تھا۔

وہ موبائل گود میں رکھے بے دلی سے بیٹھ گئی
تھی تب اچانک اس کا فون بجنے لگا، ارسال نے
چونک کر اسکرین دیکھی۔

”ماہ پارہ کالنگ۔“ لکھا آ رہا تھا، کیا ماہ پارہ
کال کر رہی تھی؟ یا اس کا بھائی؟ ارسال کچھ گھبرا سی
گئی تھی، پھر اس نے ڈرتے ڈرتے کال ریسپونڈ
تو دوسری طرف ماہ پارہ ہی تھی، ارسال کی جان میں
جان آ گئی تھی۔

”تم آ سکتی ہو پارہ؟“ ارسال نے چھوٹے
ہی پوچھا تھا، پارہ کچھ حیران ہوئی۔
”کہاں؟“

”میرے گھر۔“ اس کی آواز مدہم تھی، پارہ
اس کے لہجے میں چھپی بے قراری کو سمجھے بغیر
بولی۔

”تمہارے گھر میں نیاز بٹ رہی ہے
کیا؟“ اس کا انداز شرارتی سا تھا۔
”بکو نہیں، پہلے کیا نیاز لینے آتی ہوں؟“
ارسلہ نے خفگی سے کہا۔

”نہیں، تمہارا دماغ کھانے۔“ وہ کھلکھلائی
تھی۔

”تو اب بھی میرا دماغ حاضر ہے، تم
کھانے کے لئے آ جاؤ۔“ ارسال کا انداز منت بھرا
تھا۔

”دیکھ لو پھر، چھوڑ دوں گی نہیں۔“ اس نے
وارنگ دی تھی، ارسال کو اور کیا چاہیے تھا، اس کے
بلانے پہ یارو ہمیشہ ایسے ہی آ جاتی تھی، بھی انکار
نہیں کرتی تھی۔

”اچھا..... رکو بیس منٹ تک آتی ہوں،
سلطان کے کپڑے پر لیس کر لوں، اسے زیاں

بھائی کے ابو کے چالیسویں پہ جانا ہے۔ ”پارو کے بتانے پہ ارسلہ کا دل یک بارگی بہت زور سے دھڑکا تھا، زیان کا نام ہی اس کا فشار خون بڑھانے کے لئے کافی تھا، وہ لمحہ بھر کے لئے اپنے حواسوں میں نہیں رہی تھی، اس کا دل بار بار ڈوب ڈوب کر ابھرتا رہا تھا، وہ کھڑے سے اچانک بیٹھ گئی تھی، پھر اس نے بڑی دقت کے ساتھ سوکھے ہونٹوں پہ زبان پھیر کر زیان کا نام لینا چاہا تھا۔

”کک..... کیا ہوا ان کو، مطلب زیان کے ابو کو؟“ اس کا لہجہ ردائی سے قاصر تھا، الفاظ بھی بمشکل لبوں سے برآمد ہوئے تھے۔

”بے چارے بہت عرصے سے بیمار تھے، تبھی تو زیان بھائی نے تعلیم بھی ادھوری چھوڑ دی تھی، چھوٹی موٹی نوکریاں کرتے رہے، پھر فوٹو اسٹیٹ کی دوکان بنالی، ان کے ابو کی ڈیجیٹل ہوگی ہے اور اب امی بیمار ہیں، بے چارے کی پریشانیاں ہی ختم نہیں ہوتیں۔“ پارو کے تفصیلاً بتانے پہ ارسلہ کا دل زیان کے لئے دکھ اور ہمدردی سے لبالب بھر گیا تھا، اس کی آنکھوں کے فرش گیلے ہوتے چلے گئے تھے اور اسے پتا بھی نہیں چلا تھا۔

”بہت افسوس ہوا۔“ ارسلہ نے بمشکل کہا تھا۔

”ہاں یار! بے چارے کی زندگی خاصی کٹھن ہے، اتنی محنت کرتا ہے، پہلے باپ کے لئے، اب ماں کے لئے، ان کا اکلوتا بیٹا جو ہے، گھر بھی اپنا نہیں، سلطان کا بہت اچھا دوست ہے، سمجھو بچپن کا۔“ پارو نے مزید بھی بتایا تھا۔

”اچھا، اب فون رکھتی ہوں، سلطان کو کپڑے پر لیس کر کے دینے ہیں۔“ اسے اچانک گزرتے وقت کا احساس ہوا تو فون بند کر دیا اور

ارسلہ کتنی ہی دیر تک گم صم سی موبائل گود میں رکھے بیٹھی رہی تھی۔

اس کے دل و دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں، دل تھا کہ اڑاڑ کر اسے دیکھنے اور اس کا درد، دکھ، کرب بانٹنے کو بے تاب تھا، وہ کیسے زیان تک جائے؟ وہ کس طرح اس دیکھے؟ کیسے اس کی آواز سنے؟ اس دوکان کی دیوار پہ چسپاں زیان کا نمبر اس کے ذہن کی اسکرین پہ روشن تھا۔ کیا وہ زیان کو کال کرے؟ گم از کم اس کی آواز تو سن لے، اس میں حرج کیا؟ بات کرنے میں گناہ کیا؟ وہ خود کو بودی دلیلیں دے رہی تھی، جس سے اس کا اپنا دل بھی مطمئن نہیں ہو پا رہا تھا، بات کرنے میں جو تباہی یا گناہ تھا اس سے ارسلہ ناواقف نہیں تھی، پھر بھی دل مضطرب کی ضد کے سامنے بے بس ہوتی چلی گئی اور یہ دل تو بس ایسے ہی رسوا کرنے پہ تل جاتا تھا اور اپنی کرنی پہ آتا تو کسی قسم کے نقصان کو کسی خاطر میں نہیں لاتا تھا۔

پھر ارسلہ اپنی ہر دلیل کے سامنے لاچار ہو گئی، امی اور ابو کا خوف پس و پیشت چلا گیا تھا، بھائیوں کا ڈر بھی جاتا رہا، دل سرکشی کسی جواز کو سمجھنے کے لئے تیار نہ تھا، کسی دلیل کو ماننا تک نہیں تھا، اسے بے بسی کی انتہا تک لے آیا تھا، یہ غلط تھا یا ٹھیک تھا؟ جو بھی تھا، وہ کر رہی تھی، اسے کرنا ہی تھا، زیان تک جانا ہی تھا، زیان کو اس تک آنا ہی تھا، کیونکہ ارسلہ فاروق کو زیان احمد سے محبت ہو گئی تھی اور کیا زیان احمد کو بھی ارسلہ فاروق سے محبت ہو گئی تھی؟ اس کا جواب نہ جانے کس کے پاس تھا۔

☆☆☆

ایک اور گلابی دن نکلا اور ڈھل گیا۔

ہر دن اپنے ہی انداز میں طلوع ہوتا تھا،

چڑھتا تھا، بکھرتا تھا اور ڈھل جاتا تھا، زندگی ایک ہی دائرے میں مقید تھی، زندگی ایک ہی مدار میں گھوم رہی تھی۔

اپنے دائرہ کار سے نہ کبھی زندگی نے نکلنے دیا تھا اور نہ زیان نے ایسی کبھی کوشش کی تھی، وہ ایک ہی مدار میں آج تک گردش کر رہا تھا۔

ایک کٹھن اور دشوار زندگی کا ہر دن اس کے انتظار میں گھات لگائے بیٹھا تھا، وہ اس پر مشقت زندگی سے نالاں بھی نہیں تھا، اسے اپنے حالات میں جینا آتا تھا، اسے حالات سے نکل کر بکھر جانے کی تمنا نہیں تھی، وہ جانتا تھا، وہ ایک معمولی مزدور کا بیٹا ہے، اس کا باپ ایک محنت کش انسان تھا اور وہ ان کا اکلوتا لخت جگر تھا، سو باپ کی بیماری سے لے کر باپ کی وفات تک وہ اتنا ہی سخت جان اور مضبوط رہا، حالات جیسے بھی ہوتے وہ گھبراتا نہیں تھا، اسے گھبرانے کی، دل چرانے کی اور ہمت چھوڑ دینے کی حالات نے تربیت نہیں دی تھی، اسے ہر کٹھن دور سے گزر کر بھی اپنے حال میں رہنا ہے۔

زندگی جس قدر بھی جھٹکے دیتی یا کھونچیں مارتی بہر حال اسے ہر وار کا مقابلہ کرنا آتا تھا، ابا کی بیماری میں اس کی تعلیم ادھوری رہ گئی تھی، یہ اس کی زندگی کا پہلا خواب تھا جو ٹوٹ گیا، تعلیم جو اس کی زندگی بدل سکتی تھی، حالات بدل سکتی تھی، ایک ٹوٹے خواب کی طرح کرچی کرچی ہو کر بکھر گئی تھی۔

ابا کی بیماری نے اسے محنت کی عادت ڈال دی تھی، وہ ہر کسی کا کام کر دیتا، ہر طرح کی مزدوری کر لیتا، گھر کا چولہا اور ابا کی دوائیوں کا سلسلہ چلتا رہا، اس کی محنت رنگ لاتی گئی، تھوڑے تھوڑے پیسے جمع کر کے اس نے کچھ قرض بھی لیا اور نوٹو اسٹیٹ مشین خرید لی۔

اب یہ تھا کہ چھوٹی موٹی مزدوری سے جان چھوٹ گئی تھی، اس کا اپنا کام تھا، سو تھوڑی سی محنت کے بعد چل پڑا تھا، اسے ایک کالج کے پاس چھوٹی سی دوکان بھی کرائے پہ مل گئی تھی اور یہ انہی دنوں کا ایک قصہ تھا۔

گلابی دن جس کی چھب ہی نرالی تھی، جو ایک نئے انداز میں طلوع ہوا تھا، شاید یہ دن کسی نئے انداز میں طلوع نہیں ہوا تھا، بس زیان کو ایسا لگ رہا تھا، کیونکہ اس دن میں ایک خاص بات تھی، وہ خاص بات کیا تھی؟ کیا اس دن آسمان سے گل سوسن کی برسات ہوئی تھی؟ کیا گل رعنا اپنی رعنائیوں کے ساتھ اندر اور باہر سے سرخ ہو گیا تھا؟

کیا گل دوپہر، دوپہر کی بجائے شام کو کھلنے لگا تھا؟ کیا گل چاندنی اب اندھیرے میں بکھرنے لگا تھا؟ آخر اس دن ہوا کیا تھا؟

زیان کے دل کی دھڑکنوں میں کیسا بھونچال آیا تھا، اس کے ساتھ ہوا کیا تھا، دل پہلی نگاہ میں گھائل کیسے ہوا؟ دل اتنا بے چین مضطرب اور پاگل کیوں ہوا؟ کتنے ہی دن اسے خود کو یقین دلانے میں گزر گئے تھے، وہ اتنا کھویا کھویا اور بے چین تھا کہ اس کا دوست سلطان تک ٹھنک گیا، وہ اس کا اچھا دوست تھا، زیان اس سے ہر بات کر لیتا تھا، لیکن اس بات کو وہ اپنے دل میں ایک راز کی طرح چھپا گیا تھا۔

وہ کیسے کس طرح اور کیوں عیاں کر دیتا؟ وہ لڑکی جس سے ایک نظر کی محبت ہوئی تھی، اس کی عزت زیان کو اپنی زندگی سے بہر حال زیادہ عزیز تھی۔

اس کے انداز و بیان میں اگر کچھ تبدیلی آئی ہی تھی تو اس محبت کی بدولت سے آئی تھی، یہ سارا اس محبت کا اعجاز تھا، جو یک طرفہ تو نہیں لگتی تھی،

اگر ایک طرف ہوتی تو دل اتنا دیوانہ، پاگل اور مضطرب نہ ہوتا، اسے دیکھنے کے لئے اس قدر نہ مچلتا، اسے دیکھنے کے لئے اتنا نہ تڑپتا، یہ دل اپنے اختیار کی ہر حد کو توڑ کر لپک لپک کر ان راہوں کی طرف جانا چاہتا تھا جو ارسلہ فاروق کے گھر کی طرف جاتی تھیں، یا جن راہوں پہ چل کر وہ اپنی درسگاہ کی طرف آتی تھی۔

کیا زیان احمد کی محبت کو گوارا تھا، وہ کسی سڑک چھاپ عاشق کی طرح اسے لوگوں کی نگاہوں میں گرانے کی خاطر کالج کی حدود میں جا کھڑا ہوتا؟

وہ چاہتا تو ایسا کر سکتا تھا، وہ چاہتا تو اپنے سکون قلب کی خاطر آنکھوں کو ٹھنڈا کرنے کے لئے دور سے ہی سہی، اسے ایک نظر دیکھ آتا، لیکن اسے ارسلہ کی عزت کا پاس تھا، اسے اپنی پاکیزہ محبت کا پاس تھا، اسے شہر محبت میں بکھرے ہر رستے پہ چلنے کا قرینہ آتا تھا، اسے محبت برتنے اور سمجھنے کا قرینہ آتا تھا، اسے محبت کو اوڑھ کر چلنے کا سلیقہ آتا تھا، اسے محبت میں احترام کی حد کو لاگو کرنے کا طریقہ آتا تھا۔

وہ دل جو اپنا نہیں رہا تھا کسی اور کا ہو گیا تھا، اس دل کو ضبط کے پل صراط سے گزار کر ضبط عشق کے مرحلوں میں لانا تھا، اسے ارسلہ فاروق کے شہر دل کی گلیوں میں بے دھڑک نہیں جانا تھا، لیکن ہوا کیا؟ کچھ عجیب، بڑا انوکھا اور حیران کن۔

اس دن وہ گھر تھا، ابا کے چالیسویں کا ختم ہو گیا، مہمان اپنے گھروں کو لوٹ چکے تھے، وہ سارے دن کی بھاگ دوڑ سے تھک چکا تھا، اماں کو گرم دودھ اور دوائی دے کر اپنے بستر پہ آیا تو اس کا موبائل بج رہا تھا، کچھ اس طرح کہ ایک بیل دے کر کال کاٹ دی جاتی تھی، گویا کرنے

والا فون کرنے کی ہمت نہیں رکھتا تھا، یا پھر کوئی اور وجہ تھی؟ نمبر انجانا تھا، غیر شناسا تھا، زیان کچھ سوچ میں پڑ گیا تھا، کیا بیک رنگ کرے یا نہیں؟ جانے کون تھا؟ کیوں بار بار کرتا اور پھر کال ڈسکلیٹ کر دیتا تھا، کچھ سوچ کر زیان نے کال کی، لیکن اس کی کال پک نہیں کی گئی تھی، وہ بار بار کرتا رہا، ہر دفعہ کال کاٹ دی جاتی تھی، ایسا کیوں ہو رہا تھا؟ کون تھا جو ایسا کر رہا تھا؟ آخر یہ کس کا نمبر تھا؟

وہ بہت دیر سوچتا رہا تھا اور پھر لمحہ بھر کے لئے بھونچکا رہ گیا، اس کا دل لحظہ بھر کے لئے رکا اور پھر زور زور سے دھڑکنے لگا، اچانک دل کی یہ بے ترتیبی اس کا تنفس تیز کر رہی تھی، ایسا کیوں تھا؟ ایسا کیوں ہوا تھا؟ وہ نمبر دیکھتا اور اس کا دل جیسے گواہی دینے لگا۔

”یہ وہی ہے، ارسلہ..... ہاں یہ ارسلہ ہے، ماہ پارہ کی بیٹی۔“ زیان زیر لب بڑبڑایا تھا، ماہ پارہ کی زبانی وہ ارسلہ کا نام تو جان گیا تھا اور اس وقت زیان کا دل چیخ چیخ کر تصدیق کر رہا تھا، اس نے ماتھے پہ ابھرتا پسینہ صاف کیا اور دھڑکتے دل کے ساتھ میسج ٹائپ کیا، اسے امید تھی میسج کا Reply ضرور آئے گا، وہ کال پہ بات کرنے کی ہمت نہیں رکھتی تھی، لیکن میسج پہ ضرور بات کرتی۔

”میں جانتا ہوں، آپ کون ہیں؟“ اس نے میسج ٹائپ کر کے سینڈ کر دیا تھا، اس کی توقع کے عین مطابق کچھ دیر بعد جواب آ گیا تھا۔

”پھر بتاؤ، میں کون ہوں؟“ جواب اس کی سوچ کے برعکس تھا، زیان کو کچھ دیر تک سوچنا پڑا، وہ کیا جواب لکھے؟ جو ارسلہ کو چونکا دے، اسے حیران کر دے۔

”اگر بتا دوں تو کیا انعام دوگی؟“ زیان کا بکھرتا اعتماد بحال ہو گیا تھا، اس کے ماتھے کا پسینہ

بھی خشک ہو گیا، یہ ارسلہ ہی تھی، اس کا دل تھا، گواہی دینے کے لئے، اس کی دھڑکنوں کا شور مچا رہا تھا، اس سے بات کرنے والی ارسلہ ہی تھی، کوئی اور ہرگز نہیں۔

ارسلہ کا جواب ایسا حیران کن، متعجب اور پاگل کر دینے والا تھا کہ زیان لمحہ بھر کے لئے ساکت رہ گیا، وہ تو ارسلہ کو چونکا چاہتا تھا اور ارسلہ نے زیان کو چونکا نہیں بلکہ ٹھنکا دیا تھا۔

”انعام دوں گی، ضرور دوں گی۔“ دوسری طرف سے جواب آیا۔

”کیسا انعام؟“ زیان نے بے تابی سے لکھا تھا، اسے جواب جاننے کی جلدی تھی۔

”اپنا دل دوں گی، کیا لو گے؟ خریدار بنو گے؟“ اس کا اگلا میسج زیان کو پوری جان سے ہلا دینے کے لئے کافی تھا، وہ ہکا بکا رہ گیا، دم بخود رہ گیا، بہت دیر تک اس سے کچھ لکھا نہیں گیا تھا، پھر اس نے بڑی ہمت کے ساتھ کوشش کی تھی۔

”دل تو دیتے ہیں، بیچتے نہیں، انعام میں دوں گی، پھر خریداری کا کیا سوال؟“ وہ اسے اپنی بات میں الجھا کر اس کے دل کی گہرائی میں اتری محبت کو ماپنا چاہتا تھا، وہ محبت جو بغیر کہے سے بھی ان دونوں کو اسیر کر چکی تھی، وہ محبت جو واضح سچائی کے ساتھ دونوں کے دلوں میں روشن تھی، یوں کہ ہر سوا جالا بکھر رہا تھا۔

”تو پھر کیا دل کا نذرانہ لو گے؟“ اس کا جواب آیا، زیان کی سانس سانس الجھ گئی، اس نے کئی لمحے جواب بڑھنے میں صرف کر دیئے تھے، پھر زیان نے میسج لکھا۔

”اتنے پیارے نذرانے پہ کون کا فرما کر سکتا ہے؟“

”تو پھر میں کیا سمجھوں؟“ ایک اور دل دھڑکا دینے والا سوال آیا تھا، زیان لکھتا رہا،

پڑھتا رہا، دیکھتا رہا، سوچتا رہا، بے خود ہوتا رہا، بے بس ہوتا رہا۔

پھر اس نے دل کی ہر سچائی کے ساتھ بڑے سچے جذبوں کی مالا میں ایک ایک موتی پر دکر میسج لکھ دیا۔

”یہی کہ راہ محبت میں ارسلہ فاروق میرے ہم قدم ہے، میں اکیلا نہیں۔“ دوسری طرف میسج پڑھ کے ارسلہ پہ بھی مژدہ جاں فزا کا جیسے نزول ہو گیا تھا۔

☆☆☆

دونوں عشق کے خمار میں ڈوب گئے تھے، ہر اجلا دن خمار میں لپٹا طلوع ہوتا تھا، سورج پہ بھی خماری چڑھی تھی اور دھوپ بھی خمار آلود تھی۔ رات بھی خمار سے خالی نہیں تھی، لبالب بھری ہوئی، یوں لگتا، ہر چلتی شے پہ نشہ چڑھ گیا ہے، ہر چیز بدست دکھائی دیتی تھی یا پھر یہ ارسلہ کی نگاہ کا اثر تھا، زندگی میں یوں لگتا تھا جیسے رنگ و بو کا سیلاب اتر آیا ہے۔

اب کتابوں میں دل نہیں لگتا تھا، کتابوں میں لکھے لفظ اجنبی سے لگتے تھے، ہر سبق میں محبت کا چہرہ دکھائی دیتا تھا، ہر لفظ میں محبت کی خوشبو ابھرتی تھی، جو رنگ و جاں کو معطر کر ڈالتی۔

پھر یوں ہوا کہ یہ محبت کی مشک پارہ تک بھی چلی گئی، ارسلہ نے لاکھ پہلو بچانا چاہا تھا لیکن پارہ سے کچھ بھی چھپانا محال تھا، اسے ارسلہ کے اندر کی خبر ہو گئی اور وہ ارسلہ سے ہوتی ہوئی زیان تک بھی چلی گئی، اسے پتا چل گیا تھا کہ ارسلہ اور زیان کے درمیان محبت کا تعلق ایک زنجیر کی طرح موجود تھا، ایک تناور درخت اپنی جڑیں مضبوط کر رہا تھا، ماہ پارہ کے لئے اس میں حیرانگی کے کئی پہلو تھے، اس نے پہلی مرتبہ ہی ارسلہ کو سمجھانا چاہا تھا۔

”تم جانتی ہو ارسلہ؟ زیان اور تمہارے اسٹینس میں زمین آسمان کا فرق ہے، محبت کرنی تھی تو سوچ سمجھ کر کرتی۔“ ماہ پارہ نے جیسے اپنا سر پکڑ لیا تھا۔

”محبت سوچ سمجھ کر نہیں ہوتی، بس یہ ہو جاتی ہے۔“ ارسلہ بے بس تھی اور پارہ اسے خفا نگاہوں سے دیکھتی رہی۔

”یہ کیا پاگل پن ہے ارسلہ! تم کیا اس محبت کے نتائج نہیں جانتی؟“ اس کا انداز خفگی سے پر تھا۔

”نتائج کی پرواہ کون کرتا ہے؟“ وہ پرسوز لہجے میں بول رہی تھی۔

”یا گل مت بنو، خود کو اسی مقام پہ روک لو، تم جانتی نہیں، زیان تمہارے قابل نہیں ہے۔“ پارہ نے چڑتے ہوئے کہا تھا۔

”تو کیا ہوا؟ اس کے پاس پیسہ نہیں، پیسہ سب کچھ نہیں ہوتا اور وہ بہت تختی ہے، مجھے یقین ہے بہت ترقی کرے گا۔“ ارسلہ کا انداز پر یقین تھا۔

”لیکن ابھی تو اس کے پاس کچھ بھی نہیں، تمہیں دینے کے لئے کچھ بھی نہیں۔“ پارہ اسے زندہ حقیقتوں کی طرف توجہ دلانے کی کوشش کر رہی تھی، لیکن ارسلہ کو مادی چیزوں کی پرواہ کہاں تھی؟ ”اس کے پاس مجھے دینے کے لئے محبت کے خزانے موجود ہیں، مجھے اس کے علاوہ کچھ اور نہیں چاہیے۔“ ارسلہ پہ ایک دھن سوار تھی۔

”محبت سے پیٹ نہیں بھرتا۔“ پارہ نے تلخی سے جتایا تھا۔

”یہ تم نے ٹھیک کہا، لیکن دوست زندہ رہنے کے لئے جن چیزوں کی یا جتنی خوراک کی ضرورت ہوگی، اتنی زیان ضرور مہیا کر دے گا۔“ ارسلہ کی قناعت کا کوئی انت نہیں تھا، پارہ ہکا بکا

اسے دیکھتی رہی۔

”ارسلہ! تم پچھتاؤ گی، اپنے بڑھتے قدموں کو یہیں روک لو۔“ کچھ دیر بعد پارہ نے پھر سے سمجھانا چاہا تھا۔

”اگر پچھتاوا قسمت میں لکھا ہے تو کیا کوئی قسمت کا لکھا مٹا سکتا ہے؟“ ارسلہ کا انداز پر سکون تھا، جیسے وہ ہر پہلو پہ غور کر چکی تھی، اب اسے کسی کے سمجھانے بجھانے کی ضرورت نہیں تھی، وہ فائدے اور نقصان سے بے نیاز ہو چکی تھی، یہ زیان کی محبت کا اثر تھا، یا محبت کی طاقت کا اثر، ارسلہ کو جیسے کسی بات کی پرواہ نہیں تھی۔

”تم سوچ لو، اس کا انجام اچھا نہیں ہوگا، تمہارے گھر والے نہیں مانیں گے۔“ اس کے لہجے میں واضح تنبیہ تھی، وہ اسے آنے والے مشکل حالات کے لئے تیار کر رہی تھی یا اسے سمجھا رہی تھی۔

”سب لوگ مان جائیں گے۔“ اس کا اعتماد قابل دید تھا۔

”مجھے یقین نہیں۔“ پارہ نے صاف صاف کہا۔

”تم دیکھ لینا۔“ ارسلہ کے لبوں پہ یقین مسکان بن کر پھیل رہا تھا، پارہ اسے دیکھتی رہ گئی۔

”میں نہیں مانتی، یہ ممکن ہی نہیں۔“ پارہ اس کے الفاظ پہ پہلی مرتبہ ارسلہ کو بہت برا لگا، اس کے دل میں ہال سا آ گیا تھا، یہ اس کی کیسی دوست تھی، کوئی امید دلائے بغیر یا یوسی کا زہر گھول رہی تھی، کیا یہ اس کی دوست تھی؟ ارسلہ کو بہت دکھ ہوا، نہ کوئی تسلی نہ کوئی دلاسا، بس ہراساں کر رہی تھی۔

”تم دعا تو کر سکتی ہوتا؟“ ارسلہ نے التجائیہ انداز میں بہت لجاجت سے کہا تھا، ماہ پارہ نے

یہاں بھی جھنڈی دکھا دی تھی، اس کا لہجہ بڑا دو ٹوک اور روکھا قسم کا تھا۔

”جس دعا کی قبولیت کا یقین نہ ہو، اس کے لئے تردد کیوں کروں؟“ ماہ پارہ کے الفاظ ارسلہ کو دم بخود کرنے کے لئے کافی تھے، وہ ہکا بکا سی اس کی صورت دیکھتی رہ گئی تھی، وہ اسے بتانا چاہتی تھی کہ دعائیں تو تقدیر کے رخ موڑ دیتی ہیں، دعائی تو قسمت بدل دیتی ہیں، دعائیں تو آسمانوں کو ہلا دیتی ہیں، لیکن وہ کچھ بھی نہیں کہہ سکی، وہ خاموش ہو گئی، وہ جان گئی تھی کہ فی الحال خاموشی ہی بہتر ہے، فیصلہ آنے والا وقت خود ہی کر دے گا۔

☆☆☆

موسم بہار کے آتے ہی درختوں پہ شگوفے پھوٹ پڑے تھے، بلبلیں باغوں میں چہکتی تھیں اور گلابوں پہ رونق کا سماں تھا، باہر بھی موسم بہار تھا تو ارسلہ کے اندر بھی بہار رتوں کے گلاب کھلے تھے۔

ان دنوں اس پہ حسن کا ہن برس رہا تھا، وہ کسی تتلی کی مانند اڑتی پھرتی، اس کے حسن کی فراوانی امی کو کئی مرتبہ اس کی نظر اتارنے پہ مجبور کر دیتی تھی۔

وہ اندر ہی اندر سہم رہی تھیں، ارسلہ کا حسن دکشی اور تابناکی انہیں کئی طرح سے وہموں میں ڈالتی تھی، وہ اسے دعاؤں کے حصار میں کالج پڑھنے کے لئے بھیجتیں، اس کے آنے تک دروازے اور سڑک کے پھیرے لگاتیں اور جب وہ آ جاتی تو سکون کا سانس لیتیں۔

اس دن بھی کالج سے آ کر ارسلہ نے یونیفارم بدلا اور کھانا بمشکل زہر مار کر کے اپنے کمرے کی طرف بھاگ گئی تھی، پیچھے سے امی آوازیں دیتی رہ گئی تھیں۔

”گندایونیفارم میشن میں ڈال دو، اپنی کتابیں تو سنبھالتی، جانے اس لڑکی کو کیا ہو گیا ہے، کوئی بات سنتی ہی نہیں۔“ امی بڑبڑاتی ہوئی اس کی چیزیں سمیٹ رہی تھیں۔

ارسلہ نے کمرے میں آ کر دروازہ لاک کیا تھا، پھر موبائل نکال کر زیان کا نمبر ملایا، وہ کبھی بھی زیان سے باہر نہیں ملی تھی، نہ زیان ایسی خواہش رکھتا تھا، وہ خود بڑا محتاط تھا، اسے بھی محتاط رہنے پہ مجبور کرتا، ارسلہ فطرتاً لا پرواہ تھی، وہ چھوٹی چھوٹی نزاکتوں کو نہیں سمجھتی تھی۔

زیان کبھی بھی اس کے راستے میں کھڑا نہیں ہوا تھا اور نہ وہ ارسلہ کو فورس کرتا تھا کہ فوٹو اسٹیٹ کروانے کے یہاں دوکان پہ آئے، اس نے ارسلہ کو سختی سے منع کر رکھا تھا کہ وہ دوکان پہ انتہائی ضرورت کے تحت بھی نہ آئے۔

یوں زیان کو دیکھنے اور ملنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا، بس فون پہ بات ہو جاتی تھی، یا پھر میسجز کے ذریعے رابطہ قائم تھا۔

اور اس وقت ارسلہ اسے دن بھر کی دوداد سنا رہی تھی، اپنی محبت اور دیوانگی کی باتیں، جواباً وہ بھی اپنی چاہت کا برملا اظہار کرتا تھا، تاہم وہ ارسلہ کی طرح جذباتی نہیں تھا، زیان کی شخصیت میں ٹھہراؤ تھا اور ارسلہ کے اندر عجلت پسندی کوٹ کوٹ کر بھری تھی، وہ ہر کال کے اختتام پہ زیان سے ایک ہی بات کہتی۔

”تم اپنی اماں کو کب بھیجو گے؟“ ارسلہ پہ ایک ہی دھن سوار تھی، وہ چاہتی تھی زیان کی اماں باقاعدہ پرپوزل لے کر آئیں، زیان اسے ٹالتا نہیں تھا، اپنی مجبوریاں ضرور بتاتا۔

”اماں شدید بیمار ہیں ارسلہ، وہ ابھی آ نہیں سکتیں، وہ آ بھی جائیں تو میں اتنا فنانشلی اسٹرونگ نہیں ہوں کہ تمہارے ابو اور بھائی

میرے پر پوزل پر غور کریں، تم ان نزاکتوں کو کیوں نہیں سمجھتی۔“ وہ اسے ملائمت سے سمجھاتا تھا، نرمی سے اپنے حالات کی طرف اس کی توجہ دلاتا، لیکن وہ بھی تو ارسلہ تھی، کسی مجبوری کو خاطر میں نہیں لاتی تھی، اس کی کوئی بات نہیں سمجھتی تھی۔

”حالات اتنی جلدی کیسے ٹھیک ہوں گے؟ تب تک ابو میرے لئے کسی بھی پر پوزل کو فائل کر دیں گے، آج کل دو تین پوزلز زیر غور ہیں۔“ ارسلہ اسے اپنی مجبوری بتاتی تھی۔

”میں کوشش کر رہا ہوں، دوہی جانے کے لئے، دعا کرو، میرا ویزہ لگ جائے، پھر سال ڈیڑھ سال تک کچھ نہ کچھ حالات بہتر ہو جائیں گے، تب تک تمہاری تعلیم بھی مکمل ہو جائے گی۔“

زیان نرمی اور محبت سے اسے امید دلاتا تھا۔

”اور اگر ادھر سب کچھ بکھو گیا، ہماری توقع کے مطابق نہ ہوا؟“ ارسلہ جڑ گئی تھی۔

”کم از کم دو سال تک تو تمہاری شادی ممکن نہیں، جب تک تمہارا گریجویشن نہیں ہو جاتا۔“

زیان پر امید تھا۔

تب تک وہ خود کو اتنا اسردنگ کر لیتا کہ ارسلہ کا رشتہ مانگتے ہوئے اسے کوئی بھی کمپلیکس نہ ہوتا، پھر ابھی تو وہ پر پوزل لے کر آنے کی پوزیشن میں نہیں تھا، ارسلہ جانے کس جہان میں رہتی تھی، اسے اندازہ ہی نہیں تھا، ان کا ملن اتنا آسان نہیں ہے، بیچ میں اسٹینس کی اونچی فصیل کھڑی تھی، جس کو پاشانی الحال زیان کے بس میں نہیں تھا، اس کا پر پوزل تو بغیر بچا رکھے، سوچے اسی وقت رتبیکٹ کر دیا جاتا تھا، آخر اس کے پاس ارسلہ کو دینے کے لئے کیا تھا؟

بھوک، افلاس، غربت، تنگی، بھلا ایسی صورت حال میں اسے کون ارسلہ کا رشتہ دیتا؟ ہر گز نہیں، وہ خوابوں میں نہیں جیتا تھا، حقیقت کی

دنیا میں رہتا تھا، اسے اندازہ تھا، ارسلہ کے حصول کی خاطر آگ کا دریا پار کرنا تھا، بڑے کنٹینر مراحل سے گزرتا تھا اور خود کو ارسلہ کے معیار تک لانا تھا، اس کے لئے محنت بھی چاہیے تھی، پیسہ بھی اور وقت بھی۔

زیان نے جیسے تیسے کر کے پیسوں کا بندوبست کر لیا تھا، اب ویزے کا حصول باقی تھا، کچھ کوششوں کے بعد ایک ایجنٹ نے اسے دوہی کا ویزہ بھی فراہم کر دیا، اب اصل مسئلہ اماں کا تھا، وہ کہاں جاتیں؟ وہ کیسے زیان کے بغیر رہیں، اس نے سلطان سے مشورہ کیا تو اس نے صاف لفظوں میں کہا۔

”یار! کوئی رشتے دار اتنے اچھے نہیں جو آنٹی کو اپنے پاس رکھ سکیں، تو دوہی مت جا، تیرا فوٹو اسٹیٹ کا کام اچھا بھلا تو چل رہا تھا، خواہ مخواہ دوہی کی دھن سوار ہو گئی ہے تم پر۔“ سلطان نے تو اس کو سمجھایا، کہہ بھی تو ٹھیک رہا تھا، اس میں غلط بھی کیا تھا؟

وہ اماں کو کس کے سہارے پہ چھوڑتا؟ کس کے آسے پہ چھوڑتا؟ پھر وہ بیماری کی آخری اسٹیج پر تھیں، اگر زیان چلا جاتا تو اماں کی دیکھ بھال کون کرتا؟ اپنی ماں کی خاطر زیان نے روشن مستقبل کو ٹھوکر ماردی تھی اور دوہی جانے کے خیال کو دل سے نکال دیا، وہ ایک مرتبہ پھر فوٹو اسٹیٹ کی دوکان پر بیٹھ گیا تھا، لیکن اب کہ اس کے دل میں امید کی کوئی کرن نہیں تھی، اسی دن ارسلہ کی پھر کال آ گئی تھی، زیان کا بھال بچہ اسے چونکا گیا۔

”کیا بات ہے زیان تم پریشان ہو؟“ وہ اس کی پریشانی کو بن کہے سمجھ جاتی تھی، کچھ ایسا ہی ان دونوں کے درمیان انہونا تعلق بن چکا تھا۔

”میں دوہی نہیں جا رہا ارسلہ۔“ زیان نے

رنجیدگی بھرے لہجے میں بتایا تھا، دوسری طرف
ارسلہ بے ساختہ خوش ہو گئی تھی۔

”یہ تم نے بہت اچھا فیصلہ کیا ہے، تمہاری
اماں کو تمہاری ضرورت ہے زیان، وہ تمہارے
بغیر کیسے رہ سکتی تھیں۔“ ارسلہ کو زیان کے نہ
جانے کاسن کر بے پناہ خوشی کے احساس نے اپنی
لپٹ میں لے لیا تھا۔

”میں اس دوکان پہ بیٹھ کر کوئی نواب نہیں
بن جاؤں گا ارسلہ، یہ مت بھولو کہ تمہارا حصول
میری اچھی مالی پوزیشن سے مشروط ہوگا۔“ زیان
کے لہجے میں پہلی مرتبہ مایوسیوں کی کرچیاں
تھیں۔

”مجھے تمہاری ضرورت ہے، مجھے تم سے
محبت ہے، تمہاری اسٹرونگ پوزیشن سے نہیں، تم
مجھے ہر حال میں قبول ہو۔“ ارسلہ کا لہجہ محبت کے
احساس سے لبالب بھر تھا، زیان پہ جھنجھلاہٹ
سوار ہو گئی تھی۔

”تم خواہوں کی دنیا سے کب نکلو گی ارسلہ،
حقیقت بہت تلخ ہے اور زندگی اس سے بھی زیادہ
تلخ ہے۔“ وہ بہت بکھر رہا تھا، جیسے اپنے حالات
سے مایوس ہو گیا تھا، حالانکہ زیان تو بہت باہمت
تھا، ارسلہ کا انداز بدل گیا، اب وہ اسے سمجھا رہی
تھی، اسے مایوسیوں کے شکنجے سے نکال رہی تھی۔
”تم پریشان نہ ہو، دیکھنا سب اچھا ہو
جائے گا۔“ اس کا انداز اسے بہلانے والا تھا۔

”کیا خاک اچھا ہوگا، جو مجھے نظر آتا ہے وہ
تمہیں نظر نہیں آ سکتا، تمہارا حصول میری زندگی
ہے، تمہیں پانا میری اولین تمنا، اگر تم نہ ہوئی تو
اس زندگی کی بھی مجھے کوئی چاہ نہیں۔“ زیان کی
آواز بھرا رہی تھی، ارسلہ کے دل کو دھکا سا لگا، اس
نے پہلی مرتبہ زیان کو اتنا ٹوٹا بکھرا محسوس کیا تھا،
ورنہ وہ تو زندگی کی، امید بھری باتیں کرتا تھا،

مایوسی تو اس کے قریب بھی نہیں پہنکتی تھی، پھر کیا
اس کی محبت نے زیان کو کمزور کر دیا تھا۔

”میں تمہارے ساتھ ہوں زیان، ہمیشہ
کے لئے تم تصور بھی مت کرنا، میں تمہارے علاوہ
کسی اور کو سوچ سکتی ہوں۔“ ارسلہ کے امید
دلاتے الفاظ بھی زیان کی آزر دگی کا خاتمہ نہیں کر
سکے تھے۔

”زندگی میں کبھی کوئی ایسا موڑ آ جائے،
جب وقت ہم دونوں کو جدا کر دے، تب ارسلہ،
بتاؤ تب کیا کرو گی؟“ وہ اس سے عہد لے رہا تھا یا
اس کے ارادے جاننا چاہ رہا تھا، ارسلہ سمجھ نہیں
پائی تھی، لیکن اس کے لہجے میں ایک مستحکم احساس
ضرور بول رہا تھا۔

”ایسا کبھی نہیں ہوگا۔“ وہ اتنی پر یقین تھی
کہ زیان کے لحظہ بھر کے لئے سارے اندیشے ختم
گئے تھے۔

”مجھے لگتا ہے ارسلہ! کچھ ایسا ضرور ہوگا، جو
ہمارے راستے جدا کر دے گا۔“ زیان اپنے ان
احساسات سے کیسے جان چھڑا پاتا جو اسے کوئی
خوش آئندہ احساس نہیں بخش رہے تھے۔

”وہم میں مت پرو زیان، تمہیں خدا پہ
بھروسہ نہیں؟ اگر ہمارا ملن آسمانوں پہ لکھا ہے تو
چاہے کچھ بھی ہو جائے، کتنی رکاوٹیں بچ میں
آئیں، ہمیں ایک ہونے سے کوئی نہیں روک
سکتا؟“ ارسلہ کے لہجے میں اب بھی وہی یقین
بول رہا تھا، لیکن نہ جنے کیوں زیان پر امید نہیں
تھا، اسے اللہ پر یقین تھا، مگر اپنی قسمت پہ نہیں،
اپنے حالات پہ نہیں، ارسلہ کے دل میں زیان کی
محبت کا پیدا ہونا بھی ایک معجزہ تھا، اگر تقدیر ان
دونوں کو ملا دیتی اور ارسلہ اس کی زندگی میں آ جاتی
تو یہ بھی ایک کرشمہ ہی ہوتا اور زیان کو معجزوں پہ
یقین تو تھا ہی مگر اپنی بد حالی کے بدلنے پہ کوئی

دن ایسے ہی بے جان اور افسردہ گزر رہے تھے، ان دنوں ارسلہ سے بھی کم بات ہوتی تھی، وہ خود اسے بات کرنے کا موقع نہیں دیتا تھا، اس کے امتحان قریب تھے، وہ اسے پڑھنے کے لئے اکساتا تھا اور ان ہی دنوں میں زیان کو احساس ہوا تھا کہ ارسلہ تو اس کی رگوں میں خون بن کر دوڑتی ہے، وہ اس کے اندر روح کی مانند ہستی ہے، زیان کو اب احساس ہو رہا تھا، ارسلہ کا نہ ماننا اس کے لئے قیامت ہے، اس کی ہر امید تمنا اور خوشی ارسلہ سے وابستہ تھی، اگر ارسلہ نہ ہوتی تو زیان کے پاس جینے کا جواز ہی ختم ہو جاتا۔

زیان کو اس کے بات نہ کرنے کے دنوں میں اب احساس ہوا تھا، اس کی آواز کانوں میں نہ پڑتی تو اس کی سماعتیں بھری ہونے لگتیں، اسے کوئی آواز اچھی نہ لگتی اور وہ بلا سبب اپنے ہی گاہکوں سے الجھنے لگتا تھا۔

ارسلہ کتنی کم مدت میں اس کے بہت قریب آگئی تھی، اس کی زندگی پہ پوری طرح چھا گئی تھی، اس کی چاہت زیان کے دل و دماغ پہ محیط تھی، اس کی محبت خون بن کر زیان کے اندر زندگی بن کر دوڑ رہی تھی اور یہ سب اسی ایک نگاہ کا کمال تھا جو دل کی دنیا کو تہہ بالا کر گیا تھا۔

زیان احمد آج تک اسی نگاہ کے کمال پہ دم بخود تھا، کیا کسی نظر میں ایسی حدت اور حاوی ہونے کا اثر ہوتا ہے؟ کیا کوئی نگاہ پہلی مرتبہ میں اسیر کرنے کا اسم رکھتی ہے؟

وہ بھی ایسا ہی بے جان اور پھیکا دن طلوع ہوا تھا، اس دن ارسلہ کا تیسرا پیپر تھا اور ان دنوں کے درمیان بات نہ ہوئے چوتھا دن تھا، ورنہ ایک آدھ دفعہ کی ڈنڈی تو ارسلہ از خود مار لیتی

زیان آج بھی اپنے گاہکوں سے الجھ رہا تھا، مجا سلطان بھی دوکان میں داخل ہوا، وہ اپنے آفس سے آ رہا تھا، کچھ فائلیں نوٹو اسٹیٹ کرواتی تھیں، گھر جانے کی بجائے پہلے ادھر آ گیا تھا۔ اسے دیکھ کر زیان کی پیش کچھ کم ہوئی تھی، رش بھی تھوڑا چھٹ گیا تھا، وہ اس کا کام کرتا اپنے اندر کی بے چینی پہ قابو پا کر بولا۔

”بڑے دنوں بعد دکھائی دیئے ہو، کہاں تھے تم؟“ شاید وہ خود کو باتوں سے لگا کر ارسلہ سے اپنا دھیان ہٹانا چاہتا تھا، سلطان نے گہرا سانس کھینچا۔

”فارغ تھوڑی تھا، ایگزیکٹو پوسٹ پہ ہوں کام کا بہت برڈن ہوتا ہے۔“ سلطان نے مسکرا کر بتایا، اپنی اچھی نوکری کی دھاک بیٹھانے سے باز نہیں آتا تھا۔

”تم سناؤ، لو اسٹوری کس انجام پہ پہنچی؟“ سلطان اکثر زیان سے ارسلہ کے بارے میں سوال کرتا تھا، ماہ پارہ کے توسط سے وہ ان دونوں کے موجودہ تعلق محبت کو جان چکا تھا، پھر زیان نے بھی اپنا دوست سمجھ کر اپنی باتیں اس کے ساتھ شیئر کر لی تھیں، کیونکہ سلطان اس کا اکلوتا مخلص دوست تھا۔

”محبت بہت کم انجام تک پہنچتی ہے۔“ زیان کا لہجہ یاسیت سے بھر گیا تھا، سلطان نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

”کم آن، محبت انجام تک تو پہنچ ہی جاتی ہے، یہ کہو، خوشگوار انجام تک کم ہی پہنچتی ہے۔“ اس کی بات پہ زیان کا دل ڈوب کر ابھر گیا تھا، اس کے لبوں پر پھسکی سی مسکان چمکی، سلطان اس کی افسردگی محسوس کر کے بات بدلنے والے انداز میں بولا۔

”یار! ہماری ہونے والی بھابھی کہاں ہوتی ہے، ابھی تک دیدار سے محروم ہوں۔“

”تمہاری ہونے والی بھابھی کا میں خود دیدار مہینوں کرنے سے قاصر ہوں، تمہیں کیا کراؤں، ماہ پارہ کی سہیلی ہے، تمہارے گھر نہیں آتی کیا؟“ زیان نے کچھ چونک کر پوچھا تھا، سلطان نے نفی میں سر ہلایا۔

”یارو بتا رہی تھی، اس کی امی بہت سخت ہیں، کہیں تبھی آنے جانے نہیں دیتیں۔“ اس کے چہرے پہ مایوسی تھی۔

”پھر تو اچھا ہی کرتی ہیں۔“ زیان نے بے ساختہ خوش ہو کر کہا، سلطان نے اسے گھور کر دیکھا تھا۔

”کیوں اچھا کرتی ہیں، کم از کم ہمارے گھر تو آنے دیں، پارو تو دن میں دو دو مرتبہ وہاں پائی جاتی ہے، ارسلہ پہ پابندیاں ہیں بس۔“ وہ چڑھ کر بولا تھا۔

”اس کی امی کو خبر ہوگی، تم ایسے شریف نہیں، اسی لئے تمہارے گھر جانے پہ پابندی لگائی ہوگی۔“ زیان نے اسے جڑایا تھا، سلطان کے آنے سے اس کا موڈ بدل گیا تھا، کچھ دیر پہلے والی رنجیدگی کا اثر کم ہو گیا تھا، سلطان اس کی بات پہ عادتاً کھول اٹھا۔

”ساری شرافت تو تم پہ ختم ہے، معصوم آنٹی کو خبر نہیں، ان کی لاڈلی بنو کو تم نے گھیر رکھا ہے۔“ اس نے بھی حساب برابر کر دیا تھا۔

”گھیرنے کا الزام مت لگاؤ، محبت جیسے مقدس جذبے کی ہتک ہوتی ہے۔“ زیان نے اسے فوراً ٹوکا تھا۔

”جانے تم نے کون سے زمانے والی محبت کا روگ پال لیا ہے، آج کے دور میں ایسی محبتیں کون کرتا ہے؟ آج کل تو لوگ ڈیٹ مارتے

ہیں، ہوٹلنگ کرتے ہیں، دو چار گرمادینے والی ملاقاتیں ہوتی ہیں اور پھر۔“ سلطان اپنی سوچ کے مطابق اس کی بوسیدہ اور دقیانوسی محبت کو باتیں سنارہا تھا، جو بقول سلطان کے انتہائی پرانی بوسیدہ اور محدود سی محبت تھی، آزاد خیال نہیں تھی، بس فون تک محدود، جس میں کوئی ملن ملانے والا چارم ہی نہیں تھا۔

”اور پھر محبت اپنے انجام کو پہنچ جاتی ہے کیوں؟“ زیان نے طنزیہ کہا۔

”مجھے ایسی محبت سے اللہ بچائے۔“ وہ کانوں کو ہاتھ لگا رہا تھا، سلطان منہ پھاڑے اسے دیکھتا رہا تھا، پھر حیرت سے سر جھٹک کر بولا۔

”کبھی کبھار میں کچھ عجیب سوچتا ہوں، اتنا عجیب کے بس۔“ اس کا انداز کچھ پرسوںج قسم کا تھا، زیان نے صاف مذاق اڑایا تھا، اس کی آنکھوں میں شرارت تھی۔

”شکر ہے، تم بھی کچھ سوچنے لگے ہو۔“ اس کی بات پہ سلطان نے اسے گھور کر دیکھا تھا۔

”پوری بات تو سن لو۔“ اس نے زیان کو ڈپٹ کر کہا تھا، وہ ہونٹوں میں مسکان سمیٹ کر بیٹھ گیا۔

”تم جیسا اتنا مہذب، شریف، باکردار اور سب سے بڑی بات اتنا آرگنائزڈ بندہ اتنی لوکل سی محبت پہ کیسے راضی ہو گیا؟“ اس کے خاموش ہوتے ہی سلطان نے اپنی حیرت کا برملا اظہار کیا تھا، لوکل محبت سے مراد شاید ٹیلی فونک رابطے کی طرف اشارہ تھا، وہ سلطان کی بات سن کر واقعی حیران ہوا، پھر اسے سراپے بغیر نہیں رہ سکا تھا، اس کی آنکھوں میں ستائش بھر گئی تھی۔

”سلطان یار! تم بھی کچھ اچھا اور گہرائی میں جا کر سوچنے لگ گئے ہو؟ کہیں تمہارے دل کے ساتھ کوئی واردات تو نہیں ہو گئی؟“ اس کے لہجے

اس کے چہرے کا تاثر بڑا عجیب تھا، جسے زیان غفلت میں دیکھ نہیں سکا تھا، کیونکہ اس کے پاس کام کا رش لگ چکا تھا۔

☆☆☆

آج اس کا آخری پیر تھا، صبح صبح جب وہ بغیر ناشتے کے گھر سے نکل رہی تھی تو امی نے اسے آواز دے کر زبردستی روک لیا تھا، وہ اسے بغیر ناشتے کے کبھی گھر سے نکلنے نہیں دیتی تھیں پھر آج کل تو امتحان چل رہے تھے، امی نے اسے باداموں والا دودھ گلاس بھر کے پکڑ رکھا تھا، ارسلہ کا دل خواہ مخواہ متلانے لگا، اس نے بہت جان چھڑوانی چاہی تھی مگر امی کے سامنے اس کی ایک نہیں چلتی تھی، امی کا خاصا رعب تھا، وہ جیسے ہی فارم میں آتیں، ارسلہ جھاگ کی طرح بیٹھ جاتی تھی۔

اب بھی گلاس خالی کر کے جیسے ہی امی کو پکڑایا تھا، انہوں نے شاباش بول کر نرمی سے اسے سمجھایا۔

”دھیان سے پیپر دینا اور ہاں جلدی آنے کی کوشش کرنا، سہیلیوں میں لگ کر باتیں بگھارنے نہ بیٹھ جانا، آج کچھ مہمان آئیں گے۔“ امی کے لہجے میں کوئی خاص بات تھی، جس نے اسے بری طرح ٹھنکا دیا تھا، اس کے چہرے پہ ہوائیاں سی اڑنے لگیں، مہمان؟ کون سے مہمان؟ وہ پورے راستے مہمانوں کو ہی سوچتی رہی تھی، اسے امی کا لہجہ کچھ غیر معمولی لگا تھا، مہمان کیوں آنا چاہتے تھے؟ اس پہ گھبراہٹ طاری تھی۔

پھر پیپر بھی اسی کشمکش میں دیا تھا، گوکہ اچھا ہو گیا تھا تاہم اس کے ذہن سے مہمانوں والی بات نکل نہیں رہی تھی، کاش وہ موبائل لے آتی اور زیان کو اپنی پریشانی کے متعلق بتا دیتی۔

میں بھرپور سنجیدگی تھی اور چہرہ مسکرا رہا تھا، سلطان نے مصنوعی لمبی سی آہ بھری تھی۔

”ڈھنگ کی لڑکی تو تم اڑا کر لے گئے، میری بہن کی کوئی اور سہیلی ایسی نہیں تھی جس کے ساتھ میرا بھی کام بن جاتا۔“ زیان نے اسے گھور کر دیکھا تھا۔

”اتنی آپس مت بھرو، ورنہ تمہارا بھی کوئی بندوبست کرنا پڑے گا۔“

”ارے اپنے نصیب، تمہارے جیسے کہاں؟“ سلطان نے پھر مصنوعی کراہ سے آنکھ میچ کر اشارہ کیا تھا، زیان نے اس کے کندھے پر دھموکا جڑا تھا، پھر اسے کان سے پکڑ کر اٹھایا۔

”میرے نصیبوں کو اپنی بد نظرمت لگانا، اٹھو میاں راستہ ناپو۔“ وہ اس کی فائل نتھی کر چکا تھا، سلطان نے اپنے کاغذ سمیٹے اور پھر سے مسکرا کر تان لگائی۔

”اتنا بے آبرو کر کے اپنے کوچے سے مت نکالو، ورنہ دو فرلانگ دور ہی ڈگری کانچ ہے، اپنی بھابھی کو تمہاری شکایت لگاتا ہوا جاؤں گا۔“ سلطان نے اس انداز میں بسور کر کہا تھا کہ زیان کو بے ساختہ ہنسی آگئی۔

”ہاں، کیوں نہیں جاتے ہوئے ضرور دو جوتے کھاتے ہوئے جانا، تمہاری طبیعت صاف ہو جائے گی۔“ زیان نے اسے دھمکایا تو وہ مسکرا کر بولا۔

☆☆☆

”کیا واقعی؟“ اس کی آنکھوں میں بلا کی حیرت تھی، زیان نے اپنی بات پہ مہر لگائی۔

”جی، بالکل، میرے علاوہ باقی سب کے لئے اس کے ہاتھ میں جوتا ہے۔“ زیان بڑے یقین کے ساتھ کہہ رہا تھا، سلطان کو جھٹکا سا لگا، مگر زیان کے نصیب پہ رشک کرنا پلٹ گیا تھا،

بہت دیر سوچنے کے بعد اس نے ایک فیصلہ کیا اور مطمئن ہو گئی، پارو کو بتائے بغیر اس نے کالج سے باہر آ کر تھوڑی دیر کے لئے سوچا اور پھر زیان کی دوکان کی طرف چلنے لگی، اس کے قدموں کی رفتار تیز تھی اور وہ اپنے اتنے لمبے ٹیلی فونک رابطے کے بعد پہلی مرتبہ اس دن کے بعد آج اس کی دوکان پہنچی۔

یوں کہ اسے دیکھ کر زیان کا میٹر ہی گھوم گیا تھا، اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا، ارسلہ یوں دوکان پہ اس کے منع کرنے کے باوجود آ جائے گی، وہ تو دوکان بند کر کے گھر جا رہا تھا، گھر سے اماں کی خرابی طبیعت کی اطلاع آئی تھی اور ابھی وہ اٹھنے ہی لگا جب ارسلہ اچانک اندر آ گئی، زیان اسے دیکھ کر پہلے تو حیران ہوا تھا پھر اسے غصہ آیا، لیکن ارسلہ پہ غصہ کرنے کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا، پھر بھی زیان اسے ٹوکے بنا نہیں رہ سکا۔

”کیوں آئی ہو ارسلہ؟ میں نے منع بھی کیا تھا، تمہیں کوئی دیکھ لے تو، کس قدر بے عزتی ہوگی تمہاری بھی اور میری بھی۔“ زیان اپنی ناگواری کا برملا اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکا تھا، ارسلہ اس کی ناگواری کو چپ چاپ پی گئی تھی، اسے بھی بات کرنے کی جلدی تھی، وہ خود بھی یہاں آنا نہیں چاہتی تھی مگر۔

”گھر میں مہمان آرہے ہیں، میں تمہیں یہی بتانا چاہ رہی تھی۔“ ارسلہ نے بے ربط انداز میں کہا۔

”مہمان آرہے ہیں یا دہشت گرد، کیا تم فون پہ یہ بات نہیں کر سکتی تھی؟“ زیان نے ہنسی جتائی تھی، ایک تو گھر جانے کی جلدی تھی، جانے اماں کی طبیعت کیسی ہو، اور سے ارسلہ کی آمد اور یہ مہمانوں کا چکر اس کا دماغ گھوم رہا تھا۔

”گھر پہ اگر موقع نہ ملتا بتانے کا پھر تم کیا کرتے؟ اگر مہمانوں کو ہاں ہو جائے تو پھر؟“ ارسلہ کے اگلے الفاظ، زیان کے چودہ طبقہ اچانک روشن ہوئے، تو ارسلہ خاص مہمانوں کی بات کر رہی تھی، اوف میرے اللہ، زیان کا سر چکرا گیا۔

”ان مہمانوں کو بھی آج ہی آنا تھا، حد ہے پار، تمہارے ماں باپ تمہیں گریجوٹ ہونے نہیں دیں گے۔“ اس نے تپتے لہجے میں کہا تھا، اس کا ذہن سننا اٹھا تھا۔

”تم ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے رہو، میری بارات دروازے تک آ جائے گی۔“ ارسلہ رو دینے کو تھی۔

”تو کیا کروں؟“ وہ عجلت میں بولا تھا، ابھی اسے دوکان کو تالا لگانا تھا، کوئی ٹیکسی پکڑنی تھی، پھر اماں کو ہسپتال لے کر جانا تھا۔

”اپنی اماں کو میرے گھر بھیج دو زیان، تم سمجھتے کیوں نہیں۔“ ارسلہ نے ٹپ ٹپ گرتے آنسوؤں کو بمشکل سمیٹا تھا، زیان کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔

”ابھی تو اماں کو ہسپتال بھیجنے لگا ہوں، دعا کرو اماں ٹھیک ہو جائیں، تمہارے گھر آ کر تمہارا شوق بھی پور کر لیں گے نکا سا جواب لے کر۔“ زیان اپنی بے بسی پہ خود کا مذاق اڑانے لگا تھا۔

”اماں کو کیا ہوا ہے؟“ ارسلہ اپنا غم بھول کر سخت متوحش ہو گئی تھی۔

”پھر طبیعت خراب ہے، دمہ کا شدید ایک، میں چلتا ہوں دعا کرنا۔“ زیان نے عجلت میں چیزیں سمیٹ ڈالی تھیں، پھر جاتے جاتے بھی تنبیہ کیے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

”آئندہ دوکان پہ مت آنا ارسلہ، اپنے لئے رسوائی مت خریدو۔“ اس کی تنبیہ میں محتاط سا

اشارہ تھا جسے ارسلہ سمجھتی تو تھی مگر عمل نہیں کرتی تھی، اپنے دل کے پاتھوں مجبور ہو جاتی تھی، بے بس اور لاچار ہو جاتی تھی، زیان چاہا گیا اور ارسلہ کسی ہارے ہوئے مسافر کی طرح سڑک پہ شکستہ قدموں سے چلتی رہی۔

☆☆☆

ان دنوں سورج ٹھٹھا اور چپکے سے ڈھل جاتا، دھوپ چڑھتی، ڈھلتی، چھپتی، ارسلہ کو کچھ اندازہ نہیں ہوتا تھا، وہ پورا دن اپنے کمرے میں بند رہتی تھی، یا آنسو بہاتی، یا اپنی قسمت سے گلے کرنے لگتی تھی۔

کبھی کبھار پارو آ جاتی تو اس کے دل کا کچھ بوجھ ہلکا ہو جاتا تھا، وہ اس کے دکھ بھی سنتی تھی، آنسو بھی چھنتی تھی اور مقدور بھرا سے تسلی دینے کی کوشش بھی کرتی۔

پارو اس کی سہیلی تھی، وہ اس کا احساس کرتی تھی، خیال رکھتی تھی، ڈھارس پہنچاتی تھی، لیکن اس کے دل کا بوجھ کم نہیں ہوتا تھا، بڑھتا ہی چلا جاتا تھا۔

اس دن ارسلہ کے آخری پیپر والے دن زیان کا دوکان بند کر کے جانا گویا ہمیشہ کے لئے ہو گیا تھا، دوبارہ اس نے دوکان کھولی ہی نہیں تھی، کیونکہ اسی شام زیان کی اماں چل بسی تھیں، پارو کی پوری فیملی اس کے گھر گئی تھی، تعزیت کے لئے، لیکن ارسلہ کے جانے پہ پابندیاں تھیں، کاش وہ بھی پارو کے ساتھ چلی جاتی، کچھ اور نہیں تو ٹوٹے بکھرے زیان کو تسلی دلا سہ دیتی، اس کا سہارا بنتی، غم کی اس گھڑی میں زیان کا ساتھ دیتی، لیکن ارسلہ بہت مجبور تھی اور زیان اس کی مجبوری کو سمجھتا بھی تھا، اس لئے اسے ارسلہ سے کوئی گلہ نہیں تھا۔

زیان کی اماں کو دنیا سے گئے ہوئے ہیں

دن ہو چکے تھے، زیان سنبھل تو گیا تھا لیکن ابھی تک غم کے اس فیر سے نکل نہیں پایا تھا، اس کا پورا گھر ختم ہو چکا تھا، وہ اس بھری دنیا میں اکیلا رہ چکا تھا، اس کا اپنا اب کوئی بھی نہیں تھا، پھر کچھ وقت گزرا تو ارسلہ کی محبت، توجہ اور التفات زیان کو زندگی کی طرف کھینچ لائے تھے، لیکن اب وہ کچھ اور انداز میں سوچتا تھا۔

اس کا گھربار تو تھا کوئی نہیں، اس نے ایک مرتبہ پھر باہر جانے کا فیصلہ کر لیا تھا، اس دفعہ ارسلہ نے اسے نہیں روکا تھا، وہ چاہتی تھی زیان کم از کم اس قابل ضرور ہو جائے کہ اسے اس کے بھائیوں کے ساتھ وہ کھڑے ہوتے ہوئے اسے کوئی احساس کمتری نہ محسوس ہو، لیکن جانے سے پہلے زیان کی ایک خواہش تھی، وہ ارسلہ کو اپنے نام کر جاتا، کم از کم دل کو تسلی تو رہتی، اس ضمن میں زیان نے سلطان کی امی سے مشورہ کیا تھا اور اپنی خواہش کا اظہار کیا، سلطان کی امی مان گئی تھیں، کیونکہ زیان کا کوئی بزرگ اب نہیں تھا، نہ کوئی رشتہ دار تھا، بس سلطان کی فیملی تھی، جس سے زیان کی توقعات وابستہ تھیں، گو کہ زیان اتنا پر امید نہیں تھا، پھر بھی اس نے رسک لینے کا سوچ لیا تھا۔

اتوار کے دن زیان کا پرپوزل لے کر آنٹی ارسلہ کے گھر آئی تھیں، ارسلہ کی امی بہت خوش ہوئیں، اس کے ابو اور بھائی بھی بہت خوش تھے۔ لیکن جب آنٹی نے اپنا مدعا پیش کیا تو ان لوگوں کو خاصا دھچکا لگا تھا، ان کے خیال تھا کہ وہ اپنے بیٹے سلطان کے لئے آئی ہیں، لیکن یہ پتا دینے پر کہ وہ بیٹے کے دوست کے لئے آئی ہیں، سوان کو طریقے کے ساتھ انکار کر دیا گیا تھا، زیان کی خاطر آنٹی نے کافی زور دیا مگر بے سود، ارسلہ کے بھائی کسی طور راضی نہیں تھے مجبوراً آنٹی

کو بے مراد لوٹنا پڑا تھا۔

زیان کے لئے یہ بڑا دھچکا نہیں تھا، اسے انکار کا گمان تھا، لیکن ارسلہ کے لئے یہ بہت بڑا دھچکا تھا، وہ اس غم سے ادھ موئی ہو رہی تھی، یہ صدمہ اس کی برداشت سے باہر تھا، حتیٰ کہ زیان کے سمجھانے پہ بھی وہ سنبھل نہیں رہی تھی۔

”میں جانتا تھا، انکار ہو جائے گا، مجھے قبل از وقت پر پوزل نہیں بھیجنا چاہیے تھا مگر میں نے تمہاری تسلی کے لئے۔“ زیان بھیگی آواز میں بول رہا تھا اور ارسلہ کے آنسو ہر حد توڑنے کو بے تاب تھے۔

”یہ لوگ نہیں مانیں گے زیان! مجھے نہیں لگتا، یہ کبھی نہیں مانیں گے۔“ ارسلہ امید کا دامن ہاتھ سے چھوڑ بیٹھی تھی۔

”تم کیوں کھراتی ہو، دیکھنا سب ٹھیک ہو جائے گا، میرا ویزہ لگ چکا ہے، ایک سال بعد جب میں واپس آؤں گا تو یہ لوگ تم از کم اس طرح انکار نہیں کر سکیں گے۔“ زیان کی امیدیں روشن تھیں، وہ اسے بھی دلا سادے رہا تھا، اس کی ہمت بڑھ رہا تھا، مگر ارسلہ کے دل کو چین نہیں آتا تھا۔

”ایک سال میں پتا نہیں کیا ہو؟ تم نہ جاؤ زیان۔“ ارسلہ شدت سے کر لائی تھی۔

”میرا جانا بہت ضروری ہے ارسلہ! یہاں رہ کر میں کچھ نہیں کر پاؤں گا، قدرت مجھے دوسری مرتبہ موقع فراہم کر رہی ہے، میں یہ موقع کھوٹا نہیں چاہتا، تم آسائشات کے بغیر کیسے رہو گی؟ کہنے کی حد تک سب باتیں ٹھیک لگتی ہیں، عملی زندگی بہت مشکل ہے ارسلہ اور میں تمہیں ہر قسم کے سکھ دینا چاہتا ہوں، تمہاری فیملی بھی تمہارے لئے بہتر سوچتی ہے، وہ کیسے تمہارا ہاتھ میرے جیسے بندے کے ہاتھ میں تھما دیں، جس کا کوئی

فیوچر ہی نہیں۔“ زیان کا لہجہ گہرا رنجیدہ تھا۔

”میں صرف تم سے ایک عہد چاہتا ہوں، تم میرا انتظار کرو گی، کسی بھی قیمت پہ، کسی بھی صورت میں، تم میری پابند رہو گی، میرا وعدہ ہے میں لوٹ کر آؤں گا۔“ زیان کی بھیگی آواز میں وعدوں کی باس رچی تھی، اس کا خالص لہجہ آج بھی یقین سے پر تھا، ارسلہ نے زیان کو اپنے آنسوؤں سے بھیگی دعاؤں تلے رخصت کیا تھا، اسے یہ اندازہ ہی نہیں تھا، وہ زیان کو ہمیشہ کے لئے رخصت کر رہی ہے، وہ کبھی ایک دوسرے کو دیکھ نہیں پائیں گے وہ کبھی ایک دوسرے سے مل نہیں پائیں گے اور کبھی ایک دوسرے سے بات بھی نہیں کر پائیں گے۔

☆☆☆

زیان کے جاتے ہی ارسلہ پہ ایک ہی موسم ہمیشہ کے لئے ٹھہر گیا تھا، یہ جدائیوں کا موسم تھا، کون کہتا تھا، محبت وصل میں بھیگتا ہوا موسم ہے، محبت تو جدائیوں میں سلگتا ہوا موسم تھا، وہ کون سی گھڑی تھی جب محبت نے اسے روگی کر دیا تھا، اسے ایسے مقام پر لے آئی تھی، جس سے آگے تذبذب کی کھائیاں تھیں اور پیچھے کشمکش کے اندھے گڑھے، کوئی امید نہیں تھی، کوئی روشنی نہیں تھی اور کوئی چارہ گر بھی نہیں تھا اور زیان اسے اپنے ہریج میں ایک ہی تسلی دیتا تھا، اس کے آنسوؤں، التجاؤں اور کر بناک باتوں کے بدلے میں صرف ایک ہی بات دوہراتا۔

”ارسلہ! وہ وقت دور نہیں، جب یہ مشکل وقت ختم ہو جائے گا، تم ہمت نہ ہارو، دیکھو میں تمہارے لئے دن رات کا فرق بھلا کر گدھوں کی طرح کام کرتا ہوں، میں جلدی واپس آ جاؤں گا۔“ زیان کے لفظوں میں امید کے پھا ہے اس کے رستے زخموں پہ مرہم بن جاتے تھے، وہ کچھ

دن زبان کی باتوں کے سہارے خوش رہتی تھی اور پھر اس یہ یاسیت کے لمبے لمبے دورے پڑ جاتے تھے، دراصل زبان کی جدائی ارسلہ کے لئے ضرب شدید کی مثل تھی، یہ مہلک صدمہ اسے اندر ہی اندر گھلارہا تھا اور بظاہر وہ بہت خوش رہنے کی کوشش کرتی، اسے اپنے ارد گرد مودو لوگوں کو بھی مطمئن کرنا ہوتا تھا، لیکن یہ جو رنج کا غبار اس کے اندر جمع ہو رہا تھا، وہ کسی دن پھٹ ہی پڑتا، اگر زبان کی محبت طاقت بن کر اس کے گرد حصار نہ بٹھتی، وہ ہر روز اپنے لفظوں کی مرہم اس کی یادوں کے رستے زخموں پہ رکھتا تھا، اس کے لئے زبان کی باتیں اور یادیں آکسیجن کا کام دیتی تھیں، اکثر وہ زبان کے پرانے میسج نکال کر پڑھتی تھی، وہ اکثر بڑی روانی میں بھی یہ الفاظ دوہراتا تھا۔

”دریا پہاڑوں میں سے سمٹ کر گزرتا ہے اور میدانوں میں سے پھیل کر گزرتا ہے، اپنے حالات کے مطابق بہنا چاہیے، انسان حالات سے باہر نکل جائے تو بکھر کر رہ جاتا ہے۔“ وہ زبان کا ایک ایک میسج کھول کر دیکھتی تھی اور پہروں تک آنسوؤں سے بھگوئی رہتی، اس کی یاد ارسلہ کا سوگ تھا، اس کی جدائی ارسلہ کا روگ تھا، وہ اس کی آنکھ میں آنسو بن کر ہمیشہ ٹھہرا رہتا تھا، نہ بہتا تھا نہ پلٹتا تھا، بس ایک یاد کی طرح سینے میں کسک بن کر دھڑکتا تھا، جب وہ آخری حد تک مایوسی کے سائے تلے دب جاتی تب زبان کا ایک اور میسج اس کے اندر نئی رتوں کی امیدیں لے کر روشن ہو جاتا تھا، تب ارسلہ عادت سے مجبور ہو کر سسکی دبا کر لکھتی۔

”تم کہتے ہو، سب ٹھیک ہو جائے گا، کیا ہماری جاہ کے مطابق سب ٹھیک ہو جائے گا؟“ اس کا سسکتا لہجہ اسے دور بیٹھے بھی تڑپا ڈالتا تھا، وہ

کتنا ہی کیوں نہ مصروف ہوتا، وہ کتنا ہی کیوں نہ کام کے بوجھ تلے دبا ہوتا، ارسلہ کو جواب لکھنا نہیں بھولتا تھا، اس کی امید تازہ کرنا نہیں بھولتا تھا۔

”ٹھیک وہ نہیں ہوتا ارسلہ جو ہم چاہتے ہیں، بلکہ ٹھیک وہ ہوتا ہے جو رب نے ہمارے لئے لکھ رکھا ہے، تم خدا کی رحمت سے مایوس کیوں ہوتی ہو، اس نے لڑکھڑانے سے بچایا ہے تو قدموں کو مضبوطی بھی بخشے گا، جم کر کھڑا ہونے کی طاقت بھی دے گا، وہ دن دور نہیں اور وہ دن واقعی ہی دور نہیں۔“ ارسلہ، زبان کے لکھے لفظوں کو بار بار پڑھتی تھی، دل پھر بھی نہیں بھرتا تھا، اس کے ہر لفظ میں ایک انوکھی طاقت کا احساس چھپا ہوتا تھا، ارسلہ کمزور پڑتے پڑتے بھی مضبوط ہو جاتی تھی، ٹوٹے ٹوٹے بھی سنبھل جاتی تھی۔

لیکن اسے ایک بات کا اندازہ نہیں تھا، کچھ دکھ بس نصیب کا کرشمہ ہوتے ہیں، ان سے پیچھا چھڑوانے کی جتنی کوشش کی جائے یہ ساتھ ساتھ رہتے ہیں، مگر تنہا نہیں چھوڑتے، کبھی اکیلا نہیں کرتے۔

یوں ہی ایک سال گزر گیا اور زبان کی یادوں میں دوسرا سال پھسلنے لگا، اس نے ارسلہ کو پہلے ہی بتا دیا تھا کہ شاید وہ آنے سکے، اس کی چھٹی منظور نہیں ہو رہی تھی۔

ادھر اس کا رزلٹ بھی آچکا تھا، امی اب اس کے ہاتھ پیلے کرنے کے چکروں میں تھیں، آئے دن رشتے آتے لیکن نہ جانے کیوں، کہیں بات نہیں بن پارہی تھی، لوگ ارسلہ کو پسند کر جاتے تھے، رشتہ پکا ہونے کے قریب ہوتا اور لڑکے والوں کی طرف سے جواب ہو جاتا، جانے مسئلہ کیا تھا، امی ابو سخت ہراساں تھے اور بھائی شدید متفکر۔

پھر ان دنوں پارو بھی پیادیں سدھار گئی تھی، امی کو کسی پل قرار نہیں آتا تھا، ان کی نیندیں حرام ہو چکی تھیں۔

انہی بے کیف دنوں میں ارسلہ کے بھائیوں کو کچھ شک پڑ گیا، یہ شک نہیں تھا، انہیں جیسے یقین تھا، ارسلہ کا در پردہ کسی کے ساتھ رابطہ ہے بھی اس کے دونوں بھائی بڑے یقین اور وثوق کے ساتھ اس سے باز پرس کر رہے تھے، کاشف بھائی کا چہرہ سرخ اور غصے سے تہمتار ہا تھا، تب خوف و ہراس میں ارسلہ کو اندازہ نہیں ہو سکا تھا، اس بات کا اسے بعد میں خیال آیا تھا، یوں لگ رہا تھا بھائیوں کو کسی نے پڑھا لکھا کر بھیجا ہے اور بڑا یقین دلایا تھا کہ ارسلہ کا رشتہ پکا نہ ہونے کے پیچھے بڑی ٹھوس وجوہات موجود ہیں، تبھی تو کاشف بھائی نے بڑے دو ٹوک لہجے میں ارسلہ کو بلا کر سمجھایا۔

”تمہارا رشتہ کیوں نہیں ہو رہا؟ اس کے پیچھے جو بھی وجہ ہے، تمہیں اپنی زندگی عزیز ہے تو گزشتہ ہر بات بھول جاؤ، میں بار بار سمجھاؤں گا نہیں۔“ کاشف بھائی کا انداز اتنا برہم نہیں تھا، لیکن عاطف بھائی کا غصہ آسمان کو چھو رہا تھا، وہ ارسلہ سے ہر بات اگلو لینے کے چکر میں تھے، انہوں نے ارسلہ کو بڑا پریشاں کیا تھا، اسے بری طرح ڈرایا دھمکایا اور ہراساں کیا تھا، وہ کسی بھی صورت اسے بخشنے کے لئے تیار نہیں تھے۔

”سچ سچ بتا دو، کون ہے وہ؟ اور کیوں رکاوٹ بن رہا ہے؟ ورنہ میں تمہارا منہ توڑ دوں گا، تمہیں زندہ درگور کر دوں گا۔“ عاطف بھائی جس انداز میں بات کر رہے تھے ارسلہ کو پتا لگ گیا تھا، انہیں زیان کے بارے میں کسی نے ٹھوس ثبوت اور شواہد فراہم کیے تھے۔

”کوئی بھی نہیں، جھوٹ ہے سب، میں سچ

کہہ رہی ہوں۔“ ارسلہ کو جھوٹ کا سہارا لینا ہی پڑا تھا، اسے اپنی پرواہ نہیں تھی مگر وہ زیان پہ آنچ آنے نہیں دینا چاہتی تھی۔

”مگر تمہارا انکار ہماری سمجھ سے بالاتر ہے، تم در پردہ ہر لڑکے والوں کو رشتے سے انکار کیوں کرتی ہو؟“ ابو کو بیچ میں بولنا پڑا تھا۔

”میں تمہارا باپ ہوں ارسلہ، تم مجھے بتاؤ، کوئی مسئلہ ہے بیٹا۔“ اسے اپنا باپ حد سے زیادہ غمگین اور افسردہ لگا تھا، امی بھی سر جھکائے بیٹھی تھیں، ان کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں اور ان کا چہرہ زرد تھا۔

”ابو! کچھ بھی نہیں، بھائیوں کو غلط فہمی ہوئی ہے۔“ اس نے لرزتی آواز میں اپنی صفائی پیش کرنا چاہی تھی، تب عاطف بھائی گرج کر دھاڑے تھے۔

”تو پھر زیان کون ہے؟“ عاطف بھائی کے الفاظ ارسلہ پر کسی بم کی طرح گرے تھے، اس کی امی کا چہرہ بھی فق ہو گیا تھا اور اس کے ابو دم بخود تھے۔

”کون زیان؟“ ابو اور امی کے ساتھ ساتھ کاشف بھائی بھی چونکے تھے۔

”یہ وہی لڑکا ہے جس کا پرپوزل مسز قمر زمان لائی تھیں ارسلہ کے لئے۔“ عاطف بھائی نے چبا چبا کر بتایا تھا، ارسلہ کا دل دھک سے رہ گیا تھا، اس کے پیروں تلے سے زمین کھسک گئی تھی، تو بھائیوں کو پتا چل گیا تھا؟ ان کو کس نے بتایا تھا، انہیں کیسے پتا چلا، وہ ہکا بکا دیکھتی رہ گئی، امی کی رنگت متغیر تھی اور ابو ساکت کھڑے تھے، جیسے انہیں یقین نہ آیا ہو، پھر انہوں نے عاطف بھائی کو جھڑک دیا تھا۔

”بکواس مت کرو، اپنی بہن پہ الزام لگاتے ہو، یہ کسی زیان کو نہیں جانتی۔“ ابو جیسے

کی ایک ایک بات، ایک ایک لفظ، جسے وہ تنہائی میں پڑھتی تھی اور اس کی ریکارڈ شدہ باتیں سنتی تھی اور اس وقت وہی باتیں اور وہی میسجز ارسلہ کے لئے رسوائی کا سبب بن رہے تھے، اس کے دونوں بھائیوں کا پارہ آسمان پہ تھا اور وہ ارسلہ پہ بے دریغ برس رہے تھے۔

”اسی لئے میں لڑکیوں کو موبائل دینے کے حق میں نہیں تھا، یہ ناجائز استعمال کرتی ہیں، دیکھ لیا آپ نے؟ اب کوئی اور بھی ثبوت چاہیے۔“ وہ دونوں اب امی ابو کے سر ہو چکے تھے، جنہوں نے ارسلہ کو بے جا آزادی دے رکھی تھی، جس کی وجہ سے آج یہ دن دیکھنا پڑا تھا اور وہ آج اپنے بھائیوں کے سامنے رسوا ہو گئی تھی، اپنے والدین کے سامنے سر اٹھانے کے قابل نہیں رہی تھی۔

ایک خالص اور سچی محبت کو غلط طریقے سے کرنے کا یہ انجام تھا، کوئی ایک بھی سیدھا راستہ جو خالص محبت تک لے جاتا ہو، کاش اس کی سمجھ میں ہوتا اور جو سیدھے طریقے سے آتے ہیں، ان کو یہ کم فہم لوگ کبھی رسوں کبھی روایات، کبھی ذات پات اور کبھی مال و دولت کے پیمانے میں تول کر دھتکار دیتے ہیں، پھر محبت کو پانے کا کوئی صحیح طریقہ کہاں سے ایجاد ہوتا، اگر تھا تو یہ لوگ بتاتے کیوں نہیں تھے، چپ کیوں تھے، خاموش کیوں تھے، بولتے کیوں نہیں تھے، شاید ان لوگوں کے پاس بھی کوئی جواب نہیں تھا، لیکن ان کے پاس سوال بہت تھے، طعنے بہت تھے، طنز بہت تھے، دل چھلنی کر دینے والے لفظ بہت تھے۔

اس کے دونوں بھائیوں نے حتی المقدور اسے ملامت بھی کیا، غصہ بھی نکالا، زہر بھی اگلا، مارا بھی اور پھر موبائل فون چھین لیا، اسے کمرے تک محصور کر دیا، وہ گھر میں اپنے ہی گھر میں قید کر

ارسلہ کے لئے ڈھال بن گئے تھے، ارسلہ کو لگا، ابو کے سامنے اس کا عمر بھر سر نہ اٹھ سکے گا، یہ ندامت تھی، پشیمانی تھی، شرمندگی تھی کہ کیا تھا، اس کا سراٹھ ہی نہ سکا، امی اور ابو دونوں اس کی خاطر بھائیوں سے لڑتے رہے تھے، پھر عاطف بھائی کے دماغ میں جانے کیا سمائی تھی، وہ ایک دم اپنی جگہ سے اٹھے اور ارسلہ کے قریب آ کر چلائے تھے۔

”اس سے کہیں اپنا موبائل لے کر آئے۔“ وہ امی اور ابو سے مخاطب تھے اور دیکھ ارسلہ کی طرف رہے تھے اور ارسلہ کا سانس جیسے لمحہ بھر کے لئے رک سا گیا تھا، اس کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا اور اس کی ٹانگیں بوجھ اٹھانے سے قاصر تھیں، اس کا پورا وجود کانپ رہا تھا۔

”جاؤ ارسلہ اپنا موبائل لے کر آؤ۔“ اب کہ کاشف بھائی نے بھی کھر درے لہجے میں اسے پکارا، ارسلہ سے اٹھنا محال ہو گیا تھا، وہ پارہ پارہ ہوتی بے بس اور لاچار کھڑی تھی۔

”ابھی آپ کو پتا چل جاتا ہے، یہ آپ کی لاڈلی کہاں تک سچی ہے۔“ عاطف بھائی نفرت سے بولے تھے۔

”تم خاموش رہو، میں بات کرتا ہوں، بلکہ میں موبائل لاتا ہوں، بتاؤ کہاں رکھا ہے؟“ کاشف بھائی، عاطف بھائی کو ڈپٹ کر ارسلہ کی طرف متوجہ ہوئے تھے، تب امی نے گہرا سانس کھینچا تھا پھر کاشف بھائی کو روک کر بے ساختہ بولیں۔

”میں لاتی ہوں تم کو۔“ ارسلہ یہ ایک کڑی نگاہ ڈال کر وہ اندر چلی گئی تھیں، پھر کچھ دیر بعد ان کی واپسی ہوئی، وہ ارسلہ کا موبائل لے آئی تھیں اور اس موبائل میں وہ سب کچھ تھا جو نہیں ہونا چاہیے تھا، زبان کا ایک ایک میسج سیو تھا، اس

دی گئی تھی، وہ ایسا ہی کر سکتے تھے، انہوں نے ایسا کر لیا تھا، کیونکہ وہ صاحب اختیار تھے، خود مختار تھے، حاکم تھے اور ارسلا ایک مظلوم رعایا تھی، وہ سنتی بھی تھی، سہتی بھی تھی، برداشت کرنے پہ مجبور بھی تھی۔

لیکن ایک چیز اس کے صبر اور ضبط کی آخری حد کو کراس کر دیتی تھی، وہ زیان سے جدائی کا خیال تھا، وہ زیان کی محبت سے دستبرداری تھی، وہ زیان کو بھول جانے کا خیال تھا، یہ اس کے صبر اور ضبط کی آخری حد تھی۔

وہ سب کچھ سہہ سکتی تھی، وہ سب کچھ برداشت کر سکتی تھی، وہ ہر صدمہ دل پہ لے سکتی تھی، وجود پہ اٹھا سکتی تھی مگر زیان کی یاد سے جدائی کا تصور بھی محال تھا، زیان کی محبت سے دستبرداری کا خیال بھی محال تھا، زیان کو بھول جانا اس کے اختیار کی کسی حد میں نہیں آتا تھا، زیان سے محبت ایک لافانی جذبہ تھا، زیان سے عشق ایک الہامی جذبہ تھا۔

☆☆☆

میں سوتا ہوں

میرے اندر

ایک سنہرا

جد سے گہرا

غم ہوتا ہے

جب بھی آنکھیں کھولوں

سامنے منظر دیکھوں

گھاس اگ آتی ہے

اور راستہ نم ہوتا ہے

زیان کے وہ دن کسی عذاب سے کم نہیں تھے، ان دنوں کو سوچنا، لکھنا اور شمار کرنا کسی قیامت سے کم نہیں تھا، اس کے دن رات کا چین کھو چکا تھا، وہ محبت اور رشتوں میں تلاش ہو چکا

تھا، اس کی پوری زیست کا سرمایہ صرف ایک رشتہ بچا تھا، ارسلا کے نام کا، وہی زیان کی پوری زندگی کا اثاثہ اور متاع تھی اور زیان اسی اثاثے کو کھو چکا تھا، وہ متاع دل کھو چکا تھا۔

اسے آج تک یقین نہیں آتا تھا کہ ارسلا بغیر کچھ کہے سنے، کسے کس طرح اور کیونکر اس سے تمام رابطے ختم کر سکتی تھی؟ ارسلا اتنی سنگدل اور کٹھور کسے ہو سکتی ہے، ارسلا اس قدر بے وفا اور ہرجائی کس طرح بن سکتی ہے؟ زیان کو بالکل یقین نہیں آتا تھا، اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی یقین نہیں آتا تھا۔

وہ ارسلا سے بات کرنے کے لئے تڑپتا تھا، وہ دن بھر کام کر کے تھکا ہارا آتا اور پوری رات ارسلا کے نمبر پہ کالز کر کے تھک جاتا تھا، ارسلا کا نمبر ہمیشہ کے لئے بند ہو چکا تھا۔

پھر صدمے، دکھ، کرب اور اذیت کے اس غبار میں اسے امید کی ایک کرن نظر آئی تھی، اس نے لمحے کے آخری حصے میں اپنی سوچ کو عملی جامہ پہنایا اور سلطان کے نمبر پہ کال کی۔

وہ سلطان ہی تھا جو اس کی مدد کر سکتا تھا، کم از کم ارسلا کی خیریت معلوم ہو جاتی، وہ ٹھیک تو تھی؟ وہ زندہ تو تھی؟ اسے کئی طرح کے اندیشے ڈر رہے تھے، وہ سخت متوحش تھا، سلطان نے اس کی پوری بات دھیان سے سنی تھی، پھر وہی کیا جو زیان نے کہا تھا۔

سلطان، زیان کی طرف سے ایک خط لکھ کر ارسلا کو بھجوا دیا، جس میں اس کی خیریت پوچھی گئی تھی اور اپنی خیریت بتائی گئی تھی، یہ خط سلطان نے اپنی ملازمہ کے ہاتھ ارسلا کو بھجوا دیا تھا جس کا جواب بھی لفافے میں بند ہو کر فوری طور پر آ گیا تھا، سلطان نے زیان کو دوبارہ کال کی تھی۔

”یار! جواب تو آ چکا ہے، لفافے میں بند

ہو کر، کیا تمہیں پوسٹ کر دوں؟“ سلطان نے اس کی پریشانی کے خیال سے فوراً بتا دیا تھا، ورنہ اس کا دل چاہ رہا تھا، اسے تھوڑا سا ستاتا۔

”کیا پارو گئی تھی وہاں، میری پارو سے بات کروا سکتے ہو؟“ زیان دوسری طرف بے تابی سے بولا تھا، سلطان کچھ بتاتا بتاتا رک سا گیا۔

”ہاں، پارو کو بھیجا تھا، مگر تمہاری بات نہیں ہو سکتی، وہ جا چکی ہے۔“ سلطان نے ملازمہ کے ہاتھ پیغام رسائی والی بات کو چھپا لیا تھا۔

”اچھا۔“ وہ مایوس ہو گیا، وہ ارسلہ کی خیریت سلطان سے تو نہیں پوچھ سکتا تھا۔

”اب بتاؤ، خط تمہارے بتائے گئے پتے پہ پوسٹ کر دوں؟“ سلطان اسے سوچوں کے گھنور سے کھینچ لایا تھا، زیان تھوڑی توقف کے بعد فوراً بولا۔

”نہیں، تم پوسٹ مت کرو، مجھے پڑھ کر سنا دو، پوسٹ کرو گے تو کافی دن بعد میرے تک پہنچے گا، جبکہ مجھ سے صبر نہیں ہو رہا۔“ زیان کی بے تابی اور اضطراب کو محسوس کر کے سلطان نے لفافہ چاک کر لیا۔

ارسلہ نے بڑا لمبا خط لکھا تھا، جگہ جگہ سے لفظ آنسوؤں میں مٹ چکے تھے، تحریر بے ربط بھی تھی اور رقت آمیز بھی، سلطان کے دل کو کچھ ہونے لگا۔

”زیان! میں نے کہا تھا، تم نہ جاؤ، کبھی نہ جاؤ۔“ بغیر کسی سلامتی کی دعا کے خط کا بڑا بے ربط آغاز تھا، جو ارسلہ کی شکستہ ذہنی کیفیت کو صاف ظاہر کر رہا تھا، سلطان نے لمحہ بھر کے لئے سوچا اور اچانک لائن ڈراپ کر کے موبائل آف کر دیا، اسے پہلے خود تحریر پڑھنی چاہیے تھی، پھر زیان کو پڑھ کر سناتا، نجانے ارسلہ نے کیسے دل خراش قلم لکھے ہوں، بے چارہ پردیس میں پریشان ہو

گا، یہی سوچ کر اس نے خط پہ نگاہیں جمادی تھیں۔

”زیان! تم کہاں چلے گئے ہو مجھے تاریکیوں کے جنگل میں چھوڑ کر، مجھے تنہا، اکیلا اور لاچار کر کے میں جن حالات سے گزر رہی ہوں، تمہیں کیا بتاؤں، تمہاری یاد ایک آکسیجن ہے جس کی بدولت ابھی تک سانس لے رہی ہوں، ورنہ تمہاری ارسلہ اب تک مر چکی ہوتی، تمہیں کیا کیا بتاؤں جانے عاطف بھائی کو تمہارے بارے میں کس نے بتا دیا، انہوں نے میرا جینا محال کر دیا تھا، میرا موبائل چھین لیا، مجھ پر پابندیاں لگا دیں، مجھے مارا پیٹا، کمرے میں بند کر دیا، میں نہ کسی سے مل سکتی ہوں، نہ کسی سے بات کر سکتی ہوں، زیان تم جلدی سے واپس آ جاؤ، میں آج بھی تمہارا انتظار کر رہی ہوں، میں تمہاری جدائی میں لمحہ لمحہ مر رہی ہوں، تمہاری واپسی کا ایک ایک دن گن رہی ہوں، میں آبلہ پائی کے اس سفر سے کبھی تھکوں گی نہیں، زیان، میں کبھی اپنے محور سے ہٹوں گی نہیں، تم اس یقین کے ساتھ لوٹ آنا، میں تمہاری راہ تک رہی ہوں، میں لمحہ لمحہ مر رہی ہوں اور کیا لکھوں؟ سمجھ نہیں پا رہی، بس زندگی و بال بنتی جا رہی ہے۔“ سلطان سے مزید درد و ہجر کی داستان پڑھنا محال تھا، اس کا فشار خون بلند ہونے لگا، اس نے بڑی مشکل سے خود کو سنبھالا تھا پھر موبائل آن کر کے زیان کا نمبر ملایا، یقیناً وہ اب تک اس کا نمبر ٹرائی کر کر کے پاگل ہو چکا تھا، اس کی کال دیکھ کر زیان کی جان میں جان آئی تھی، اس نے نمناک لہجے میں بڑی بے صبری سے کہا تھا۔

”یار! جلدی سنا، پھر تیری بیٹری دھوکہ نہ دے جائے۔“ اس کے لہجے میں واضح التجا تھی، سلطان کی بھنویں کھینچ گئی تھیں اور پھر اس نے

زیان کو خط پڑھ کر سنایا۔

”زیان! میں تمہاری راہ دیکھ دیکھ کر تھک چکی ہوں، تم نے کوئی رابطہ نہیں کیا، میں تم سے مایوس ہو چکی ہوں، اب پلیز مجھ سے کوئی رابطہ مت رکھنا، میری شادی ہو رہی ہے، اگر تم مجھ سے سچی محبت کرتے ہو تو پلیز مجھے بھول جاؤ، میری زندگی کو ڈسٹرب مت کرنا، یہ میری تم سے التجا ہے۔“ اس نے خط اپنے تئیں پڑھ کر سنا دیا تھا اور دوسری طرف زیان کا مارے صدمے کے دل بند ہونے لگا تھا، وہ کئی لمحے کچھ بول نہیں سکا تھا، پھر جب بولنے کے قابل ہوا تو اس کی ٹرپ سلطان کے کانوں میں پگھلا سیسہ اتار رہی تھی۔

”یہ ارسلہ نے لکھ کر بھیجا ہے؟ میں نہیں مان سکتا، ارسلہ میرے ساتھ اس طرح کیسے کر سکتی ہے، میرے ساتھ ارسلہ دھوکہ کیسے دے سکتی ہے۔“ زیان کا دل پھٹ رہا تھا، اس کی آواز پھٹ رہی تھی، سلطان نے خود اپنے کانوں سے سنا تھا، وہ اونچی آواز میں رو پڑا تھا اور اس کا رونا سلطان کے حواسوں کو جھنجھوڑ رہا تھا۔

فون بند ہو گیا مگر زیان کئی گھنٹے لگا تار روتا رہا، پھر وہ کئی دن بخار میں پتا رہا، تڑپتا رہا، روتا رہا، وہ حال سے بے حال ہوتا رہا اور دوسری طرف سلطان اپنی طرف سے زیان کا نام لکھ لکھ کر ارسلہ کو نامے بھیجتا رہا۔

زیان اس صدمے کو نہ سہہ سکا تھا اور ہسپتال جا پڑا تھا، جبکہ پیچھے سے سلطان نے کمان سنبھال لی تھی، وہ زیان کی طرف سے آخری خط ارسلہ کو بھیج کر مطمئن تھا، جس میں اس نے ارسلہ سے خوب معذرت کی تھی۔

”مجھے معاف کر دو ارسلہ، میں مجبور ہو گیا تھا، حالات سے تنگ آ چکا تھا، دو بتی میرے لئے پورب نہیں تھا جو میں راتوں رات امیر ہو جاتا،

میں مجبور یوں میں جکڑا گیا تھا، مجھ پر وقت بڑا تنگ تھا، میں جیل میں ایک ایکسیڈنٹ کی وجہ سے بھی رہا، یہاں پہ میری کسی نے مدد کی، وہ پاکستانی آدمی تھا، اس نے مجھے جیل سے نکلوایا، میری مدد کی، اس کی بیٹی سے میں ایک سال پہلے شادی کر چکا ہوں، میں اپنی زندگی میں مگن ہوں، پلیز تم مجھے معاف کر دو اور اپنی زندگی کی شروعات کر لو، میرا انتظار مت کرنا، میں کبھی لوٹ کر نہیں آؤں گا۔“

زیان کا یہ خط جب ارسلہ تک پہنچا تب ہی اس پہ بھی زیان جیسا خوف طاری ہو گیا تھا، اس کے پیروں تلے سے بھی زمین نکل گئی تھی، اس کے سر سے آسمان کھینچ گیا تھا، اس پہ قیامت کی گھڑی کاری تھی، صدمے کے اس بار نے ارسلہ کے حواس چھین لئے تھے، اس کے ساتھ کیا ہوا تھا؟ یہ کیسا ظلم ہوا تھا؟ یہ کیسا اندھیر ہوا تھا۔

تب ارسلہ کا زروس بریک ڈاؤن ہو گیا تھا، وہ موت کے دہانے پہ پہنچ گئی تھی، اس کی حالت زار نے اس کے بھائیوں کا دل نرم کر دیا تھا، اس کے ماں باپ کے دل بھی پسج گئے تھے، وہ اس کی زندگی کے لئے تنگ و دو کرتے ہسپتال میں اس کا نیم مردہ وجود لے کر بھاگ پڑے تھے۔

ارسلہ پہ قیامت طاری تھی، اس محبت نے ارسلہ سے کیسا حساب لیا تھا؟ اس محبت نے ارسلہ کو کیسا برباد کیا تھا؟ وہ اتنی گنہگار تھی جو اس قدر خوار ہو گئی تھی؟ وہ اتنی خطا کار تھی جو رسوا ہو گئی تھی؟ کیا محبت اتنا بڑا جرم تھی، جس کی سزا کے طور پر زیان نے اس کے گلے میں بے وفائی کا پھندا ڈال دیا تھا، اگر محبت جرم تھی تو ارسلہ ایسی ذلت کی حق دار تھی اور زندگی ارسلہ کے لئے زیان کے نام پر ختم ہو گئی تھی لیکن زندگی ختم کہاں ہوتی تھی؟

☆☆☆

انسان زندگی سے زیادہ جی نہیں سکتا اور موت سے پہلے مر نہیں سکتا، یوں ارسلہ ایک مرتبہ ہسپتال سے گھر تو آ گئی تھی، لیکن اس کے لئے زندگی ختم ہو چکی تھی، یا یوں کہنا چاہیے تھا، زندگی اس کے اندر مر چکی تھی۔

وہ زندہ تو تھی مگر مردوں سے بدتر تھی اور امی ابو چاہتے تھے، وہ پہلے کی طرح زندگی کی طرف لوٹ آئے، جب یہ قیامتیں بیت چکی تھیں تب بھائیوں کو بھی احساس ہو گیا، ان کے سخت رویوں نفرت اور بے جا ضد کی وجہ سے ارسلہ ان حالوں کو پہنچی تھی، ان کی انا پرستی اور نام نہاد غیرت نے ارسلہ کو اپنی ہی ذات کی قبر میں مقید کر لیا تھا۔

بھائی نادم بھی تھے اور پشیمان بھی، سو اپنی پشیمانی اور ضمیر کے بوجھ کو ہلکا کرنے کے لئے انہوں نے اپنے ماں باپ کو اجازت دے دی تھی۔

”آپ ارسلہ کی خوشی کو پورا کر دیں ابا، ہماری بہن کا انتخاب برا نہیں ہو سکتا، پھر جب قانون، شریعت اور اسلام اسے پسند کی اجازت دیتا ہے تو ہم کون منکر ہوتے ہیں، آپ ارسلہ کی خوشی کو مقدم جانیں، باقی ساری باتیں ثانوی حیثیت رکھتی ہیں۔“

بھائیوں کا فرمان ارسلہ تک بھی پہنچ گیا تھا، لیکن اب اسے ان باتوں کی ضرورت نہیں تھی، وہ ہر خوشی غمی احساس دکھ کرب سے بے نیاز ہو چکی تھی، اسے اب کسی محبت کی کسی تھپکی کی ضرورت نہیں تھی، وہ اپنے دل سے محبت نامی بولی کو اکھاڑ چکی تھی، اب کوئی محبت اسے اپنی طرف بھیجتی نہیں تھی، اس کا دل ہر احساس سے عاری ہو چکا تھا، اس کا دل مردہ ہو چکا تھا۔

اس لئے جب ماہ پارہ کی امی اپنے بیٹے سلطان کے لئے ارسلہ کا رشتہ لے کر آئیں تب

اس نے کوئی بھی اعتراض نہیں کیا تھا، اس نے ایک چپ کی ہکل میں خود کو لپیٹ لیا تھا، اس کے ماں باپ جو مرضی فیصلہ کرتے، چاہتے تو انکار کرتے، چاہتے تو اقرار کرتے۔

وہ تو ایک جیتا جاگتا مردہ وجود تھی، جس کے بے جان لاشے پہ سرخ لباس لپیٹ کر اسے سولہ سنگھار اور پورے جاہ جلال کے ساتھ جنازے کے بعد رخصت کر دیا جانا تھا اور اس کی رخصتی کا ان دنوں گھر میں اہتمام چل رہا تھا۔

☆☆☆

سلطان کے لئے ارسلہ کے گھر والوں کا اقرار اہم نہیں تھا، اس کے لئے سب سے بڑھ کر ارسلہ کا اقرار مقدم تھا، یعنی اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا تھا؟ جس کا مطلب تھا وہ زیان کی خود غرض محبت کو بھلا چکی تھی، وہ زیان کو بھول گئی تھی، اس کی محبت کو بھول گئی تھی، سلطان فتح کے نشے سے معمور تھا اور اپنی ذہانت کو داد دیئے بغیر نہیں رہتا تھا۔

ارسلہ نے زیان کی محبت کے سوکھے پھول اس کی لوح مزار پہ چڑھا دیئے تھے، زیان اب عمر بھر ان سوکھے پھولوں کی باس کو سینے سے لگائے پھرنا، ابھی وطن نہ لوٹا، اتنا تو سلطان جانتا ہی تھا، پھر اب تو ارسلہ اس کی زندگی میں آرہی تھی، وہ جلد اسے اپنی محبت کے شکنجے میں جکڑ لیتا، ارسلہ بھی بہت جلد ہر قسم کی تغیر کو ذہنی طور پر قبول کر لیتی، سلطان کو اعلیٰ ظرف جان کر عمر بھر اس کے سامنے سر جھکائے رکھتی، ابھی نگاہ اٹھا کر بات نہ کرتی، سلطان کا ہر طرف سے پلڑا بھاری تھا اور ان دنوں وہ ہواؤں میں اڑ رہا تھا، شاید یہی صورت حال شادی کے دن تک برقرار رہتی، مگر اس کی بہن پارو کے آتے ہی ماحول بدل گیا تھا۔ پارو کو ارسلہ اور سلطان کی شادی کی ذرہ بھر

لیا تھا، قدرت نے اسے موقع فراہم کیا تو وہ
 ارسلہ کے حصول کی ہر ممکن کوشش کرے گا، پھر
 اسے قدرت نے شاید آزمانے کے لئے ہی موقع
 فراہم کر دیا تھا، زیان کی کال کا آنا، زیان کی
 منت، درخواست اور پھر تجویز کو سن کر سلطان کو
 اپنی گیم بڑی آسان لگی تھی، وہ دونوں کی طرف
 سے جھوٹے نام لکھتا تھا، ایک ارسلہ کو بھجوا دیتا،
 ایک زیان کو پڑھ کر سنا دیتا تھا، ان دونوں کو ایک
 دوسرے سے بدگمان کر کے وہ ارسلہ کو حاصل
 کرنے کے لئے دل و جان سے تیار تھا، پارو کی
 شادی میں ہی اس نے ارسلہ کو دیکھ کر اپنی نیت
 بدل لی تھی، وہ اتنے عام سے زیان کے لئے
 کہاں بنی تھی؟ اس کے ساتھ تو سلطان کو ہونا
 چاہیے تھا، وہ ارسلہ کے حصول کی خاطر آخری حد
 تک جاسکتا تھا اور اس نے یہی کیا تھا، آخری حد
 تک گرا تھا اور اپنی ہی نظروں میں ذلیل ہو گیا
 تھا، قدرت نے موقع فراہم کر دیا تھا، اس کے
 جھوٹ کو سامنے لانے کا۔

اس کی مہندی کا فنکشن بڑی دھوم دھام کے
 ساتھ ہوا، گو کہ امی بھی اندر سے راضی نہیں تھیں،
 پھر بھی بیٹے کی خوشی کے لئے خوش نظر آرہی تھیں،
 لیکن پارو نے تسم کھا رکھی تھی، وہ ذرا بھی مسکرائے
 گی نہیں، نہ مسکرانے کا ڈھونگ رچائے گی، نہ
 خوش ہونے کا سوانگ بھرے گی، اس کی بہن اتنی
 اصول پرست تھی نہیں، لیکن زیان اور ارسلہ کی
 خاطر جانے کیوں بن چکی تھی۔

وہ بھی اپنی شادی ہو جانے تک صبر کر رہا
 تھا، کیونکہ شادی تک فی الحال پارو کو برداشت کرنا
 اس کی مجبوری تھی، گو کہ وہ آتے جاتے اسے
 کچھ دینے سے باز نہیں آئی تھی لیکن سلطان
 اس کی سیلی پاتیں سہنے پر مجبور تھا، ایک مرتبہ اسے
 ارسلہ مل جانی، پھر بات پھلتی بھی تو سلطان کو کوئی

خوشی نہیں تھی، وہ اپنی ماں سے بھی لڑ چکی تھی اور
 بھائی سے بھی، وہ ارسلہ اور زیان کی محبت کو جانتی
 تھی، ان کی گواہی دیتی تھی، اسے زیان کی بات
 من گھڑت لگتی تھی اور اس کا جھوٹ کسی طرح سے
 ہضم نہیں ہوتا تھا، وہ سلطان کی سنائی کہانی پر
 شدید تعجب کا شکار تھی، وہ زیان کی محبت اور
 ارادوں کی پائیداری، مضبوطی، استحکام، پختگی سے
 واقف نہ ہوتی تب سلطان کی من گھڑت پہ یقین
 کر لیتی، اسے اپنے بھائی پر ذرا بھی یقین نہیں تھا،
 اسے لگ رہا تھا جیسے کچھ منگ ہے کیا منگ تھا یہ
 تو وقت ہی بتاتا، ادھر سلطان اس سے لڑتا تھا،
 بات بہ بات طعنے مارتا تھا۔

”تمہیں اپنی بکو اس سے فرصت نہیں، تم
 واحد بہن ہو جسے اپنے بھائی کی شادی کا کوئی چاؤ
 نہیں ہے۔“

”چاؤ تو بہت تھا، اگر تم اس طرح دھاندلی
 سے شادی نہ رچاتے۔“ پارو کے دو بدو جواب
 نے سلطان کو مند بند کرنے پہ مجبور کر دیا تھا، وہ
 نگاہ چراٹا بھاگ نکلا، تو کیا پارو سب کچھ جان گئی
 تھی۔

سلطان کے لئے یہ صورت حال بہت
 پریشان کن تھی، اس کی بہن اپنی سہیلی سے بہت
 تخلص تھی، اگر اس نے ارسلہ کو کچھ بتا دیا تو
 سلطان کا بچنا محال تھا، وہ شدید ڈپر سید ہو چکا
 تھا۔

☆☆☆

اپنی بہن پارو کی شادی میں ارسلہ کے حسن
 جمال کی فراوانی کو دیکھ کر سلطان اپنا دل ہار بیٹھا
 تھا، اسے اس عام سے زیان پر بڑا رشک آتا تھا،
 کیا تھا اس غریب اور مفلس زیان میں، جو یہ اتنی
 عالیشان خوبصورت شہزادیوں کا سار کھنے والی اس
 کے عشق میں گرفتار تھی، سلطان نے تب ہی سوچ

پردہ نہیں تھی، ارسلہ نے اس کے پاس ہی رہنا تھا، کہیں جانا تو نہیں تھا۔

یوں بارات والی شام بھی آنگن میں اتر آئی تھی، اس دن ماہ پارہ خاصی پر اسرار لگ رہی تھی، یہی نہیں اس کے والدین بھی کچھ مشکوک نظر آ رہے تھے، سلطان نے کوئی توجہ نہیں دی، وہ چوری چوری کسی سے رابطوں میں مصروف تھے، سلطان چونکا تو تھا مگر خاطر میں نہیں لایا۔

یوں بارات روانہ ہو کر ارسلہ کے گھر میں پہنچ گئی، ان کی طرف سے زیادہ لوگ نہیں تھے اور نہ ہی ارسلہ کی طرف سے زیادہ مہمان تھے۔

جب یہ لوگ ارسلہ کے گھر ڈرائنگ روم میں پہنچے تو وہاں صورت حال بڑی عجیب تھی، ایک سفر سے تھکا ہارا مہمان نظر آیا، جو مولوی صاحب سے مل رہا تھا، یوں لگا جیسے کچھ لمحے پہلے ہی ایجاب و قبول کی رسم ادا کی گئی ہے، سلطان کے لئے یہ منظر انتہائی خوف زدہ کر دینے والا تھا، وہ تھکا ہارا جوان اب سب سے گلے مل کر مبارکیں وصول کر رہا تھا اور ارسلہ کے بھائی اسے بڑی محبت کے ساتھ مل رہے تھے، جیسے ہی اس جوان کا چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے آیا، سلطان یہ ساتوں آسمان آن گرے تھے، اسے لگا جیسے اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا ہے، یا اس کا دماغ گول گول چکر کھا رہا ہے، یا پھر پوری شادی کا اچانک سیٹ بدل گیا ہے۔

حتیٰ کہ اس کی والدین اور بہن تک مہمان سے بڑی جوش و خروش سے مل رہے تھے، امی اسے مبارک باد دے رہی تھیں، اس کا شانہ تھک رہی تھیں، سلطان سے یہ منظر دیکھنا محال ہو گیا تھا، اس کے صبر، ضبط اور برداشت کا انت ہو چکا تھا، قریب تھا کہ وہ غم و غصے اور تذلیل کے احساس سے بے حال پھٹ پڑتا اور یہاں کری

ایٹ ہونے والے سین پہ ایک قیامت کھڑی کر دیتا۔

معاودہ مہمان اپنا رخ موڑ کر سیدھا سلطان کے قریب آیا تھا، پھر وہ سلطان کے سامنے تن کر کھڑا ہو گیا اور وہ زیان کو اپنے سامنے کھڑا دیکھ کر پتھر میں ڈھل گیا تھا، پھر اس کی سماعتوں نے زیان کی آواز سنی تھی، وہ اس کے کانوں میں نیزے چبھور ہا تھا۔

”بہت خوب، تو میرے دوست، تم نے آستین میں آرام فرما کر بالآخر مجھے ڈس لیا، میرے ساتھ اتنا بڑا کھیل کھیلنا، میرے ساتھ ڈرامہ کیا، میرے ساتھ دھوکا کیا، اپنے نفس کے غلام بن کر بدعتی کے مرتکب ہوئے، مجھے موت کے پروانے بھجوا کر خود یہاں شادیاں بجانے کی تیاریوں میں لگ گے، مجھے یقین نہیں آتا، تم میرے ساتھ ایسا بھی کر سکتے ہوں، پہلے ارسلہ پہ الزام لگا کر اسے عاطف کی نظروں میں ہلکا کیا، وہ تم ہی تھے نا جس نے عاطف بھائی کو میرے اور ارسلہ کے تعلق کا بتا کر ارسلہ پہ زندگی کے دروازے بند کر دائے تھے، وہ تم ہی تھے نا جس نے ارسلہ کو میرے خلاف بھڑکایا، جھوٹے نامے لکھے، مجھ سے بدگمان کیا اور مجھے ارسلہ سے متنفر کر کے دور کر دیا، اس سارے کھیل کا مقصد تمہارا اپنا الو سیدھا کرنا تھا، لیکن یہاں یہ معاملہ ہی الگ ہو گیا، تمہارا کھیل چوہٹ ہو گیا، تمہاری بساط الٹی گئی، تم منہ کے بل گر پڑے، تمہارے اس دھوکے کے بدلے مجھے اور ارسلہ کو جو اذیت سہنا پڑی، جس کرب جس درد جس تکلیف سے ہم گزر رہے ہیں، دل تو نہیں کرتا تمہیں معاف کروں، مگر اپنی اس بہن کے صدقے میں تمہارے اس جرم کو سرعام معاف کرتا ہوں، جو تم نے ہمارے ساتھ کیا، وہ آج پالیا، خالی ہاتھ بے

مراد اور تا کام لوٹ رہے ہو، تمہاری سزا بس یہی ہے، اپنی ہی نظروں میں ذلیل ہو چکے ہو، ارسلہ بھی تمہارا کھیل جان چکی ہے اور ارسلہ کی فیملی بھی، باقی سب مزید جان جائیں گے اور میں تمہیں اس تماشے سے محفوظ رکھتا، تمہیں یہاں سے خوار ہو کر جانا نہ پڑتا، تمہیں آج صبح ہی بتا دیا جاتا کہ ہمارا نکاح ہو چکا ہے، ابھی تو محض کاغذی کارروائی کی گئی ہے، لیکن سب کا خصوصاً تمہارے والدین کا خیال تھا کہ تمہیں یہاں بلا کر بتانا بہت ضروری تھا، اس لئے کہ تماشا دیکھنے والوں کو جب اپنا تماشا دکھانا پڑتا ہے تو ان پہ کیا گزرتی ہے، سو تم بھی انجوائے کرو اور دوسروں کو بھی انجوائے کرنے کا موقع دو، یہ تو میری بہن ماہ پارہ کا مجھ پہ احسان ہے، جس نے مجھے ساری حقیقت بتا کر فوراً پاکستان آنے کا مشورہ دیا تھا، ورنہ میرا ٹائی ٹینک تو تم ڈبو ہی چکے تھے، دوست کے لبادے میں جیسے کھلے دشمن، تم نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا، پھر بھی اعلیٰ ظرفی کا ثبوت دیتا ہوں اور تمہیں معاف کرتا ہوں۔“

زیان کے الفاظ سلطان کے پھر وجود کو پانی پانی کر گئے تھے، اس کی حقیقت کھل گئی تھی، ہر کوئی اسے ملامت کر رہا تھا، وہ انتہائی شرمسار اور پشیمان تھا، اسی لئے سر جھکا کر شرمندہ شرمندہ منظر سے غائب ہو گیا، جب وہ جا رہا تھا تو اس کی چال بڑی غیر ہموار اور شکستہ تھی، کیونکہ دھوکے بازوں کی چال ان پہ الٹی جا چکی تھی۔

سلطان کے منظر سے ہٹتے ہی ماحول بدل گیا تھا اور ایک مرتبہ پھر رنگ و نور کی محفل سج گئی تھی، زیان بھی اس محفل کا حصہ بن چکا تھا، کیونکہ یادباں کھل چکے تھے، کبر چھٹ گی، دھند ہٹ چکی تھی، بدگمانیوں کے جالے اتر چکے تھے۔

☆☆☆

اور آج ان کی شب زفاف تھی، انتہائی کڑے مراحل اور صبر آزما انتظار کے بعد ملن کی گھڑیاں قریب تر تھیں، دونوں کے جذبات ایک سے تھے، دونوں کے دل درد و غم اور جدائیوں کے بارسہ سہہ کر پکھل رہے تھے، دونوں ہی اپنی اپنی روداد ہجر سنانے کے لئے محل رہے تھے، زیان کے لئے آج کی مبارک رات کامل جانا اتنا آسان نہیں تھا۔

اس دن جب سلطان نے ارسلہ کا خط اسے پڑھ کر سنایا تھا تب وہ ایک دم صدمے کی شدت سے نڈھال ہو گیا، یہ وار بہت کاری تھا، بڑا گہرا تھا، زیان کو سنبھلنے کے لئے بڑا وقت درکار تھا، پھر وہ غم کی شدت سے بیمار پڑ گیا، اسے ہسپتال داخل ہونا پڑا تھا، وہ کتنے ہی دن خود سے بیگانہ رہا تھا، اس کا زندگی سے رشتوں سے محبتوں سے اعتماد اٹھ گیا تھا، اسے خود سے ہر چیز سے اپنی کامیابیوں سے نفرت ہو گئی تھی، وہ ارسلہ کی بے وفائی کے بعد قریب تھا کہ خودکشی کا فیصلہ کر لیتا جب اچانک اسے ماہ پارہ سے بات کرنے کا خیال آ گیا تھا۔

ایک لمبے عرصے کے بعد اس نے آنٹی سے نمبر لے کر ماہ پارہ سے بات کی تھی اور اس نے جو کچھ اسے بتایا وہ انتہائی حیران کن تھا، پارو نے اسے بتایا، وہ اپنے سسرال میں تھی، سلطان نے اسے کوئی خط نہیں دیا تھا جسے وہ ارسلہ کو دیتی، سلطان اپنی طرف سے من گھڑت قصے سن رہا تھا، پارو نے ہی اسے بتایا تھا، یہ ساری چال سلطان کی تھی، وہ اسے رستے سے ہٹا کر اپنا رشتہ ارسلہ کے لئے بھجوا چکا تھا اور اب شادی کی تیاریاں چل رہی تھیں، اگر اسے اپنی محبت بچانا تھی تو وہ فوراً واپس پلٹ آئے اور زیان نے ایک دن بھی ضائع کیے بغیر واپس لوٹ آیا۔

یہاں اس کے آنے سے پہلے ہی پارو اور آنٹی نے ارسلہ کی پوری فیملی کو ہر سچائی بتا دی تھی، یوں زیان کو کسی کی سوالیہ نظر کو سہنا نہیں پڑا تھا، ارسلہ کے امی ابو جہاں سلطان کے دھوکے سے خفا تھے وہیں زیان کے واپس آ جانے سے خدا کے بہت مشکور تھے، جس کی وجہ سے ان کی بیٹی کی زندگی میں بہاریں دستک دینے لگی تھیں۔

ارسلہ کے امی ابو نے ایک لمبے عرصے بعد اپنی بیٹی کو اتنا شاد دیکھا تھا سو وہ مطمئن اور مسرور کیوں نہ ہوتے ان کی بیٹی بالآخر اتنے درد و کرب سہنے کے بعد زندگی کی حقیقی خوشیوں کو پا گئی تھی، ان کی سچی خالص صاف شفاف محبت کو خدا نے تکمیل کے مراحل سے گزار دیا تھا۔

☆☆☆

اور آج تاروں بھرا آسمان بھی ان کے ملن پہ خوشی سے مسرور تھا اور اندر شب زفاف مسکرا رہی تھی، جبکہ ارسلہ کے آنسو ایک تو اتر سے گرتے تھے اور زیان ان کو چٹا بے ساختہ بوکھلاہٹ کا شکار تھا اور وہ بار بار ایک ہی بات دوہرا رہی تھی۔
”ہم تب کیوں نہیں ملے زیان؟“ جب وہ سارا کرب، سارا درد، ہجر کا ایک ایک دکھ اسے کھول کھول کر بتا چکی تھی، زیان نے نرمی، محبت اور ملائمت سے اس کا ایک ایک آنسو اپنی پوروں پہ چن لیا تھا، وہ اسے اپنی محبت، چاہت اور اعتماد سے شانت کر رہا تھا، اسے سکون اور طمانیت بخش رہا تھا، یوں کہ ارسلہ کے جلتے جلتے دل کو قرار آنے لگا تھا، اس کے آنسو تھمنے لگے تھے، اس کے دل میں سکون اترنے لگا تھا۔

”ہمیں اب ہی ملنا تھا میری جان، کہ لکھا ہوا کبھی مٹا نہیں، ہونے والا کبھی ٹلنا نہیں۔“
زیان نے اس کا کپکپاتا ہاتھ تھام کر نرمی سے دبایا تھا، ارسلہ کے دل میں سکون بوندوں کی طرح

گرنے لگا تھا۔

”اور سلطان نے کیا کیا؟ مجھے یقین نہیں آتا۔“ وہ سلطان کا قصہ چھیڑنا چاہتی ہی تھی جب زیان نے بے ساختہ اس کے لبوں پر ہاتھ رکھ کر روک لیا۔

”تاریخ سلطان پہ کسی اور روز روشنی ڈال لیں گے، فی الحال تم مجھ پہ توجہ کرو۔“ زیان نے نرمی سے اسے موضوع سے ہٹایا تو ارسلہ کے ہونٹوں پر حیا، آلود تبسم پھیل گیا تھا۔

”تمہاری کہانی بھی سننے کے لئے عمر پڑی ہے، چلو پہلے نوافل ادا کر لیں۔“ ارسلہ اس کی بڑھتی پیش قدمی پہ بندھ باندھتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھی تو زیان بھی بے ساختہ حواس باختہ سا اٹھ گیا تھا۔

”تم نے کیا منت مانی تھی؟“ وہ مری مری آواز میں پوچھ رہا تھا۔
”ہاں پورے سونفل کی، اپنے اور تمہارے ملن کے لئے، پچاس تم بڑھو گے پچاس میں۔“ ارسلہ اپنی جگہ سے اٹھ چلی تھی، اب وضو کرنے واش روم جا رہی تھی، جبکہ زیان سر پہ ہاتھ مار کر گہرا سانس کھینچتا اس کی تھلید میں اٹھ کھڑا ہوا تھا، پھر اس کا بازو پکڑ کر بے ساختہ بولا۔

”منت تو کل بھی پوری کی جاسکتی ہے، آج کے دن پورا کرنی ضروری تو نہیں نا؟“ اس کی چمکتی آنکھوں میں شرارت دیکھ کر ارسلہ بے ساختہ ہنسی تو پھر ہنستی چلی گئی تھی، باہر تاروں بھری رات بھی ان کے ملن پہ مسکراتی رہی تھی۔

☆☆☆

اسرارِ چاندنی

سعدیہ عابد

”نہیں، کہ آپ جا سکتی ہوئیں تو ہم جانے دیتے یوں آپ کو ہم سے بحث نہیں کرنا پڑتی، یہ جاننے کے باوجود کہ ہمیں بحث پسند نہیں ہے۔“ وہ قدرے ناگواری سے کہہ رہے تھے۔

”ہم بحث نہیں کر رہے خدیج، کہ بس ہم تو یہی چاہتے ہیں کہ آپ ہمیں جانے کی اجازت دے دیں۔“ وہ کرسی کھسکا کر اٹھ گئے تھے مگر اس کی اگلی بات نے ان کے قدم روکے تھے اور وہ اس کے بھیکے چہرے کو دیکھنے لگی تھی۔

”ہم مناسب نہیں سمجھتے اگر مناسب سمجھتے تو اجازت دے دیتے اس لئے بہتر ہوگا کہ یہ ذکر آپ دوبارہ نہ کریں۔“ وہ بات مکمل کر کے نکل گئے تھے جبکہ اس کے آنسوؤں میں روانی آگئی تھی۔

”اماں بی! خدیج کی کڑی نگاہیں، سخت لہجہ اور بے جا پابندیاں کسی دن ہماری جان لے لیں

”خدیج! پلیز جانے دیجئے ناں۔“ وہ لجاجت سے بولی تھی لیکن ان کی تیز نظر سے خائف ہوتی مزید کچھ نہ کہہ سکی تھی اور بے تو جہی سے پلیٹ میں چمچہ گھمانے لگی تھی۔

”وہ! کھانا کھائیے۔“ وہ اس کی بے تو جہی محسوس کرتے ہوئے اسے ٹوک گئے تھے۔

”ہمیں بھوک نہیں ہے۔“ ان کے کہنے کا الٹا ہی اثر ہوا تھا اور اس نے پلیٹ ہی کھسکا دی تھی۔

”آپ سے پہلے بھی کئی بار کہہ چکے ہیں کہ ناراضگی کا اظہار کھانے کے سامنے بیٹھ کر نہ کیا کریں۔“ ان کے لہجے کی درشتگی اس کی آنکھیں نم کر گئی تھیں۔

”ہشینا! ہماری دوست ہیں خدیج اور ہم کیا اپنی دوست کی سالگرہ تک میں نہیں جا سکتے۔“ بھیکے لہجے میں واضح شکوہ کیا گیا تھا۔

مکمل ناول





گی۔“ وہ اماں بی کا ہاتھ اپنے کاندھے سے ہٹاتی روتے ہوئے بولی تھی۔

”بیٹا! خیر کی بات منہ سے نکالتے ہیں۔“ وہ تاسف سے بولی تھیں کہ اس کا رونا ان کو تکلیف دے رہا تھا۔

”دیکھ لیجئے گا، ایسا ہی ہو گا۔“ وہ غصہ میں وثوق سے کہتی انہیں پریشان چھوڑ کر نکلتی چلی گئی تھی۔

☆☆☆

”وہی! نے کھانا کھالیا؟“ اماں بی کے ہاتھ سے چائے کا گلاس لیتے ہوئے پوچھا تھا۔

”آپ کو شش تو کرتیں اماں بی۔“ ان کا ناں میں جواب انہیں مضطرب کر گیا تھا۔

”کی تھی خدمت جی بابا! لیکن بیٹا دودھ تک لینے کے لئے راضی نہ ہوئیں کہ وہ تو اس وقت سے بس روئے جا رہی ہیں۔“ اماں بی کی بتائی ہوئی تفصیل ان کے اضطراب کو کئی گنا بڑھا گئی تھی۔

”آپ کھانا گرم کر کے وہی کے لئے لے کر چلیے، ہم آرہے ہیں۔“ چائے کا گلاس ٹیبل پر منتقل کیا اور لیپ ٹاپ سائیڈ میں کرتے بیڈ سے اتر گئے۔

”وہی! ہم آپ کو ایسی جگہ جانے نہیں دے سکتے جہاں سب آپ کے لئے اجنبی ہوں گے۔“ وہ رائٹنگ ٹیبل کے ساتھ لگی چیر کھسکا کر بیٹھتے انتہائی نرم لہجے میں بولے تھے کہ وہ کافی زیادہ رو چکی تھی اس کا چہرہ متورم اور آنکھیں سرخی مائل ہو رہی تھیں اور اسے یوں دیکھنا ان کے لئے ہمیشہ ہی تکلیف کا باعث ہوتا تھا اس وقت بھی وہ دکھ تاسف میں مبتلا ہو گئے تھے۔

”ہمارے لئے تو پورا ہی جہان اجنبی ہے۔“ اس کی غیر متوقع بات پر ان کی آنکھوں میں آنسو آتا تھا۔

”اور ہم ساری عمر لوگوں کی بھیڑ و دنیا کے میلے میں بھی ہر ایک کے لئے اجنبی ہی رہیں گے کہ اجنبیت کی دیواریں میل ملاپ سے گرتی ہیں اور آپ کی قید میں رہ کر یہ ممکن نہیں کہ ہم لوگوں سے مل کر اجنبیت دور کریں، روابط و شناسیاں بڑھائیں۔“ وہ دونوں ہی بے اختیار سا اسے دیکھنے لگے تھے کہ اس کے الفاظ ہی انہیں لہجہ بھی نظر انداز کرنے والا نہ تھا وہ بھی اس صورت میں کہ شکوہ اس کے لبوں سے پہلی دفعہ ادا ہوا تھا اور چہرے پر بدگمانی کی لکیریں سی بنیں تھیں۔

”آپ کہنا کیا چاہتی ہیں؟“ اندر کی ابھرنے لہجے سے قدرے عیاں ہو گئی تھی۔

”وہی جو آپ سمجھنا نہیں چاہتے۔“ ناراضگی سے ان کے خوب رو چہرے کو دیکھا تھا۔

”آپ سمجھا میں گی تو ہم سمجھ جائیں گے، کہیے جو کہنا ہے۔“ وہ سنجیدگی سے بولے تھے۔

”ہم نے کبھی کوئی ضد تو کیا کبھی کوئی فرمائش تک نہیں کی، آپ نے جیسے کہا ویسے کرتے چلے گئے۔“ وہ سوس سوس کرتے کہہ رہی تھی وہ بے یقینی سے اسے دیکھ رہے تھے۔

”مگر اب ہم کوئی چھوٹی بچی تو نہیں رہے ناں کہ آپ ہمیں اپنی انگلی کے اشارے پر چلاتے رہیں، ہم بڑے ہو گئے ہیں آپ اب تو ہمیں کم از کم اتنی آزادی تو دیں کہ ہم کچھ کہہ سکیں، دوست کے گھر جا سکیں۔“ وہ مزید کہتی کہ ان کی تیز نظر سے خائف ہوتی چپ کر گئی تھی اور وہ کچھ کہے بغیر بڑی تیزی سے وہاں سے نکل گئے تھے جبکہ اماں بی کچھ سوچنے لگی تھیں۔

☆☆☆

”آپ سچ کہہ رہے ہیں خدمت جی! ہم واقعی اپنی دوست کی برتھ ڈے پارٹی میں جا سکتے ہیں۔“ انہوں نے اسے اجازت کیا دی تھی بے

یقین کر ڈالا تھا مگر انہوں نے سنجیدگی سے اپنی بات دہرائی تھی اور اس کا چہرہ کھل اٹھا تھا۔

”تھینک یو سو ویری مچ۔“ وہ بچوں کی طرح ہرجوش سی بولی تھی اور وہ اس کو مسرور پا کر بے اطمینانی کے باوجود مسکرا دیئے تھے کہ ان کے لئے اس کی خوشی بہت معنی رکھتی تھی۔

”جب جانا ہو بتا دیجئے گا آپ کو اور اماں بی کو ہم چھوڑ آئیں گے۔“ سنجیدگی سے کہتے صوفے کی جانب بڑھے تھے کہ اس کی اگلی بات پر رک کر اسے دیکھنے لگے تھے۔

”ہمیں کل جانا ہے خدیج! بٹ ہمیں شینا کے لئے گفٹ بھی تو چاہیے ہو گا۔“ اس کی خوشی اس کے من موہنے شہابی رنگت والے چہرے سے ٹپکی جا رہی تھی کہ انہوں نے اسے ایک غیر متوقع آفر کر دی تھی اس کی ساگری آنکھوں میں بے یقینی اتری تھی اور انہوں نے گویا مسکرا کر اپنے فیصلے کی توثیق کی تھی وہ بے انتہا خوشی کے احساس میں گھرتی ان سے لپٹ گئی تھی۔

”تھینک یو سو مچ خدیج! آپ بہت اچھے ہیں۔“ اس کا لہجہ اس کی اندرونی مسرت سے کھنک رہا تھا جبکہ وہ اس کی حرکت پر لمحہ بھر کو ساکت ہوئے تھے اور دوسرے ہی پل اسے ایک جھٹکے سے خود سے دور دھکیل گئے تھے۔

”بی ہو یو سیلف ہو ینا بخاری۔“ وہ چٹختے لہجے میں درشتگی سے بولے تھے وہ ساکت سی انہیں نم پلکوں سے دیکھنے لگی تھی جو اچانک ہی بہت اجنبی بن گئے تھے۔

”اپنے جذبات، اپنے احساسات کو قابو میں رکھنا سیکھیے ہو ینا کہ آپ بچی نہیں رہیں۔“ ان کا بری طرح جھٹکنا، بری طرح ڈپٹنا اس کی حساس طبیعت پر چوٹ لگا گیا تھا، آنسو گرنے لگے تھے اور وہ شرمندگی سے منمنائی تھی۔

”سوری۔“ لیکن وہ اس کی معذرت سننے کو رکے نہیں بڑی تیزی سے ہال کمرہ عبور کر گئے تھے۔

☆☆☆

”ونی! ہم آپ سے معذرت چاہتے ہیں، ہمیں کل رات آپ کو اس بری طرح نہیں ڈانٹنا چاہیے تھا۔“ رات بھر رونے اور جاگنے کے سبب وہ بخار میں مبتلا ہو گئی تھی اور اس کی سوچی آنکھیں دیکھ وہ تمام غصہ ہی بھلا بیٹھے تھے اور معافی طلب کرنے میں بھی دیر نہیں کی تھی۔

”ہمیں آپ کی معافی کی ضرورت نہیں ہے کہ آپ کے رویے سے ہی ہم بہت کچھ سمجھ گئے ہیں، بہت برے لگتے ہیں ناں ہم آپ کو، تو برا اس خدیج اب ہم چھٹیوں میں بھی ہاسٹل سے گھر نہیں آیا کریں گے۔“ اس کی آنکھوں کی سطح کیلی ہو گئی تھیں جبکہ لہجہ ناراضگی و غصہ کا مظہر تھا۔

”ایسا کچھ نہیں ہے ونی بیٹا! آپ اس طرح کیوں کہہ رہی ہیں۔“ اماں بی گداز دل کے ساتھ بیڈ پر اس کے برابر ٹپک گئی تھیں۔

”ایسا ہی ہے اماں بی، کہ ہم خدیج کے لئے بوجھ بن گئے ہیں، یہ ہم سے پہلے کی طرح نرمی سے بات نہیں کرتے، ہر وقت ڈانٹتے، غصہ کرتے رہتے ہیں ہم نہ ان کے سامنے آئیں گے اور نہ ہی انہیں ہمیں دیکھ کر غصہ آئے گا، اس لئے ہم آج ہی ہاسٹل واپس چلے جائیں گے۔“ وہ جیسے سارے فیصلے از خود لے چکی تھی۔

”فضول بات کرنے کی ہرگز ضرورت نہیں ہے کہ ہم آپ کو آپ کی غلطی پر سرزنش کرنے کا مکمل حق رکھتے ہیں اور رات آپ کو اسی لئے ڈانٹا کہ آپ ہمیں غلطی پر لگی تھیں۔“ وہ گہری سنجیدگی سے اسے مزید کچھ کہنے سے ٹوک گئے تھے۔

”اور یاد رکھیے گا کہ ہم آپ کی آزادی کے

احترام میں مٹھیاں بھینچے غصہ ضبط کرنے پر مجبور تھے۔

”خدیج بابا! آپ ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچ کر دیکھیں یہ ایک دم درست فیصلہ ہوگا۔“ وہ اب بھی نرمی سے ہی بولی تھیں۔

”کیا ہو گیا ہے آپ کو اماں بی، ایک دفعہ کہہ دیا ہم نے کہ ایسا ممکن ہی نہیں ہے تو آپ کیوں خاموش نہیں ہو جاتیں۔“ وہ غصہ سے بھڑک کر بولے تھے وہ بے یقینی سے انہیں دیکھنے لگی تھیں اور ان کے بوڑھے چہرے پر پھیلے تاریک سائے خدیج بخاری کے اعصاب ڈھیلے پڑتے چلے گئے تھے۔

”آئی ایم سوری اماں بی!“ وہ نہایت شرمندگی سے معذرت طلب کر رہے تھے۔

”معاف تو بابا آپ ہمیں کر دیں کہ ہمیں آپ سے اتنی بڑی بات کہنی ہی نہیں چاہیے تھی، گھر کی ملازمہ ہیں مگر اپنی حیثیت ہی بھول گئے تھے۔“ ان کے آنسو گرنے لگے تھے۔

”خدارا اماں بی ایسے نہ کہیں، آپ کو اماں بی صرف زبان سے کہا ہی نہیں ہے ہم آپ کو ایک ماں کا درجہ دیتے ہیں۔“ وہ ان کے سامنے آتے ان کے ہاتھ تھام گئے تھے۔

”آپ سے اس طرح بات نہیں کرنا چاہتے تھے مگر آپ کی بات پر ضبط کھو بیٹھے کہ دنی ہمارے لئے بہت قابل احترام ہیں ہم ایسا سوچ بھی نہیں سکتے اماں بی، آپ کے احترام میں بھی آپ کے فیصلے کا احترام نہیں کر سکتے۔“ وہ اماں بی کے سامنے سے نکلتے چلے گئے تھے۔

☆☆☆

”آپ ہی بتائیے ناں خدیج کہ ہم شینا کے لئے آخر کیا لیں؟ کہ ہمیں تو کچھ سمجھ ہی نہیں آ رہا۔“ وہ پہلی دفعہ شاپنگ مال آئی تھی اور اسی لحاظ

خلاف نہ ہوتے ہوئے بھی بہت چاہ کر بھی آپ کو آزادی نہیں دے سکتے کیونکہ آپ ہماری ذمہ داری ہیں اور اسی لئے آپ کی بہتری کے خیال سے آپ کے لئے چند اصولوں و ضوابط مقرر کیے ہیں کہ آپ کو کہیں بھی آنے جانے کی اجازت نہیں دے سکتے آپ ہماری فکر کو غلط معنی پہناتیں تو یہ آپ کی غلطی ہے کہ آپ کی ناراضگی کے ڈر سے ہم اپنے اصول اور فکر کے زاویے نہیں بدل سکتے۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں اپنا موقف بیان کرنے کے بعد اس کی بات یا موقف سننے کو رکے تک نہیں تھے اور وہ روتے ہوئے اماں بی سے ہزار شکوے کرنے لگی تھی اور وہ سمجھتی تھیں کہ اس کی بات پر شکوہ اتنا بھی بے معنی نہیں مگر وہ یہ خدیج بخاری کو نہیں سمجھا سکتی تھیں کہ وہ اپنے ہی خول میں سٹے ایک خاموش طبیعت انسان تھے اور ان سے کچھ کہنے کی ان کی ہمت نہیں پڑتی تھی مگر کب تک وہ اپنے ذہن و دل کی بات و خواہش کو دبائے رکھتیں؟ ہو یا بخاری کی باتیں سن کر وہ خدیج بخاری سے بات کرنے کا فیصلہ کر چکیں تھیں۔

☆☆☆

”یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں اماں بی۔“ وہ بتول بی کی بات سن کر بیٹھے سے کھڑے ہو گئے تھے ان کی آنکھوں میں بے یقینی اور لہجے میں لڑکھڑاہٹ سی تھی۔

”ایسا کچھ غلط نہیں کہا ہم نے کہ یقین کریں خدیجہ بیٹا حیات ہوتیں تو وہ بھی یہی فیصلہ لیتیں۔“ وہ ان کی حالت نظر انداز کے اپنی بات پر زور ڈالنے کو ان کی ماں کا حوالہ دے گئی تھیں۔

”اماں بی! مت کہیں ایسا کچھ کہ ہم خود پر ضبط کھودیں کہ دنی کے لئے ہم اس انداز سے سوچنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔“ وہ اماں بی کے

”اماں بی! آج ہم بہت خوش ہیں، دنیا اتنی خوبصورت ہے یہ احساس آج ہوا ہے ہمیں۔“ وہ اماں بی کے کاندھے تھامے کھٹکتے لہجے میں بول رہی تھی۔

”آج ہم نے بہت زیادہ انجوائے کیا اور ہم نے خد تاج کی آج اچھی خاصی جیب خالی کروا دی ہے۔“ وہ دھیمے سے ہنسی تھی ان دونوں نے ہی اس کی دائمی خوشیوں کی دعا دل ہی دل میں ڈالی تھی۔

”اچھی خاصی کیا مطلب؟“

”اماں بی! آپ کی دلی بیٹیا نے پورے اسی ہزار کی شاپنگ کی ہے ہمیں کنگال کر دیا ہے۔“ آج انہوں نے اس کا بہت پیارا روپ دیکھا تھا اور اس کی خوشی کو قائم رکھنے اور بڑھانے کو شرارت کا مظاہرہ کر گئے تھے۔

”ہم جانتے ہیں آپ اتنے غریب نہیں ہیں کہ اسی ہزار میں ہی کنگال ہو جائیں۔“ وہ اماں بی کے سامنے سے ہتی یقین سے کہتی صوفے پر بیٹھ گئی تھی، اماں بی اور وہ مسکرا دیئے تھے، اماں بی کو یہ سب بہت اچھا لگ رہا تھا اور ان کی خواہش انہیں ستانے لگی تھی مگر ان کے رات کے رد عمل کے ذہن میں آتے ہی وہ اپنا دل محسوس کر رہ گئی تھی۔

”وہ تو ہم کچھ تھک گئے تھے اس لئے صرف اسی ہزار کی شاپنگ کی ورنہ ہمارے ارادے تو آج بڑے ہی خطرناک تھے۔“ وہ مزے سے ڈرانے والے انداز میں کہہ رہی تھی اور اپنی شرارت پر خود ہی کھلکھلائی تھی ان دونوں نے ہی اس کے چہرے سے نگاہ ہٹائی تھی کہ مبادا ان میں سے کسی کی نظر نہ لگ جائے، اماں بی کچن میں جانے لگی تھیں مگر اس کے بلانے پر صوفے پر آ

سے پر جوش بھی مگر ساتھ ہی نروس بھی ہو رہی تھی ایک ایک چیز کو بچوں کی طرح اشتیاق سے دیکھ رہی تھی انہوں نے اس کے بے حد سس چہرے پر جوش اور بوکھلاہٹ کا حسین امتزاج دیکھا تھا اور اس کو گائیڈ کرنے لگے تھے اور ان کی ہی مدد سے اس نے نہ صرف شینا کے لئے بلکہ اپنے اور اماں بی کے لئے بھی کافی کچھ خرید لیا تھا۔

”سوچ کیا رہے ہیں خد تاج! ہمیں پیسے آپ نے ہی دینے ہیں۔“ لمبا چوڑا بل بنوا دینے کے بعد وہ ان سے مزید پانچ ہزار طلب کرتی انہیں حیران کر گئی تھی مگر اس کے نروٹھے پن سے کہنے پر انہوں نے اگلے ہی پل ایک لفظ کہے بنا اس کی مطلوبہ رقم اس کی جانب بڑھا دی تھی۔

”آپ یہیں ٹھہریئے ہم آتے ہیں۔“ وہ پانچ ہزار کا نوٹ مٹھی میں دبے دبے جوش سے دبائی دھیمے سے بولی تھی۔

”آپ اکیلے کیسے جائیں گی ہم آپ کے ساتھ چلتے ہیں۔“ اسے آگے بڑھتے دیکھ کر وہ اس کے ہم قدم ہوئے تھے کہ وہ رک گئی تھی۔

”خد تاج! آپ پلیز یہیں رکے ناں، ہم پانچ منٹ میں آ جائیں گے گوڈ پراس۔“ اس کے چہرے پر بحس ساتھ آنکھوں میں اشتیاق وہ الجھ گئے تھے جبکہ وہ انہیں حیران چھوڑ کر وال گلاس دھکیلتی شاپ میں داخل ہو گئی تھی اور وہ بے چینی سے اس کے آنے کا انتظار کرنے لگے تھے وہ تقریباً گیارہ منٹ بعد ایک بیگ کے ساتھ لوٹی تھی جسے لینے کو انہوں نے ہاتھ بڑھایا تھا۔

”نہیں خد تاج! یہ ہم خود پکڑیں گے۔“ وہ حیران تو ہوئے مگر اس کی رگ رگ سے واقف تھے لمحہ کے ہزارویں حصے میں ساری صورتحال سمجھ گئے تھے اور اس کی خوشی میں خوش اسے شاپنگ کے بعد ڈنر کے لئے لے گئے تھے۔

بیٹھی تھیں اور وہ اپنی شاپنگ انہیں دکھانے لگی تھی۔

”اماں بی ہم نے فرسٹ ٹائم اپنی پسند سے آپ کے لئے کچھ لیا ہے بتائیے نہ آپ کو کیا لگا۔“ اس کی آنکھوں میں الجھن سی در آئی تھی جو ان کے تعریف کرنے پر دور ہو گئی تھی اور وہ وہاں سے اٹھ کر جانے لگے تھے کہ وہ ان کے سامنے آ گئی تھی۔

”خدیج! یہ آپ کے لئے۔“ وہ بیگ جو وہ پورے راستے بہت حفاظت سے سنبھالتی آئی تھی اس نے وہ خدیج کی جانب بڑھایا تھا جسے وہ مسکرا کر تھامتے ہوئے آگے بڑھے تھے۔

”خدیج! ہمارے سامنے کھول کر دیکھئے۔“ وہ آواز پر ر کے اور صوفے پر بیٹھ گئے، وہ انہیں قدرے زور سے ہو کر آس بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

”ہمیں اندازہ نہیں تھا کہ آپ کی پسند اتنی اچھی ہوگی۔“ بلیک کلر کی گرے ڈائس والی ٹائی کو وہ ستائش بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے شرارت سے بولے تھے۔

”آپ کو سچ میں اچھی لگی ہے ناں، کہیں ہمارا دل رکھنے کو تو نہیں کہہ رہے۔“ وہ اب بھی زور سے وہ مسکرا دیئے تھے۔

”آپ کا دل نہیں رکھ رہے، یہ واقعی بہت اچھی ہے۔“ انہوں نے سچائی سے اس کی پسند کو سراہا تھا۔

”تھینک گاڈ، یہ آپ کو پسند آگئی ورنہ ہم تو ڈر رہے تھے کہ نہ جانے آپ کو یہ پسند بھی آئے گی کہ نہیں۔“ وہ مسکرا رہی تھی۔

”یہ ہمیں بہت پسند آئی ہے اور اسے ہم ہمیشہ سنبھال کر رکھیں گے کیونکہ یہ ہمارے لئے بہت اہم ہے کیونکہ یہ ہمیں ہماری دنی نے بہت

خلوص کے ساتھ گفٹ کی ہے۔“ وہ خلوص دل سے بولے تھے اور یکدم اسے اپنا گزشتہ رویہ یاد آیا تھا اور وہ بلا توقف ان سے معافی طلب کر گئی تھی۔

”آئی ایم سوری خدیج! اس وقت ہمیں پتہ نہیں کیا ہو گیا تھا کہ ہم آپ سے اتنی بدتمیزی کر گئے۔“ اس کے من موہنے چہرے پر شرمندگی نے پنجے گاڑ دیئے تھے۔

”اٹس اوکے بس اتنا یاد رکھیئے گا کہ آپ ہمارے لئے بہت اہم ہیں اور آپ کی پرواہ کے خیال سے آپ کی حفاظت کی نیت سے ہم نے آپ پر کچھ پابندیاں لگا دیں اور چونکہ ماں جی کی زندگی دیکھ چکے تھے اس لئے کبھی خیال ہی نہیں گزرا کہ آپ کو بدلتے حالات اور تقاضوں کے سبب تبدیلی کی آزادی کی ضرورت ہوگی۔“ وہ نرمی سے اپنا موقف کہہ رہے تھے۔

”ہمیں کبھی خود سے آزادی کا خیال نہیں آیا تھا مگر حینا نے ہمیں بار بار احساس دلایا کہ ہم ایک اینارل زندگی گزار رہے ہیں، ہماری زندگی میں بہت کچھ مسنگ ہے، بس اسی سب کے پیش نظر ہم اس طرح سوچنے اور کہنے پر مجبور ہو گئے، مگر یقین کریں ہمیں آپ کی کسی بات سے کسی قسم کا اختلاف نہیں ہے لیکن.....“ وہ بھیکے لہجے میں کہتی یکدم رک گئی تھی۔

”آپ کا رویہ ہمیں بہت تکلیف دیتا ہے آپ ہر بات سختی سے منع کر دیتے ہیں جبکہ آپ نرمی سے بھی تو ہمیں سمجھا سکتے ہیں۔“ وہ جھکا سر اٹھا کر یکدم ہی اس کے آنسوؤں سے بھگتے چہرے کو دیکھنے لگے تھے۔

”آپ نہیں جانتے خدیج! کہ آپ کا سر دلجو، بے تاثر آنکھیں اور یہاں تک کہ آپ کی خاموشی بھی ہماری ہمت توڑ دیتی ہے، آپ نے

کیوں دھیرے دھیرے ہم سے اتنے فاصلے بڑھا لئے ہیں؟“ وہ اب رونے لگی تھی۔

”وہی! ہم نے آپ سے فاصلے نہیں بڑھائے بس رشتے کی حقیقت و نزاکت کے پیش نظر محتاط ہو گئے اور چاہتے ہیں کہ آپ بھی اس حقیقت کو تسلیم کر لیں۔“ وہ کافی دیر کی خاموشی کے بعد بہت ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولے تھے اور وہاں سے نکلتے چلے گئے تھے جبکہ وہ ان کی بات پر غور کرتی خاموش بیٹھی رہ گئی تھی کہ اسے اختلاف تھا بھی تو کہہ نہیں سکتی تھی۔

☆☆☆

خدیجہ بخاری کا ذہن بری طرح منتشر تھا اور وہ ہوینا بخاری کی باتوں اور اپنے رویے کو سوچتے وہ ماضی میں اترتے چلے گئے تھے۔

معارض بخاری کا تعلق سید گھرانے سے تھا وہ دو بھائی تھے، معارج بڑے تھے اور ان سے چھوٹے ارتج بخاری تھے، معارج بخاری کا تعلق ایک ایسے گھرانے سے تھا جہاں پردے کا خصوصی خیال رکھا جاتا تھا ان کے ہاں کی خواتین شرعی پردہ کرتی تھیں اور بہت ضرورت کے وقت گھر سے نکلا کرتی تھیں، معارج بخاری کی شادی تایا زاد خدیجہ سے ہوئی تھی جو حصول علم کے علاوہ کسی فضول کام کے لئے گھر سے نہیں نکلتی تھی، خدیجہ نے بی اے کیا تھا، شادی کے دو سال بعد ان کی زندگی میں خدیجہ بخاری کی آمد نے گویا خوشگوار سی لہلہل مچادی تھی، ننھے خدیجہ کی قلقاریوں سے ہر وقت ”سید محل“ کو بھڑا رہتا تھا کہ یکدم فضا مکدر سی ہو گئی ارتج بخاری کی خواہش نے سید محل میں سرد سی فضا پیدا کر دی تھی کیونکہ ارتج اپنی چھٹی زاد سے منسوب تھے لیکن وہ اپنی کلاس فیلو الوینا شاہ سے شادی کرنا چاہتے تھے جو پنجابی فیملی سے تعلق رکھتی تھیں اس لئے ارتج بخاری کی شادی کے

سب سے بڑے مخالف تھے مگر ارتج بخاری نے کسی کی بھی مخالفت کی پرواہ نہ کی اور الوینا شاہ سے کورٹ میرج کر لی لیکن جس دن وہ الوینا شاہ کو الوینا بخاری بنا کر سید محل میں لے کر آئے، سید محل پر ایک طوفان ٹوٹا ہوا تھا، معارج بخاری بلوچستان کے دو قبیلوں کی آپسی جنگ کی اندھی گولی کا شکار ہو کر چھٹی بیوی اور دو سالہ خدیجہ بخاری کو قیمتی کا دکھ دیتے دنیا سے چلے گئے تھے، بڑے بیٹے کی موت کا صدمہ ایسا تھا کہ عارج بخاری کو جیتے جی مار گیا تھا اور معارج بخاری کا جانا ایسا صدمہ تھا کہ زندگی کا ہر سکھ اور دکھ اس کے آگے کچھ بھی نہ تھا اس لئے الوینا بخاری کو نہ اچھا کہا گیا اور نہ ہی برا اور انہیں بہت خاموشی سے قبول کر لیا گیا لیکن آزاد ماحول کی پروردہ الوینا چند ماہ میں ہی گھبرا گئیں اور انہوں نے کراچی جہاں ان کا میکہ تھا وہاں جا کر رہنے کی فرمائش کر دی، جو ارتج بخاری نے رد کر دی کیونکہ وہ اپنے باپ کو مزید دکھی نہیں کر سکتے تھے، ایسے میں الوینا کے جذبات سرد پڑنے لگے اور ان کے اور ارتج بخاری کے درمیان کے جھگڑے روز کا معمول بن گئے، عارج بخاری ایک بیٹا موت کے ہاتھوں کھو چکے تھے دوسرے کی جدائی برداشت نہیں کر سکتے تھے وہ بیمار رہنے لگے تھے اور اسی سرد ماحول میں انہوں نے بیٹے کے سامنے ہاتھ جوڑ کر اپنی ایک خواہش کا اظہار کر دیا اور وہ اپنی ذات سے اپنے باپ کو پہلے ہی بہت تکلیف پہنچا چکے تھے مزید حوصلہ نہ ہوا اور انہوں نے باپ کے جڑے ہاتھوں کی عزت رکھ لی جبکہ ایسا کرتے ہوئے نہ دماغ راضی تھا اور نہ دل اور جب الوینا کو ارتج بخاری اور خدیجہ بخاری کے نکاح کا علم ہوا تھا انہوں نے زمین آسمان ایک کر ڈالے تھے ان کا اور ارتج بخاری کا زبردست قسم کا جھگڑا ہوا تھا اور

وہ لڑ جھگڑ کر میکے سدھار گئی تھیں اور ارتج بخاری کی لاکھ منتوں محبت سے مجبور کرنے کے باوجود وہ لوٹ کر نہیں آئی تھیں، خدیجہ کے لئے شوہر کی موت کا صدمہ جھیلنا ہی مشکل تھا کہ عارج بخاری کے مجبور کرنے پر وہ ارتج بخاری سے شادی کر گئی تھیں، لیکن جب الوینا انہیں چھوڑ گئیں تو وہ بے سکون ہو کر رہ گئی تھیں، ارتج بخاری کی خاموشی ان کی اداس صورت انہیں بے چین کرتی تھی اور وہ ان کے غم میں گھلتے گھلتے کینسر جیسے موذی مرض میں مبتلا ہو کر سات سالہ خدیجہ بخاری کو روتا چھوڑ کر دنیا سے چلی گئی تھیں، خدیجہ بخاری کی موت کے بعد وہ الوینا بخاری کو واپس لانے کی کوشش میں لگ گئے تھے اور انہوں نے واپسی کی ایک شرط رکھ دی تھی جسے انہوں نے مان لیا تھا کہ وہ ایک کے بعد ایک اپنے کی موت کے صدمے سے دو چار اب کسی کو کھونے کا حوصلہ نہیں رکھتے تھے اسی لئے وہ بیوی کی بات مان کر ہمیشہ کے لئے کراچی شفٹ ہو گئے تھے، خدیجہ ان کی نظروں میں بری طرح کھٹکتا تھا وہ اس سے بہت بری طرح پیش آتی تھیں، ماں سے دوری کے بعد چاچی کا اتنا برا رویہ اس کے دل کو چھوٹ لگاتا اس کی شخصیت کو مسخ کرتا جا رہا تھا اور یونہی تین سال گزر گئے تھے مگر وہ تاحال اولاد کی نعمت سے محروم تھے اور یہی محرومی دھیرے دھیرے الوینا بخاری کے دل میں خدیجہ بخاری کے لئے محبت جگا گی، چاچی کا اپنائیت بھرا رویہ پا کر خدیجہ بخاری خوش رہنے لگا تھا اور اس کی ستر ہوئیں سالگرہ ہر سال کی طرح بہت دھوم دھام سے منائی گئی تھی اور شادی کے چند روزوں میں سال ان کا رب ان پر مہربان ہو گیا تھا، مارے خوشی اور احساس تشکر کے ان کے قدم ہی زمین پر نہیں نکلتے تھے، خوشی کی خبر پا کر ارتج بخاری بھی بے حد مطمئن و خوش تھے اور جس

دن وہ بیٹی کے باپ بنے مارے تشکر کے سجدے میں جا گرے تھے، چھٹی ہوینا ان سب کی آنکھوں کا تارا بن گئی تھی، گلابی گالوں والی بے حد پیاری سی ہوینا کے ساتھ کھیلنا خدیجہ بخاری کو بے حد اچھا لگتا تھا اور جیسے جیسے ہوینا بڑی ہو رہی تھی اس کے ساتھ اٹیچ ہوتی جا رہی تھی، جس سال انہوں نے فیشن ڈیزائننگ میں ماسٹرز کیا تھا اسی سال ہوینا کی اسکولنگ اشارٹ ہوئی تھی، خدیجہ بخاری کے شوق کو دیکھتے ہوئے ارتج بخاری نے انہیں ایک بوتیک بنوا دی تھی اور ان کے عملی زندگی میں قدم رکھتے ہی الوینا بخاری چاہتی تھیں کہ ان کی شادی کر دیں مگر وہ بڑی سہولت سے انہیں ٹال رہے تھے کیونکہ الوینا بخاری ان کی شادی اپنی بہن کی بیٹی سے کرنا چاہتی تھیں جبکہ وہ خود اپنی یونیورسٹی فیلو سے محبت کرتے تھے مگر وہ فی الوقت یہ چاہی کو نہیں کہہ سکتے تھے کیونکہ شمسہ کے جنون سے واقف تھے کہ وہ ڈاکٹر بننا چاہتی ہے اور یہ اس کے میڈیکل کا آخری سال ہے اسی لئے وہ شمسہ کی تعلیم مکمل ہونے کے بعد چاچی سے بات کرنا چاہتے تھے لیکن رب کو کچھ اور ہی منظور تھا ہوینا کی گیارہویں سالگرہ کی شام انجوائے کر کے وہ لوگ گھر واپس آ رہے تھے کہ ان کی کار کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا وہ اپنی بائیک پر آ رہے تھے جبکہ ہوینا حادثہ میں معجزاتی طور پر محفوظ رہی تھی اور وہ دونوں میاں بیوی زندگی کی بازی ہار گئے تھے، الوینا بخاری تو موقع پر ہی دم توڑ گئی تھیں اور وہ بھتیجے سے ملنے اسے بیٹی کی ذمہ داری سونپنے تک زندہ رہے تھے، یہ حادثہ ایسا تھا کہ وہ سنبھل نہیں پارہے تھے کہ دعاؤں کا آخری سایہ بھی ان کے سر سے اٹھ گیا تھا اور ہوینا کا تو بہت ہی برا حال تھا وہ حادثہ سے خوفزدہ تھی اور ماں باپ کی جدائی سے اذیت و تکلیف سے گزر رہی تھی اور وہ

ہو پنا کے لئے خود کو سنبھال گئے تھے اور اس میں پرانی ملازمہ اماں بی نے ان کا بہت ساتھ دیا تھا، والدین کی وفات کے وقت وہ آٹھویں جماعت میں تھی دو سال کیسے گزرے پتہ ہی نہیں چلا تھا اور اس نے میٹرک کر لیا تھا اس نے میٹرک بورڈ میں تیسری پوزیشن لی تھی وہ عرصہ بعد بہت خوش تھی اور خوش خدیج سے یاٹنا چاہتی تھی اس لئے وہ دوپہر سے ان کی منتظر تھی مگر رات کے بارہ بجے بھی وہ گھر نہیں آئے تھے وہ ان کا انتظار کرتی سو گئی تھی اور اگلے دن جب شکوہ کیا تھا اور اپنی خوشی ان سے کہی تھی تو وہ اس کے شکوے کی پرواہ کیے بغیر اس کی خوشی محسوس کیے بناء گہری سنجیدگی سے مبارکباد دیتے گھر سے چلے گئے تھے اس دن وہ بہت روئی تھی کہ اس نے اب تک خدیج بخاری کا نرم محبت لٹاتا لہجہ اور رویہ ہی دیکھا تھا پھر وقت نے ان کی ساری نرمی چھین لی تھی وہ نہیں جانتی تھی ایسا کیوں ہوا تھا نرم چھاؤں سے خدیج بخاری اس کے لئے چھاؤں ہو کر بھی بہت غیر اجنبی سے ہو گئے تھے اور اس کے بہت رونے منع کرنے کے باوجود بھی اسے ہاسٹل شفٹ کر دیا تھا، جہاں سے وہ ہر ویک اینڈ پر آیا کرتی تھی بی ایس سی پارٹ ون کے ایگزامز دے کر فارغ تھی اس لئے وہ ”سید ہاؤس“ آئی ہوئی تھی اور اماں بی آج کل اسے گھرداری سکھا رہی تھیں ہوسٹل میں اس کی دوستی شینا نامی لڑکی سے ہو گئی تھی، شینا نے اس سے دوستی اس کی خوبصورتی دیکھ کر کی تھی اور اس کی بیوقوفی اور سادگی نوٹ کرنے کے بعد اس کی برین واشنگ کرنے لگی تھی اور اس کی برین واشنگ کا ہی اثر تھا کہ اس نے خدیج بخاری سے شینا کی برتھ ڈے پارٹی میں جانے کی فرمائش کر ڈالی تھی اور جوان کے انکار پر ضد میں ڈھلتی اس نے کانی بدتمیزی بھی کر دائی تھی، اس کے اور

اماں بی کے احساس دلانے پر انہیں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا اور چاچا، چاچی کی موت کے تقریباً سات سال بعد وہ پہلی دفعہ اسے اپنے ساتھ شاپنگ سینٹر لے گئے تھے وگرنہ ان کی موت کے بعد وہ کالج کے علاوہ کہیں نہیں گئی تھی اور آج جس طرح اس نے ان سے سوری کر کے شکوہ کیا تھا وہ اپنے دل و ضمیر پر بوجھ محسوس کرنے لگے تھے۔

”شمسہ! ہم آپ کو کبھی معاف نہیں کریں گے، آپ نے ہماری اچھی بھلی زندگی تباہ کر ڈالی، ہمارے سارے رشتے بے رحم موت نے ہم سے چھین لئے تھے اور جو واحد رشتہ رہ گیا تھا وہ آپ نے اپنی تنگ دلی اور شک کی آگ میں جلتے ہوئے ہم سے چھین لیا، آپ بہت بری ہیں شمسہ، ہم آپ کو کبھی معاف نہیں کریں گے۔“ وہ ماضی سے نکلتے کانی دیر خلاؤں میں گھورتے رہے تھے کہ کانی سے ہی وابستہ دل سے جڑے رشتے سے مخاطب ہو کر بولے تھے کہ کچھ بھی تھا، وہ کتنی ہی تکلیف میں تھے مگر اسے اس کی تمام بے رخی اور بدتمیزی کے باوجود بھول نہیں سکے تھے کہ دل میں آنے کے ہزار راستے ہوتے ہیں مگر دل میں آ جان والے کو دل سے نکالنے کے لئے ایک بھی دروازہ نہیں ہوتا کہ محبت کی محبت، ایسا کوئی دروازہ کھولنے نہیں دیتی جو محبت سے دور کر دے، اسی لئے وہ بھی بند دروازوں سے ٹکراتے، دل کی ٹیسوں کو دل ہی میں دہاتے زندگی گزار رہے تھے کہ نہ اسے دل سے نکال پارہے تھے نہ ہی کسی اور کو دل کی حکمرانی سونپ رہے تھے اسی لئے ان کی زندگی جمود کا شکار ہوئی جا رہی تھی۔

☆☆☆

”شینا! ہم آپ کی سالگرہ میں نہیں آ سکتے۔“ وہ قدرے شرمندگی سے بولی تھی جبکہ وہ

اس کی بات سن کر غصہ سے بھڑک اٹھی تھی مگر ہائے ری مجبوری وہ اسے دل ہی دل میں نزار صلو اتیں سناتی نہایت نرمی سے استفسار کرنے لگی تھی۔

”لیکن کیوں ونی! کل تو تم نے کہا تھا کہ تم آؤ گی؟“ وہ ضبط کے باوجود سرخ پڑ گئی تھی کہ ہوینا سامنے ہوتی تو وہ آج اسے کچا ہی چبا ڈالتی۔

”ہاں ہم نے کہا تھا بٹ شینا، یہ سب خدج بخاری کو پسند نہیں ہے اور ہم وہ کام بہت چاہت کے باوجود بھی نہیں کر سکتے جس میں ہماری فیملی کی خوشی و رضا شامل نہ ہو۔“ وہ اپنی ازلی معصومیت سے بولی تھی۔

”فیملی واٹ فیملی ونی؟ وہ خدج بخاری وہ محض تمہارا کزن ہے، تمہارا شوہر نہیں ہے جو تم اسے دھڑلے سے اپنی فیملی کہہ رہی ہو۔“ وہ مصلحت بالائے طاق رکھتی چبا چبا کر بولی تھی اور وہ تو ساکت رہ گئی تھی۔

”اور جب وہ کہیں آنے جانے سے قبل تم سے نہیں پوچھتا تو کس رشتے و حق سے تو تم نے خود کو محض ایک کزن کی مرضی و پسند کا پابند کر لیا ہے؟“ وہ اس کی خاموشی محسوس کر کے مزید کہتی چلی گئی تھی۔

”خدج محض ہمارے کزن ہیں ہیں کہ وہ ہیں تو واحد ہمارا خونی رشتہ، ہمارا سہارا ہیں۔“ اس سے کبھی اس طرح کسی نے کچھ نہ کہا تھا اس لئے وہ عجیب سی الجھن میں گھر چلی تھی اس کی آنکھوں میں آنسو مچلنے لگے تھے اور وہ بمشکل بھیکے لہجے میں بولی تھی۔

”مگر ان سے تمہارا کوئی شرعی رشتہ نہیں ہے، میرے کزن صغدر سے تو تم نے دوستی سے صاف انکار کر دیا تھا یہ کہہ کر تم غیر مردوں سے

دوستی نہیں کرتیں تو خدج بخاری سے اپنے رشتے کو تم کیا نام دو گی کہ ایک طویل مدت سے تم ایک نامحرم کے ساتھ رہ رہی ہو، اب ان سے تمہارے رشتے کی نوعیت کیا ہے یہ تو تم اور وہ تمہارا لاڈلا خدج ہی بہتر جانتا ہو گا۔“ وہ اپنی سطحی سوچ بیان کر ہی گئی تھی جبکہ وہ اس کی اتنی گھٹیا گفتگو پر باقاعدہ کانپنے لگی تھی، بیل فون اس کے ہاتھ میں لرز اٹھا تھا وہ خود کو ہوا میں معلق تصور کرنے لگی تھی جبکہ اس کی خاموشی سے اسے گویا شہہ مل گئی تھی مزی بکو اس کرنے کی اس لئے وہ جو منہ میں آ رہا تھا کہتی جا رہی تھی۔

”تم خوبصورت ہو، جوان ہو تمہیں دیکھ کر تو بڑے بڑے عابد و زاہد بہک سکتے ہیں اس زندہ مثال تو خود میرا کزن صغدر ہے جو تمہاری ایک جھلک پر مر مٹا تھا اور جس کے کہنے پر بھی میں نے تم جیسی اٹھارہویں صدی کی لڑکی سے راہ و رسم بڑھائے تھے، تو یہ کیسے ممکن ہے کہ تمہارے حسن کا جادو خدج بخاری پر نہ چلا ہو؟ اور ایسے ہی تو تم اس کی ہر بات پر لبیک نہیں کہتیں یہ کرامات تو کسی خواہشات کا ہی پیش خیمہ لگتی ہیں؟“ وہ تنفر سے کہہ رہی تھی۔

”بکو اس بند کیجئے اپنی۔“ وہ یکدم ہی حلق کے بل چیخ اٹھی تھی۔

”حقیقت پر تم پردہ نہیں ڈال سکتی ہو ہوینا بخاری اور اپنے خدج سے ذرا فرصت ملے تو کرنا مجھ سے رابطہ کہ ایک صغدر ہی نہیں، بہت سے مرد تمہارے حسن کو خراج پیش کرنے کو دل و جان سے تیار ہو جائیں گے اور صغدر تو تمہیں کچھ گھنٹوں کی منہ مانگی قیمت ادا کر دے گا، بس ذرا اپنے خدج سے ذرا سی بے وفائی کرنی پڑے گی۔“ اس نے کمینگی و عامیانہ پن کی بھی حد کر اس کر دی تھی۔

”شت اپ شینا! ہمیں اندازہ ہی نہیں تھا کہ آپ ہمارے بارے میں اس طرح سوچتی ہیں آپ کو اتنی گھٹیا گفتگو کرتے شرم آئی چاہیے۔“ وہ باقاعدہ کانپتی روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

”بھئی مجھے تو یہ بھی پتہ کہ شرم کس چڑیا کا نام ہے؟ تمہاری اطلاع کے لئے عرض ہے کہ میں ایک کال گرل ہوں اور تم میں مجھے نہیں وہ صفدر حیات کو انٹرسٹ ہے اور اس کے ہی کہنے پر میں نے تم سے دوستی کی کہ صفدر میرا کزن نہیں ہے میں اس کی منظور نظر ضرور ہوں اور اس کا نگاہ انتخاب جب تم پر ٹھہرا تو مجھے غصہ بھی آیا تھا حسد بھی محسوس ہوئی تھی مگر صفدر نے نوٹوں کی گڈیاں دے کر غصہ و حسد کو بھسم کر ڈالا۔“ اس نے آج ہر حقیقت عیاں کر ڈالی تھی اپنی سوچ سے، اپنے عزائم تک اور اس نے بے ساختہ منہ پر ہاتھ رکھ لیا تھا کہ صدے و بے یقینی سے اس کا برا حال تھا۔

”مگر میں تم پر اپنا بہت وقت برباد کر چکی میں صفدر کو تمہارا موبائل نمبر دے دوں گی، پھر وہ جانے اور تم۔“ وہ اب اکتائے ہوئے انداز میں بولی تھی۔

”ہرگز نہیں، آپ کسی کو بھی ہمارا نمبر نہیں دیں گی۔“ وہ ٹرپ کر چنچنی تھی۔

”مجھے تمہاری اجازت کی ضرورت نہیں ہے، اللہ حافظ۔“ اس نے بکواس کر کے فون بند کر دیا تھا اور وہ سن سی بیٹھی رہ گئی تھی کہ اسی وقت اس کے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی تھی، اس نے اٹھ کر روم لاکھ کر دیا تھا کہ وہ خدیجہ بخاری کی مخصوص دستک پہچان گئی تھی اسی لئے اب دروازے سے ٹیک لگائے بری طرح سکسنے لگی تھی کہ شینا کی باتیں اس کے کانوں میں گونجتیں اسے بے چین کر رہی تھیں۔

”وہی! دروازہ کھولے، ہمیں بتائیے کیا ہوا ہے؟“ وہ جو دستک دینے کے بعد دروازہ کھلنے کے منتظر تھے اس کے رونے کی آواز سن کر متفکر سے بلند آواز میں کہہ گئے تھے۔

”آپ ہمارے کچھ نہیں لگتے خدیج! آپ سے ہمارا کوئی شرعی رشتہ نہ ہونا ہمیں ذلت و رسوائی کے پاتال میں دھکیل گیا ہے۔“ اس کی ہچکیاں بندھنے لگی تھیں اور شینا کے ذلت میں ڈوبے لفظ تیر کی طرح چھنے لگے تھے۔

”ہم اب آپ کا بھی سامنا نہیں کر پائیں گے، کبھی بھی نہیں خدیج، کہ شینا نے ہمارے رشتے، ہمارے کردار پر انگلی اٹھا کر ہمیں جیتے جی مار ڈالا ہے۔“ وہ متفکر سے دروازہ پیٹ رہے تھے، پریشانی سے اسے پکار رہے تھے اور وہ بلک بلک کر روتی خود سے کہے جا رہی تھی۔

”آپ دروازہ کھولیں وئی، ورنہ ہم دروازہ توڑ دیں گے۔“ تفکر پر جیسے ہی اشتعال غالب آیا وہ چیخ پڑے تھے اور ان کی بات سن وہ زمین سے اٹھی، اس کے ذہن میں یکدم ہی منفی سوچ ابھری تھی اور سوچ کے ابھرتے ہی اس کی نگاہ متلاشی انداز میں چکرانے لگی تھی کہ اسے روم فرنیچ کے اوپر رکھی باسکٹ میں چھری نظر آگئی تھی اور اس نے لپک کر جیسے اپنے قبضے میں لیا تھا اور آؤ دیکھا تھا نہ تاؤ، دہنی کلانی کی رگ بے دردی سے کاٹ ڈالی تھی۔

”آپ دروازہ توڑ دیں خدیج بابا کہ اب تو ان کے رونے کی آواز بھی نہیں آرہی؟ مجھے بڑا ڈر لگ رہا ہے، اس طرح تو وئی بیٹا کبھی نہیں کرتیں۔“ اماں بی بھی چلی آئیں مگر ان کی بھی ہر کوشش اکارت گئی تھی اور آواز آنا بند ہوئی تھی تو وہ دونوں ہی نہ جانے کیوں بہت بے چین ہو گئے تھے اور جس وقت وہ دروازہ توڑ کر کمرے

میں داخل ہونے میں کامیاب ہوئے تھے گرے
کارپٹ لہورنگ ہو رہا تھا وہ دونوں ہی دیوانہ وار
اس پر جھکے تھے، خدیج بخاری نے اس کے
آنسوؤں سے تر زرد چہرے کو دیکھتے ہوئے دل
کی دھڑکن چیک کی تھی اور رفتار معمول سے کم
ہونے کے باوجود کسی امید کے تحت اسے بانہوں
میں اٹھائے ہاسپٹل کی جانب دوڑ گئے تھے اور
اس کے بچپن کے حدود سے نکلنے کے بعد پہلی
دفعہ تھا کہ انہوں نے اسے چھوا تھا کہ ورنہ جب
اس نے بچپن کو خیر باد کہہ کر جوانی کی دہلیز پر قدم
رکھا تھا وہ نہ اسے نظر بھر کر دیکھتے تھے اور نہ ہی دعا
تک کے لئے اس کے سر پر دست شفقت رکھتے
تھے کہ وہ اتنے ہی محتاط پسند تھے مگر ان کی تمام
مناظر پسندی، اچھی و نیک تربیت و فطرت سب
بے کار گئی تھی کہ برائی دیکھنے والی آنکھ نے برائی
دیکھے بنا بھی مفروضوں کی بنیاد پر برائی نہ صرف
دیکھی تھی بلکہ اس کا یوں کھلا اظہار کیا تھا کہ وہ
خودکشی جیسے حرام فعل کی مرتکب ہوئے لمحہ بھر کو بھی
کانپی تک نہ تھی جبکہ وہ تو اس کے اس اقدام کو
لے کر مضطرب ہو گئے تھے، بے چینی سے آئی سی
یو کے باہر ٹہل رہے تھے کہ آئی سی یو کا دروازہ کھلا
تھا اور وہ بڑی بے قراری عجلت میں آگے بڑھے
تھے کہ اپنے پورے وجود کے ساتھ ڈھے گئے تھے
کہ ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ کئی برس
بعد اس دشمن جاں سے یوں سامنا ہوگا، ان کو دیکھ
ساکت تو وہ بھی رہ گئی تھی مگر ان کی نسبت بڑی
پھرتی سے خود کو کپوزڈ کر گئی تھی جبکہ وہ اسے یک
ٹک دیکھ رہے تھے ان کی آنکھوں میں یکدم وہی
بے قراری چاہت ڈیرا جما چکی تھی جو اس کے
لئے مخصوص تھی۔

”آپ کی پیشٹ اب خطرے سے باہر
ہیں، انہیں کچھ ہی دیر میں پرائیویٹ روم میں

شفٹ کر دیا جائے گا۔“ لحظہ بھر کو اس کا دل دھڑکا
تھا مگر وہ دل کی آواز کو پہلے کی طرح نظر انداز
کرتی پیشہ ورانہ سنجیدگی سے پہنتی نکلتی چلی گئی تھی اور
وہ ساکت کھڑے رہ گئے تھے، نہ اس کے پیچھے جا
سکے تھے اور نہ ہی ونی کے لئے آگے بڑھ سکے
تھے۔

☆☆☆

”ہمیں کیوں بچایا؟ ہمیں نہیں جینا، ہمیں
مر جانے دیا ہوتا۔“ وہ اماں بی کو دیکھ کر سسکی تھی۔
”کیا ہو گیا ہے ونی بیٹا آپ کو، کیوں کر
رہی ہو ایسی باتیں؟ جانتی ہوناں آپ کہ خودکشی
حرام ہے تو پھر کیوں مرنے جا رہی تھیں حرام
موت۔“ وہ بھلی پلکوں سے اس کے متورم زرد
چہرے کو دیکھ رہی تھیں۔

”ہم کچھ نہیں جانتے، ہمیں بس اتنا پتہ ہے
کہ ہمیں نہیں جینا، ہم مر جانا چاہتے ہیں۔“ اس
کے رونے میں شدت آگئی تھی۔

”بلکہ اس بند کیجئے اپنی۔“ خاموش تماشا ٹائی
بنے خدیج بخاری پھنکارے تھے اور ان کی
موجودگی سے لاعلم، ان کے سامنے اسے خائف
وہ خود اذیتی سے لب چبانے لگی تھی۔

”ایسا کون سا طوفان آ کر گزر گیا جو آپ
حرام موت مرنے چلی تھیں۔“ وہ اس کو ہاسپٹل
لانے تک اور اس کی زندگی کی دعا کرتے جس
اذیت و تکلیف سے گزر رہے تھے وہی اس پر ظاہر
ہوئی تھی جو وہ یوں اس پر چیخ اٹھے تھے۔

”ہم نے جائز و حلال زندگی ہی کب
گزاری ہے جو مرنے کا جائز اہتمام کریں، ایسی
زندگی سے تو حرام موت ہی بہتر ہے۔“ وہ خود
اذیت کی انتہا کو چھوتی لرزتے لہجے میں بولی تھی
ان دونوں کے ہی اضطراب میں اضافہ کر گئی تھی۔
”وہی! پلیز بتائے ہمیں آپ کیوں اتنی

ڈسٹرب اور ڈس ہارٹ ہیں۔“ وہ اس کے لفظوں پر بے چین ضرور ہوئے تھے مگر اس کی دگرگوں حالت دیکھ کر خود کو کمپوز ڈ کرتے اسٹول کھینچ کر اس پر بیٹھے تھے اور نہایت شفقت سے پوچھا تھا۔
 ”آپ ہمارے لئے کیوں کس حق اور رشتے سے پریشان ہو رہے ہیں؟ چلے جائیے یہاں سے۔“ وہ جتنی نرمی و شفقت سے بولے تھے وہ اسی قدر بھڑک کر چیخی تھی۔

”لی ہو یو سیلف، یہ گھر نہیں ہاسپٹل ہے، ہم یہاں کوئی تماشہ نہیں لگانا چاہتے۔“ وہ اس کے انداز پر دے دے غصہ سے بولے تھے۔

”آپ کس تماشے سے بچنا چاہتے ہیں، ہم تماشہ بن چکے ہیں، ہمارے پاکدامن پر شفاف کردار پر کچڑ اچھالی گئی اور ہم چپ رہے کہ ہمارے پاس اپنی صفائی میں کہنے کو ایک لفظ نہیں تھا۔“ وہ کمزوری کے باوجود اٹھ کر بیٹھ گئی تھی اور چہرہ ہاتھوں میں چھپائے بری طرح بلک رہی تھی، اس کے ہاتھ میں لگی ڈرپ کے لئے لگیں نیڈلز نکل گئی تھیں اور خون رسنے لگا تھا۔

”وہی گڑیا! ہم آپ کی غیر مبہم لایعنی باتیں نہیں سمجھ پارہے، آپ کو کس نے کیا کہا ہے ہمیں بتائیے پلیز۔“ وہ اس کی باتوں سے ہی نہیں اس کے بلکنے پر بھی تڑپ اٹھے تھے اور نہایت نرمی سے شفقت بھرے پچکارنے والے انداز میں استفسار کرتے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ گئے تھے اور گویا ایسا کر کے انہوں نے قیامت کو آواز دے ڈالی تھی۔

”مت چھوئیں ہمیں، دور ہو جائیں ہم سے، ہمارا آپ سے کوئی رشتہ نہیں ہے، آپ ہمارے محرم نہیں ہیں، نہ آپ ہمارے باپ ہیں نہ ہمارے شوہر، تو پھر کس حق سے آپ نے ہمیں چھوایا؟“ وہ ان کا ہاتھ اپنے کاندھے سے بے

دردی سے جھٹکتی ہدیائی انداز میں چیخ رہی تھی اور کب سے ضبط کرتے اشتعال کو دباتے خدج بخاری اپنا ضبط کھو بیٹھے تھے اور اس پر ہاتھ اٹھالیا تھا۔

”زبان سے ایک لفظ مزید نکالا تو ہم آپ کو جان سے مار دیں گے۔“ خونخوار لہجے میں کہتے نکلتے چلے گئے تھے جبکہ وہ گال پر ہاتھ رکھے مزید بلکنے لگی تھی اس کے چپک اپ کے ارادے سے آئیں ڈاکٹر شمسہ واپس پلٹ گئی تھیں کہ ان کا دل جلنے لگا تھا اور دماغ سلگ اٹھا تھا جبکہ حیران پریشان سی اماں لی روتے ہوئے اسے چپ کرانے کی ناکام کوشش کرنے لگی تھیں۔

☆☆☆

”اماں بی! وہی کو دیکھنے آج شام کچھ لوگ آئیں گے، آپ تیاری کر لیجئے گا۔“ وہ ناشتہ کرتے ہوئے کہتے اماں بی کو ساکت کر گئے تھے۔

”خدج بابا! ابھی بٹیا مکمل صحت پاب نہیں ہوئی ہیں، یہ وقت اس مسئلہ کو اٹھانے کا نہیں ہے کہ آپ ان کی ذہنی حالت سے بھی واقف ہی ہیں۔“ وہ کہے بغیر نہیں رہی تھیں۔

”سب جانتے ہیں اماں بی اور جو نہیں جانتے وہ بتانے کو راضی نہیں ہیں مگر ہم نے بچے ہیں نہ ہی کوئی کم عقل انسان ہیں، ان کے رویے و باتوں سے جتنا سمجھ پائے ہیں اسی کی روشنی میں یہ قدم اٹھا رہے ہیں کہ ہم جلد از جلد اپنے فرض سے سبکدوش ہو جانا چاہتے ہیں۔“ وہ بہت ٹھہرے ہوئے انداز میں بولے تھے کہ چاہے اس نے کچھ واضح انداز میں نہیں کہا تھا مگر وہ جتنا سمجھ پائے تھے اس کا لب لباب یہی تھا کہ وہ ان سے کوئی شرعی رشتہ نہ ہونے کے سبب پریشان ہے اور وہ اس سے شرعی رشتہ جوڑ بھی نہیں سکتے

تھے اس لئے اس کی ذمہ داری سے آزاد ہو جانا چاہتے تھے۔

”ہمیں بھی لگتا ہے کہ کسی نے بٹیا کو آپ کے حوالے سے کچھ غلط کہا ہے اسی لئے ہم چاہتے تھے کہ آپ ونی بٹیا سے نکاح کر لیں۔“ انہوں نے اندازہ ظاہر کر کے اپنا مطالبہ بھی دہرایا تھا۔

”اماں بی! ہم کسی کے الزام کی تردید کے لئے اپنی سوچ کا زاویہ نہیں بدل سکتے کہ ونی ہمارے لئے رشتوں کی پاکیزگی ہیں، ان کے بارے میں ایسا سوچنا بھی ہمارے لئے حرام ہے۔“ وہ ادھ پیا چائے کا کپ رکھتے کھڑے ہو گئے تھے۔

”ونی کے گزشتہ رویے کا سبب کیا ہے نہیں جانتے؟ اگر وہی ہے جو آپ اور ہم سمجھ رہے ہیں اس کے باوجود بھی ہم ایسا کوئی قدم نہیں اٹھائیں گے کہ ہماری نیت کل بھی صاف تھی، آج بھی صاف ہے، بندوں کی عدالت میں چاہے ہم پر کتنی ہی انگلیاں اٹھ جائیں، ہمیں سو کوڑے سر راہ مار لئے جائیں، مگر ہماری سوچ ہمارا عمل اللہ کی عدالت میں کامیاب ٹھہریں گے کہ ہماری اوقات نہیں تھی کہ ہم ونی کی ذمہ داری اٹھانے کے اہل ہو پاتے، مگر جس نے ذمہ داری ڈالی تھی اسی رب نے ہمیں آج تک ہمیں ہمارے عمل میں سرخرو کیا ہے اور آگے بھی کرے گا۔“ وہ بہت سنجیدہ تھے اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں اپنا موقف بیان کر گئے تھے۔

”آپ مہمانوں کے لئے انتظام کر لیجئے گا وہ چھ بجے تک آئیں گے۔“ وہ وہاں سے نکلتے چلے گئے تھے اور ان کے کہنے کے مطابق وہ وقت پر آ گئے تھے، لڑکے کا نا شاعل حمید تھا جو خدیج بخاری کا منیجر تھا اور اس کی نیک فطرت اور دھیمہ سنجیدہ مزاج دیکھتے ہوئے ہی انہوں نے خود

شاعل سے شادی کی نہ صرف بات کی تھی بلکہ اس کے اور اس کی فیملی کے دیکھنے کے لئے ہوینا کی تصویر بھی دی تھی، زرد لمبی ٹیمپس اور چوڑی دار پا جاے میں دوپٹہ سلیقہ سے سر تک اوڑھے (اماں بی نے اس کی تربیت بہت اچھے خطوط پر کی تھی وہ ناکتھ کلاس سے دوپٹہ سر تک لے رہی تھی) تمام تر سادگی میں اپنی کھلتی ہوئی رنگت اور متناسب سراپے کے ساتھ پہلی ہی نگاہ میں شاعل حمید کو پسند آ گئی تھی اور اس نے خدیج بخاری کا دیا پر پوزل اور تصویر والدین تک پہنچا دی تھی، تصویر دیکھ کر تو انکار کی کوئی گنجائش ہی نہ تھی اور جو طبقاتی فرق تھا اس کا احساس مگر بیٹے کو دلایا ضرور مگر وہ خدیج بخاری کے رکھ رکھاؤ اور عادات کے سبب اس فرق کو بھول گیا تھا اسی لئے اس نے ان کے دیئے پر پوزل پر حامی بھری تھی اور اس کی تصویر دیکھ کر تو انکار کی گنجائش ہی نہ رہی تھی اس لئے وہ اپنے والدین کو لے کر خدیج بخاری کے گھر پہنچ گیا تھا اور اس سبب میں اللہ کی رضا شامل تھی اس لئے تمام معاملات طے ہوتے چلے گئے تھے انہوں نے محض پندرہ دن بعد کی تاریخ دی تھی اور دن کیسے گزرے وہ جان ہی نہیں سکے تھے اور شادی کا دن آن پہنچا تھا اور انہوں نے اس کی خوشیوں اور سلامتی کی دعا کرتے ہوئے اسے شاعل حمید کے ساتھ بڑی شان و شوکت سے رخصت کر دیا تھا۔

☆☆☆

شاعل حمید پر بے اختیاری کا دور اتر ا ہوا تھا وہ اسے یک ٹک دیکھ رہا تھا جو مکمل سولہ سنگھار کے اس کی تیج سجائے بیٹھی تھی اور اس کے نکلی نکلی ہاندھے دیکھنے پر اس پر گھبراہٹ سوار ہو گئی تھی، پلکیں لرز نے لگیں تھیں، چہرہ لہو چھلکانے لگا تھا، وہ لب دانتوں تلے کچلنے لگی تھی کہ اس نے

مسکراتے ہوئے استحقاق بھرے انداز میں اس کا
حنائی چوڑیوں سے بھرا ہاتھ تھام لیا تھا، وہ اس
کے لمبے بے اختیار اسے دیکھنے لگی تھی اور اس
کے اسماں پاس کرنے پر، پر حجاب سی حیا کے
ساتھ اپنے اندر ہی سمٹ سی گئی تھی۔

”اوہوں، کیسی ہیں آپ مسز ہوینا شاعل؟“
اس نے ہاتھ کھینچا چاہا تھا اس لئے شرارتی انداز
میں تنبیہ کی تھی اور مسرور سے انداز میں استفسار کیا
تھا۔

”ہم اچھے ہیں۔“ وہ نگاہ چھکائے منمنائی
تھی اس کے لہجے میں واضح لریزش تھی جو اس کے
لبوں پر اچلی سی مسکان کھلا گئی تھی۔

”آپ کو دیکھنے سے پہلے تک، میں بھی
بہت اچھا تھا۔“ اس کا نرم شاہتہ لہجہ شرارت کی
چغلی کھارہا تھا وہ بے اختیار اسے دیکھنے لگی تھی اور
اس کے خوب رو چہرے پر بکھری نرم سی دوستانہ
مسکراہٹ دیکھ کر اس کی گھبراہٹ کچھ کم ہوئی
تھی۔

”آپ ہماری شادی سے خوش ہیں ہوینا؟“
آپ کو مجھ سے شادی پر کوئی اعتراض نہیں ہوا؟“
گہبیر لہجے میں استفسار کیا تھا۔

”جج..... جی..... نہیں۔“ اس کی نگاہ خود پر
محسوس کرتی وہ گھبرائے سے لہجے میں منمنائی تھی۔
”آپ کو اعتراض کیوں نہیں ہوا؟ کیا میں
آپ کو اچھا لگا تھا؟“ اس کا گھبرایا سا معصومانہ
انداز اسے شرارت پر مزید اکسا گیا تھا۔

”نن..... نہیں..... تو۔“ اس کی گھبراہٹ
میں اضافہ ہوا تھا۔

”اوہ..... میں آپ کو اچھا کیوں نہیں لگا
تھا؟“ اس کے لبوں پر تبسم نگاہوں میں شرارت تھی
جسے محسوس کرتے ہوئے بھی وہ روہا سی ہو گئی تھی۔
”جب آپ ہمارے گھر آئے تھے ہم نے

آپ کو غور سے دیکھا ہی نہیں تھا مگر پھر بھی ہمیں
شادی پر اعتراض نہیں ہوا کیونکہ آپ کو ہمارے
لئے خدیج نے منتخب کیا تھا اور وہ ہمارے لئے کوئی
غلط فیصلہ نہیں لے سکتے اور ان پر یقین کے سبب
ہم آج آپ کے سامنے موجود ہیں۔“ وہ خود کو
کپوز کرتی دھیمے مگر نرم لہجے میں کہتی چلی گئی تھی۔

”سرنے جب آپ کا پوپزل میرے
سامنے رکھا مجھے حیرانگی ہوئی تھی کہ آپ اور
ہمارے اسٹینس میں زمین آسمان کا فرق ہے اور
جب اس فرق کی جانب میں نے اشارہ کیا تو سر
نے بڑی خوبصورتی سے اس مسئلے کو ٹال دیا یہ کہہ
کر کہ یہ اللہ کی مصلحت ہے وہ چاہے جسے جو عطا
کر دے، بس پھر میں نے رضا مندی دکھائی اور
سرنے آپ کی تصویر مجھ دیکھنے کے لئے دے دی
اور میں پہلی نظر میں ہی آپ کے معصوم حسن کا اثر
ہو گیا۔“ وہ بہت نرمی سے تمام تر تفصیل ہی نہیں
حکایت دل بھی اس کے گوش گزار کر گیا تھا اس
کے چہرے کی سرنخی میں حیا کی کچھ اور ملاوٹ ہو
گئی تھی اور آنکھیں الگ الگ حیا کے بار سے مزید جھپکتی
چلی گئی تھیں مگر ذہن کے کسی کونے میں یہ بات
سر سرائے لگی تھی کہ خدیج بخاری نے آگے بڑھ کر
شاعل حمید سے اس کی شادی کی بات کی تھی اور یہ
سر سرائے اسے بے چین کر رہی تھی کہ کیوں
انہوں نے خود سے بات کی؟ وہ مزید بھی کچھ کہہ
رہا تھا مگر اس کی توجہ بٹ چکی تھی اور تب ہی
شاعل حمید کا سیل فون بڑی شد و مد سے بجنے لگا تھا
ان فسون خیز لمحات میں یہ مداخلت اسے سخت بری
لگی تھی اس لئے اس نے کوئی توجہ نہیں دی تھی کہ
میج ٹون سن کر اس نے لامحالہ سائیڈ پر پڑا سیل
فون اٹھا لیا تھا۔

”تمہارے ساتھ تو بڑی نا انصافی ہو گئی ہے
میرے یار، تمہارے نکاح میں جوڑ کی آئی ہے وہ

خدیج بخاری کی اترن ہے۔“ وہ مسیج تھا کوئی قیامت تھی جو اس پر سے گزر گئی تھی، اس کا چہرہ خطرناک حد تک سرخ پڑ چکا تھا اور وہ بیڈ سے اٹھ گیا تھا اور پھٹی پھٹی نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”تمہاری شادی ایک ایسی لڑکی سے ہو گئی ہے جس نے رشتہ تو اپنے کزن خدیج بخاری سے رکھا ہوا تھا مگر دلہن تمہاری بن گئی ہے کہ اس سے خدیج بخاری کا دل بھر گیا تھا تب ہی تو خود آگے بڑھ کر تم سے بات کی اور تم اس کی چکنی چپڑی باتوں اور دولت کی لالچ میں آ گئے، تف ہے تمہاری مردانگی پر جو تم ایک ایسی لڑکی کے ساتھ اپنی گریستی بنانے جا رہے ہو جو کسی کی اترن ہے۔“ دوسرا مسیج اس نے میکانیکی انداز میں کھول کر پڑھا تھا مگر اس کے کانوں سے دھواں نکلنے لگا تھا، ماتھے کی سبز رگیں ابھر آئی تھیں اور اس نے تیسری مسیج ٹون پر موبائل ہی دیوار پر دے مارا تھا۔

”اتنا بڑا دھوکہ۔“ وہ جو کچھ دیر قبل اسے پیار سے دیکھنا نرمی سے بات کر رہا تھا اشتعال کی زد پر کھڑا خونخوار نگاہوں سے اسے گھورتے ہوئے بڑبڑایا تھا۔

”تم جو بھی فیصلہ لو بہت سوچ سمجھ کر لینا کہ یہ جو امیر لوگ ہوتے ہیں محض اپنے مفاد کے ہوتے ہیں، اس رشتے کے پیچھے ان کا کیا مفاد ہے، ہم نہیں سمجھ سکتے، بس تم سوچ لو کہ کہیں زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ غلط طے نہ ہو جائے۔“ اس کی بڑبڑاہٹ کے درمیان ہی میں اسے اپنے کانوں میں اپنی ماں کی آواز گونجتی سی محسوس ہوئی تھی اور اس کی آنکھوں میں مرچیں سی بھرنے لگیں تھیں، اشتعال کی زد پر آتا وہ اس کی طرف بڑھا تھا اور بازو سے جکڑ کر جارحانہ انداز میں اسے بیڈ سے

نیچے کھیٹ لیا تھا وہ اس افتاد پر اگشت بدنداں رہ گئی تھی، اس کا وجود یوں کھینچے جانے پر لڑکھرائی تھی مگر وہ اسے اپنے مقابل کھڑا کر چکا تھا۔

”تمہارا خدیج بخاری سے کیا رشتہ ہے؟“ تمام خوش کن احساسات سمندر کی جھاگ کی مانند بیٹھ گئے تھے، وہ قہر آلود نگاہوں سے اس کے حسین چہرے کو دیکھتا سفر سے پوچھ رہا تھا۔

”چپ رہیں، یا جھوٹ بولا، زندہ زمین میں دفن کر دوں گا۔“ وہ مارنے مرنے پر تلا تھا اور وہ خوف سے کانپنے لگی تھی۔

”ان سے ہمارا کوئی شرعی رشتہ نہیں ہے، وہ ہمارے کزن ہیں، ہمارے لئے عزت و تحفظ کا شجر سایہ دار۔“ وہ خوف کے باوجود اس کو جواب کا منتظر پا کر دھیسے لہجے میں بولی تھی کہ اشتعال کی آخری منزل پر کھڑا شاغل حمید اس پر ہاتھ اٹھا گیا تھا۔

”چٹاخ!“

”عزت کی دہائی تو مجھے کم از کم نہ دینا کہ تحفظ کی آڑ میں تم نے اس شخص کے ساتھ مل کر جو بے حیائی کے کھیل کھیلے ہیں، سب جان گیا ہوں، تمہیں اور اس بے غیرت خدیج بخاری کو کیا لگا تھا کہ سچائی مجھ سے پوشیدہ رہے گی، لیکن نہیں تم دونوں کے سارے کالے کرتوت مجھ پر عیاں ہو گئے ہیں۔“ پھنکارتے ہوئے اسے خود سے دور دھکیل دیا تھا۔

”میں چاہوں تو اتنا بڑا فریب دینے کے جرم میں تمہیں وہ سزا دوں کہ تم کسی کو منہ تک دکھانے کے قابل نہ رہو، مگر حرف تو میری عزت، میری غیرت پر بھی آئے گا اور میں اس خدیج بخاری کی طرح نفس پرست نہیں ہوں کہ حسن دیکھ کر شرعی تقاضے اور خدا کا فرمان ہی فراموش کر ڈالوں کہ دیے بھی میں کسی کے تھوکے ہوئے کو

مجھے اندازہ نہیں تھا کہ ہوینا سے میرا اس طرح ٹکراؤ ہو جائے گا۔“ وہ خود پر سوالیہ نگاہیں محسوس کرتیں کہتی چلی گئی تھیں۔

”یہ لیکن آپ کو ملیں کہاں؟“ وہ جو میکا کی انداز میں اندر کی جانب بڑھنے لگی تھی وہ اس کا بازو جکڑتے اسے روکتے ان سے مخاطب ہوئے تھے۔

”میرے گھر کے نزدیکی اسٹاپ پر یہ اچانک میری گاڑی کے سامنے آگئی تھیں میں نے بروقت بریک لگا کر انہیں نقصان سے بچالیا اور انہیں پہچان کر آپ کے پاس لے آئی، یہ تو میں خود نہیں جانتی یہ وہاں کیسے پہنچی تھیں اور اس حال میں خودکشی کیوں کرنا چاہتی تھیں۔“ وہ سنجیدگی سے تفصیل بتا رہی تھیں جب وقت انہوں نے اسے بمشکل اپنی گاڑی میں بیٹھنے پر راضی کیا تھا تب اس کے کاندھے پر جھولتا اس کا زرتار عروسی آنچل اس کے وجود سے گر گیا تھا تب انہوں نے کئی برسوں سے ڈیش بورڈ پر رکھی سیاہ کشمیری شال اٹھا کر اس کے وجود کی زینت بنا دی تھی، کہ جس شام وہ ان سے بدگمان ہو کر ان سے پچھڑیں تھیں اس سے ایک ماہ قبل کی شام بہت حسین تھی جب انہوں نے اسے بڑی خوبصورت رنگ پہنائی تھی اور سیاہ کشمیری شال یہ کہہ کر گفٹ کی تھی کہ یہ ان کی ماں کی ہے جو وہ ان کی جانب سے ان کی بہو کو بطور شگن دے رہے ہیں، انہوں نے جسے مسکرا کر لیا تھا اور ڈیش بورڈ پر رکھ دیا تھا اور کہا تھا کہ وہ جب عروسی جوڑا پہن کر باہل کی دہلیز عبور کریں گی تب ان کی ماں کی شال کو سر پر دعاؤں کی صورت سجائیں گی مگر یہ دن آنے سے قبل ہی وہ ایک دوسرے سے پچھڑ گئے تھے اور ان میں اتنی ہمت بھی نہ ہوئی تھی کہ اسے وہاں سے اٹھا کر ہی پھینک دیتی کہ ان

چائے والوں میں سے نہیں ہوں، صبح ہوتے ہی یہاں سے دفع ہو جانا، ورنہ کہیں میں اشتعال میں آ کر تمہارے ناپاک خون سے اپنے ہاتھ ہی نہ رنگ بیٹھوں، اس لئے واپس اپنے یار کے پاس چلی جانا۔“ وہ اس کے بے دردی سے دھکیلنے پر منہ کے بل ٹھنڈے فرش پر گری تھی اور اٹھ بھی نہ پائی تھی کہ وہ نفرت سے اسے دھتکارنا ٹھوکر مارتا کمرے سے ہی نکلتا چلا گیا تھا جبکہ کمرے میں وہ بے گناہ و پاک دامن ہوتے ہوئے بھی کسی کی گندی سازش کا شکار ہونی اپنی بدبختی پر ہلک ہلک کر رہی تھی مگر اس کے بین سننے اور اس کی مدد کو آنے والا کوئی نہ تھا اور وہ بے قصور ہوتے ہوئے بھی معسوب ٹھہرا دی گئی تھی۔

☆☆☆

”وہی!“ وہ جو چائے پیتے ہوئے چڑیوں پر نگاہ جمائے کھڑے مطمئن سے مسکرا رہے تھے، دروازہ کھلنے کی آواز پر ان کی توجہ ہٹ گئی تھی اور کھلے دروازے سے اندر داخل ہوتی اجڑی ہوئی سی ہوینا بخاری کو دیکھ وہ بے تابانہ اس تک آئے تھے ان کی پکار میں دنیا جہاں کی فکر سمٹ گئی تھی جبکہ وہ ان کو خالی نظروں سے دیکھنے لگی تھی۔

”وہی! آپ اس وقت یہاں کیسے آئی ہیں؟ بتائیے ہمیں۔“ وہ سرخ عروسی جوڑا پہنے ہوئے تھی، میک اپ کے مٹے مٹے نشانات سرخ متورم چہرہ زرتار آنچل کی جگہ اس کے وجود سے لپٹی سیاہ کشمیری شال، وہ دیکھ کر اتنی بری سچویشن میں بھی چونک اٹھے تھے، جب ہی کھلے دروازے سے کوئی اندر داخل ہوا تھا اور اسے دیکھ کر تو زمین و آسمان انہیں ایک ہوتے محسوس ہوئے تھے۔

”کل رات ایک سرجری کی وجہ سے مجھے لیٹ ٹائٹ تک ہاسپٹل میں اسٹے کرنا پڑا تھا اور اذالوں کے وقت جب میں ہاسپٹل سے نکلی تو

سے بدگمان ہونے کے باوجود کئی برس گزر جانے کے باوجود بھی اس کی انگلی میں ان کے نام کی ہی انگلی تھی جو انہوں نے کسی اور کے نام کی سرخ ردا اور زھ لینے کے باوجود بھی نہ اتاری تھی۔

”وئی! خدا کے لئے آج چپ نہ رہنا، ہمیں بتاؤ کیا ہوا ہے؟ شاغل نے آپ سے کیا کہا۔“ وہ اسے شانوں سے تھام کر جھنجھوڑتے ہوئے بولے تھے۔

”شاغل حمید نے ہمیں آپ کی اترن کہہ کر بے دردی سے ٹھکرا دیا۔“ وہ کسی روبوٹ کی طرح بولی تھی اور وہ گویا کرنٹ کھا کر اس کے شانوں سے ہاتھ کھینچتے فاصلے پر ہو گئے تھے۔

”میں آپ کو کبھی معاف نہیں کروں گی خدیج بخاری، آپ نے محبت کی مجھ سے، مگر رشتہ رکھنا چاہتے ہیں ہوینا بخاری سے، اسی سے تعلق بنانا تھا تو مجھ سے کیوں کی محبت؟ کیوں دکھائے مجھے سنے اور جب میں آپ سے محبت کرنے لگی ہوں، شادی کرنا چاہتی ہوں تو آپ کہتے ہیں کہ آپ مجھ سے محبت نہیں کرتے تو شادی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، میں نہیں ہوں تو پھر وہی حسین بلا ہوینا ہی آپ کی محبت ہے ناں، جس کے لئے میری محبت جھٹلا رہے ہیں۔“ برسوں پہلے کے کہے ان کے لفظ کانوں میں گونج اٹھے تھے۔

”انہیں ہم پر بھروسہ نہیں ہے، ہماری پاکدامنی پر شک ہے۔“ وہ اب سسکنے لگی تھی اور وہ ماضی سے اس کی آواز کے سبب واپس حال میں لوٹ آئے تھے کہ نگاہ کچھ فاصلے پر تماشاکی بنیں ڈاکٹر شمسہ پر اٹھی تھی اور پھر ماضی کانوں میں گونج اٹھا تھا۔

”محبت کو آپ نے محض منہ کا ذائقہ بدلنے کے لئے استعمال کیا، باہر مجھے آپ نے وقت کو رٹکین بنانے کا ذریعہ بنایا اور گھر میں تو ہے وہ آپ

کی لاڈلی وئی آپ کے وقت کو رٹکین و حسین بنانے کو جس کی فکر میں ڈوب کر نہ آپ کو کھانا یاد رہتا ہے، نہ لاکھوں کے نقصان سے فرق پڑتا ہے، جب سے کچھ طے تھا تو میری زندگی کیوں برباد کی؟“ وہ اس پر سے نگاہ ہٹا گئے تھے جس کی آنکھوں میں آج بھی شہر اور بدگمانی رچی تھی۔

”آپ ہم سے پوچھ رہے تھے ناں کہ ہم نے خود کشی کی کوشش کیوں کی تھی؟ مگر ہم نے محض کوشش نہ کی تھی خدیج، سچ میں ہم مر جانا چاہتے تھے کہ ایسی زندگی کا کیا فائدہ جس میں لوگوں کے طعنے اور انہی انگلیاں برداشت کرنی پڑیں، ہماری دوست شہینا نے بھی ہم سے یہی کہا تھا۔“ وہ بات جو ایک ماہ قبل نہ بتائی تھی آج وہ کہتی چلی گئی تھی اس کے چہرے پر تمسخر در آیا تھا جبکہ ان کا چہرہ خطرناک حد تک سفید پڑ چکا تھا۔

”شہینا کے ہر الزام کو دو سے ضرب دے کر مشاغل حمید نے کل رات ہمیں یوں ذلیل کیا ہے کہ ہم آپ سے تو کیا خود سے بھی نظر ملانے کے بھی قابل نہیں رہے۔“ وہ سبز گھاس پر گرتی چلی گئی تھی وہ ہلکتے ہوئے مشاغل حمید کا ہر الزام اپنے منہ سے بتا رہی تھی اور قطرہ قطرہ زندگی اسے بہتی محسوس ہو رہی تھی۔

”ہم شہینا کی باتوں کی وجہ سے ڈسٹرب تھے کبھی بھی شادی کے لئے راضی نہ ہوتے مگر ہم نے آپ کی اور اماں بی کی باتیں سن لی تھیں۔“

”آپ نے اماں بی سے کہا تھا کہ آپ ہم سے رشتے کے معافی نہیں بدل سکتے چاہے کوئی کچھ کہے کیونکہ آپ اپنے عمل سے مطمئن ہیں، آپ کو یقین ہے کہ آپ اللہ کی عدالت میں سرخرو ہوں گے اس لئے بندوں کی عدالت آپ کو اچھا کہے یا برا کہہ کر سنگسار کر ڈالے آپ کو فرق نہیں پڑتا کہ اصل کامیابی اللہ کے آگے سرخرو ہونے

میں ہے مگر آپ بھول گئے تھے خدیج کہ اللہ تو بہت مہربان، غفور و رحیم ہے، وہ بندے کی ہر خطا کے باوجود اسے معاف کر کے سرخرو کر دیتا ہے اور بندے اپنی خود ساختہ عدالت میں بنا جرم کے بھی ایسی سزا سناتے ہیں کہ بندہ جیتے جی مر جاتا ہے، جیسے ہم مر گئے ہیں۔“

وہ کل رات سے مستقل رو رہی تھی مگر وہ ایسے طوفان سے گزری تھی کہ آنسو اور گریہ زاری ختم ہونے کے بجائے بڑھتی جا رہی تھی اور اتنی دیر میں پہلی دفعہ ڈاکٹر شمسہ تھرا کر کانپ اٹھی تھیں اور ترجم بھری نگاہوں سے گھٹنوں کے بل بیٹھی اس لڑکی کو دیکھنے لگی تھیں جس سے انہیں بے انتہا نفرت تھی کہ وہی تو انہیں ان کی خوشیوں کی قاتل لگتی تھی۔

”اپنی تمام تر اچھائی اور پاکدامنی کے باوجود ہم خود کو با کردار ثابت نہ کر پائے اور بد کرداری کا طعنہ لئے واپس لوٹ آئے ہیں کہ دنیا سامنے کی چیز دیکھتی ہے اور سامنے آپ اور ہم ہیں، ہمارا غیر شرعی رشتہ ہے، ہمارے ذہن و دل میں ایک دوسرے کے لئے کیا ہے یہ جاننے کی کوئی کوشش نہیں کرتا، سامنے کا منظر دیکھ پورا ڈرامہ تیار کر لیا جس میں ہم و آپ بد کردار ٹھہرے ہیں۔“ وہ ہلک رہی تھی جبکہ وہ کسی مجسمے کی مانند ساکت و جامد کھڑے تھے اور اس کی گریہ و زاری ڈاکٹر شمسہ کی آنکھیں نم کرنی لگی تھی۔

”ہم مشاغل کو ان کے بے اعتباری کے سبب بتا ہی نہیں پائے کہ آپ کے اور ہمارے درمیان بھائی کی محبت بھی رہی، باپ کی پیتا بھی، بہن کا مان بھی رہا، ماں کی ممتا بھی، بس نہیں رہا کبھی ہمارے درمیان کچھ تو وہ مرد و عورت کے درمیان کی نفس و ہوس نہ رہی۔“ اس کے رونے میں اذیت و تڑپ تھی جو ڈاکٹر شمسہ کو بھی تڑپا گئی

تھی اور وہ بت بنے خدیج بخاری کو دیکھنے لگی تھیں کہ جیسے وہ مشاغل حمید کو اپنی بے گناہی کا یقین دلائے بغیر آگئی تھی یہی تو کچھ برس پہلے انہوں نے بھی کیا تھا، اماں لی بھی وہاں چلی آئی تھیں اور اسے ہلکتے دیکھ رہی تھیں جس کی آنکھوں میں انہوں نے اور خدیج بخاری نے آنسو نہیں آنے دیئے تھے فقط ایک رات میں مشاغل حمید نے اسے خون کے آنسو رلایا تھا۔

”وہی! خدا دکھائی نہیں دیتا، محسوس ہوتا ہے اور رشتے محسوسات کا ہی تو نام ہیں، پاکیزگی و پاکدامنی کا تعلق بھی محسوسات سے ہے، جب اللہ کا وجود محسوس ہوتا ہے تو بندے اور اس کا رشتہ استوار ہوتا ہے، حاکم اور غلام کا رشتہ وجود میں آتا ہے، محسوسات کے بغیر حاکم و غلام کا رشتہ وجود میں نہیں آ سکتا باوجود اس کے کہ اللہ ازل سے موجود ہے، بندہ اللہ کو محسوس نہ کر پائے اس سے اللہ کے وجود پر کوئی فرق نہیں پڑتا، اللہ ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا۔“ لان میں موت کا سا سناٹا چھا گیا تھا، وہ بول بول کر تھک چکی تھی اور اس سناٹے میں اس کی سسکیاں دراڑیں ڈال رہی تھیں جب وہ بت پاش پاش ہوا تھا اور گھٹنوں کے بل عین اس کے سامنے بیٹھ گئے تھے اور انہوں نے اس کے آنسو صاف کیے تھے اور ٹھہرے ہوئے لہجہ میں کہنا شروع کیا تھا یکدم اس کی سسکیاں ختم گئی تھیں، خاموش فضا میں ان کی آواز قہقہے کرنے لگی تھی۔

”پاکیزگی و پاکدامنی کا تعلق بھی محسوسات سے ہے، سمندر میں پانی کے کتنے ہی قطرے جمع ہیں اور ہر قطرہ نہ ناپاک ہے اور نہ ہی پاک، ایسے ہی نہ ہر شرعی رشتہ پاک ہے نہ ہی ہر غیر شرعی رشتہ ناپاک ہوتا ہے، لوگ تو شرعی رشتے کی آڑ میں بھی گناہ کرنے سے باز نہیں آتے اور ہم پر تو

اللہ کا کرم ہے کہ ہم کسی رشتے کے نہ ہوتے ہوئے بھی پاکیزہ زندگی گزارتے رہے اور پاکیزگی کا تعلق جب دیکھنے سے ہے ہی نہیں تو ہماری سوچ و عمل کی پاکیزگی کسی کو کیسے نظر آئے گی؟ لوگ تو اللہ کو محسوس کرنے میں ناکام ہوتے ہیں اس کے وجود سے انکاری ہو کر بت تراش کر بیٹھ جاتے ہیں، لوگ جب اللہ کو نہیں بخشتے تو اس حاکم کے غلاموں کو کیسے بخشیں گے؟ کہ انھی اگلیاں کب تک انھی رہیں گی تھک کر خود ہی جھک جائیں گی، بس اچھائی و نیکی نہیں جھکنی چاہیے، آپ نے جب کچھ غلط کیا ہی نہیں تو کیوں آزرده ہیں؟ باطل کبھی حق سے جیتا ہے؟ جیت تو حق کی ہوتی ہے ناں، تو بس حق پر قائم رہیے، اللہ راستے خود بنا دے گا، یہ تو آپ کی آزمائش ہے۔“ وہ بہت نرم حلاوت بھرے لہجے میں کہہ رہے تھے۔

”ہم اس آزمائش کے اہل نہیں ہیں خد تج! ہم لوگوں کی نگاہوں میں نفرت، لبوں پر اپنے لئے انگارے اگلتے دیکھ نہیں سکتے۔“ وہ ان کی بات کے درمیان نم لہجے میں بولی تھی۔

”آپ کو لوگوں کی پرواہ ہے، جن سے آپ کا تعلق، ہر واسطہ کب سانسوں کی ڈور کے ساتھ ٹوٹ جائے آپ کو اندازہ تک نہیں ہے، جبکہ آزمائش تو زندگی دینے والے رب کی جانب سے ہے آپ اور ہم تو خوش نصیب ہیں کہ اللہ نے ہمیں اپنی آزمائش و امتحان کے قابل سمجھا، آپ اتنے سے گھبرا گئیں، آپ بھول گئیں آزمائش تو آپ کی دینی ماں حضرت عائشہؓ کی بھی ہوئی تھی، مگر وہ پاکدامن خاتون تھیں، انہوں نے صرف اللہ سے لو لگائی اور اللہ نے ان کی پاکدامنی کو یوں ثابت کیا کہ ہر انھی انگلی ٹوٹ گئی، زبانیں بند ہو گئیں اور نگاہیں جھک گئیں اور آپ دنیا و آخرت

میں سرخرو ٹھہریں، اگر آپ بھی غلط نہیں ہیں، پاکدامن ہیں تو خود اللہ آپ کی پاکدامنی کے ثبوت کے لئے راہیں نکال دے گا اور تہمت صرف آپ پر نہیں ہم پر بھی لگی ہے مگر ہم اپنا فیصلہ اپنے اللہ پر چھوڑ چکے ہیں، اب آپ کی مرضی چاہے جو کریں، صبر سے اللہ کی رحمت کا انتظار کریں یا رو رو کر زمین آسمان ایک کرتے ہوئے حرام موت کو گلے سے لگا کر اللہ کی عدالت میں معتب ٹھہریں۔“ وہ ان کے سامنے سے اٹھے تھے اور نکلتے چلے گئے تھے جبکہ ان کے الفاظ دلچے میں کوئی سحر تھا جو اسے باندھ گیا تھا اس کے اندر سے سدا آنے لگی تھی کہ وہ صبر کرے گی، اللہ کی رحمت کا انتظار کرے گی کہ اللہ کے گھر دیر ہے اندھیر نہیں ہے، اس نے آنسو پونچھ لئے تھے اور ڈاکٹر شمسہ اس کے مطمئن ہو جانے والے چہرے کو محض ایک نظر ہی دیکھ پائی تھیں اور شکستگی محسوس کرتیں خود کو ان کا مجرم پاتیں، ہارے ہوئے انداز میں دہلیز عبور کر گئی تھیں کہ وہ بہت چاہ کر بھی وہاں اب نہ ٹھہر سکتی تھیں، نہ ہی اپنے کیے کی، اپنی سوچ کی معافی طلب کر سکتی تھیں کہ وہ دونوں ہی اپنا فیصلہ رب پر چھوڑتے انہیں شکستہ چھوڑ گئے تھے۔

☆☆☆

”السلام علیکم!“ چائے پیتے خدیج بخاری نے آواز پر سراٹھایا تھا اور تین ماہ بعد مشاغل حمید کو سامنے پا کر ان کے چہرے کے عضلات تن سے گئے تھے، جبکہ اماں بی کے ساتھ بیٹھی ہوینا کی رنگت لٹھے کی مانند سفید پڑ گئی تھی۔

”اب یہاں کیا لینے آئے ہو، اسی وقت یہاں سے اپنی مکروہ صورت لے کر دفنان ہو جاؤ۔“ اماں بی غصہ سے پھنکاری تھیں۔

”پلیز اماں بی غصہ نہ کیجئے، مشاغل

ہمارے مہمان ہیں اور ہم گھر آئے مہمان کو بے عزت نہیں کر سکتے۔“ مشاغل حمید کی رنگت متغیر ہو گئی تھی مگر وہ کچھ بول نہیں پایا تھا مگر وہ جب بولے تھے اپنے مخصوص نرم ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولے تھے اور اسے بیٹھنے کو کہہ دیا تھا، مشاغل حمید ان کے رکھ رکھاؤ اور نرمی پر خود کو بہت چھوٹا محسوس کرنے لگا تھا۔

”ہوینا! مجھے معاف کر دیں۔“ اس میں اتنی ہمت بھی نہ تھی کہ وہاں سے چلی جاتی اور گزری رات کی اذیت اس کے چہرے سے عیاں ہونے لگی تھی، اس کے آنسو موتیوں کی طرح رخساروں پر لڑھکتے جا رہے تھے کہ وہ اس تک آیا تھا اور اس کے سامنے باقاعدہ ہاتھ جوڑ دیئے تھے اس کے اس عمل پر وہ دونوں ششدر رہ گئے تھے جبکہ اس کی سسکیاں کمرے میں گونجنے لگی تھیں۔

”میں نے آپ کے کردار پر انگلی اٹھائی، آپ پر تہمت لگائی، مجھے معاف کر دیں ہوینا۔“ اس کا لہجہ بھیگ گیا تھا کہ حالات بعض اوقات انسان کو اس سچ پر لے جاتے ہیں کہ وہ جلد بازی میں ایسا قدم اٹھا لیتا ہے کہ اس کا عمل پچھتاوا بن جاتا ہے جیسے وہ اپنے عمل پر پچھتاوا آج مجرموں کی طرح سر جھکائے کھڑا تھا۔

”شادی کی شب مجھے ایسے میسجز موصول ہوئے کہ میں اپنے سوچنے سمجھنے کی ہر صلاحیت کو ہی فراموش کر گیا۔“ وہ اس کے رونے پر مزید پشیمان ہوا تھا اور بھیکے لہجے میں کہتا چلا جا رہا تھا اس بات کی پرواہ کیے بغیر کہ کوئی اس کی بات سننا بھی چاہتا ہے یا نہیں، وہ لب بھینچے کھڑے تھے اور اس کی سسکیاں ہر گزرتے لمحے کے ساتھ بلند ہوتی جا رہی تھیں۔

”اگر میں آپ پر الزامات کی بوچھاڑ کرنے

کی بجائے اپنے شک کی تصدیق کر لیتا تو حالات یکسر مختلف ہوتے، نہ آپ اذیت میں ہوتیں اور نہ میں پشیمان ہوتا، مگر میں وہ گھٹیا قسم کے میسجز پڑھ کر آپ سے اور سر سے بدگمان ہو گیا اور آپ کو نفرت سے دھتکار کر اپنے گھر سے نکل جانے کو کہہ دیا اور میں تین ماہ اسی گھمنڈ میں رہا کہ میں نے ایک بد کردار عورت کو اپنے گھر میں نہ بسا کر بہت بڑا کارنامہ سرانجام دیا ہے مگر کل رات مجھ پر منکشف ہوا کہ جھول آپ کے کردار میں نہیں، میری نیت میں تھا، میری جلد بازی کا سارا قصور تھا اور کل ہی میرا سارا گھمنڈ چکنا چور ہو گیا اور مجھے اپنا وجود پاتال میں گرا محسوس ہو رہا ہے کہ میں کیسے اتنا اندھا ہو گیا کہ بغیر کسی ثبوت کے ایک عورت پر تہمت لگائی۔“ اس کے لہجے سے یاسیت و پشیمانی عیاں ہو رہی تھی اور وہ اب تک اس کے سامنے ہاتھ جوڑے اور نظر جھکائے کھڑا تھا اور تفصیل بتانے لگا تھا کہ کیسے اس پر تمام حقیقت کھلی، صفر حیات کا اسی صبح کی شام جب وہ اجڑ کر لوٹ آئی تھی بہت برا ایکسیڈنٹ ہوا تھا جس میں اس کا پورا جسم مفلوج ہو گیا تھا، اس کی دولت اور اس کی دوستیاں اور رشتے کچھ کام نہیں آ رہا تھا، ہر گزرتے دن کے ساتھ اس کا ہر رشتہ اس سے دور ہو گیا تھا اور وہ ہاسپٹل کے بیڈ پر کسی ناکارہ شے کی مانند پڑا تھا اور وہ اسی ہسپتال میں تھا جس میں ڈاکٹر شمسہ اپنے فرائض انجام دے رہی تھیں وہ انہی کا پیشہ تھا، انہیں ہر گزرتے دن کے ساتھ ہی لگتا تھا کہ جیسے وہ کچھ کہنا چاہتا ہے مگر اس کی حالت میں کسی قسم کا سدھار نہ تھا اور دو ہفتے قبل اس کی حالت بہت بگڑ گئی تھی اور اس کے اشارے سمجھتے ہوئے انہوں نے اسے کاغذ پنسل پکرائی تھی، جس پر اس نے اپنی تمام تر طاقت لگا کر تین نام درج کر دیئے تھے۔

”ہوینا..... خدج..... مشاغل۔“ وہ ناموں کو دیکھ کر ہی چونک اٹھی تھیں۔

”یہ نام، تم کیا کہنا چاہتے ہو؟“ وہ بے قراری سے پوچھ رہی تھیں مگر اس کی حالت بگڑنے لگی تھی اور وہ اس کے معالج ہونے کے باوجود اس کا ٹریٹمنٹ نہیں کر پائی تھیں کہ وہ تو ناموں پر ابھی تھیں۔

”بتاؤ مجھے کیسے جانتے ہو انہیں، کیا کہنا چاہتے ہو؟“ اس کی حالت نظر انداز کیے انہوں نے اس کوشانوں سے پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا تھا اور اس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے تھے اور اس نے بگڑتی ہوئی حالت کے ساتھ کچھ اشارے کیے تھے جو وہ پریشانی میں محسوس نہیں کر پائی تھیں اور وہ ان کے سوالوں کا جواب دیئے بغیر اذیت سے تڑپتے ہوئے معافی کی خواہش دل میں لئے دنیا سے چلا گیا تھا اور وہ مستقل اس کے بارے میں ہی سوچ رہی تھیں اس کے والدین سے بھی ملی تھیں لیکن سب بے سود رہا تھا اور وہ ایک ہفتہ بیمار رہنے کے بعد پھر سے ہاسپٹل آنے لگی تھیں۔

”ڈاکٹر صاحبہ! کیا آپ اس شخص کو جانتی تھیں جو اس کے دیئے اشارے کو سمجھ گئی تھیں کہ ان ناموں کے ذریعے مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آیا تھا۔“ نرس کے ذہن میں جو سوال گردش کر رہے تھے وہ پوچھے بغیر نہیں رہی تھی اور وہ یہ نہیں بولی تھیں کہ وہ اس شخص کو نہیں، ان ناموں کو جانتی تھیں۔

”نہیں اور مجھے زندگی بھر افسوس رہے گا کہ میں یہ جان نہیں پائی کہ آخر وہ کہنا کیا چاہتا تھا؟“ وہ یاسیت سے بولی تھیں۔

”ڈاکٹر صاحبہ! آپ نے شاید اس وقت نوٹ نہیں کیا تھا مگر مجھے لگا تھا جیسے وہ موبائل فون کی جانب اشارہ کر رہا تھا۔“ نرس کی بات پر وہ

چونک اٹھی تھیں۔

”یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟“ بے قراری سے بولی تھیں۔

”اس وقت آپ بھول گئی تھیں کہ آپ ڈاکٹر ہیں اور اس مرتے ہوئے شخص کا آپ نے علاج کرنا ہے اسی لئے میں نے ڈاکٹر وارٹی کو بلانے کے لئے اپنے سیل فون سے انہیں کال کی تھی، جب میں نے اس کی نگاہیں محسوس کی تھیں اور مجھے یہی لگا تھا جیسے وہ کسی سے بات کرنا چاہتا ہے۔“ نرس آگے بھی کچھ کہہ رہی تھی مگر ان کے کانوں میں سسکتی ہوئی بھیگی آواز گونج اٹھی تھی۔

”مشاغل ہم سے بہت نرمی و عزت سے بات کر رہے تھے کہ ان کے موبائل پر کال اور میسجز آنے لگے اور پھر ان کا ہم سے رویہ بدل گیا، انہوں نے ہمیں نفرت سے دھتکار دیا۔“

نرس اور ہوینا کی باتیں گڈ مڈ ہونے لگیں اور انہوں نے دوڑ لگا دی، دیوانوں کی طرح بھاگتے ہوئے پارکنگ تک پہنچی تھیں اور ریش ڈرائیونگ کر کے وہ صفدر حیات کے گھر پر موجود تھیں اس کی والدہ انہیں دیکھ چڑ سی گئیں تھیں کہ پہلے ہی انہوں نے ان کا بہت وقت برباد کیا تھا۔

”صفدر کا سیل فون مجھے نہیں پتہ کہاں ہے؟“ آپ پلینز یہاں سے جاؤ، اب آپ نے ہمارے گھر آ کر ہمیں پریشان کیا تو ہم پولیس سے رابطہ کریں گے۔“ انہوں نے چھوٹے ہی صفدر کے موبائل کا پوچھا تھا تب وہ قدرے غصہ سے بولی تھیں۔

”آپ صرف ایک بار مجھے صفدر کے کمرے میں اس کا موبائل ڈھونڈنے دیں، باخدا اس کے بعد میں آپ لوگوں کو پریشان نہیں کروں گی۔“ انہوں نے باقاعدہ جی انداز میں کہتے ہوئے ان کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے تھے اور انہوں نے

نہ چاہتے ہوئے بھی انہیں اجازت دے دی تھی، صفدر کا سیل فون اس کے بیڈ کی سائیڈ ٹیبل کی دراز میں رکھا ہوا با آسانی مل گیا تھا کیونکہ اللہ نے اس کی بے گناہی اسی طور ثابت کرنی تھی اور جس دن صفدر کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا وہ سیل فون ساتھ نہیں لے گیا تھا کہ ویسے بھی یہ اس کا خفیہ نمبر تھا اسی سے وہ اکثر لڑکیوں کو تنگ کرتا تھا، ڈاکٹر شمس نے سب سے پہلے کانیکٹ لسٹ اوپن کی تھی مگر انہیں ہوینا کا یا مشاغل کا نمبر نہیں معلوم تھا اس لئے وہ کانیکٹ لسٹ میں ان دونوں کے نمبر موجود ہونے کے باوجود پہچان کا مرحلہ طے نہیں کر سکی تھیں اور انہوں نے ڈائل کیے نمبرز اوپن کیے تھے، صفدر نے رات کے ڈھائی بجے کانیکٹ لسٹ میں ”رقیب“ کے نام سے محفوظ نمبر پر تین مسڈ بیلز دی تھیں کہ کال ریسو نہیں کی گئی تھی، انہوں نے ڈیٹیلز کو بغور دیکھا دو بارہ ریڈ کیا تھا اور تاریخ انہیں چونکا گئی تھی کیونکہ سولہ اگست کو وہ خدیج بخاری سے پچھڑی تھیں اس لئے یہ تاریخ انہیں فراموش نہیں ہوتی تھی اور جس صبح انہوں نے اسے بخاری ولاز چھوڑا تھا اس دن سولہ اگست تھی اور آخری کی گئی کال سولہ اگست دو بج کر پینتیس منٹ کی تفصیل ظاہر کر رہی تھی، ان کا ذہن کچھ اور ہی سوچنے لگا تھا وہ اصل بات کی تہہ میں تقریباً اتر گئی تھیں اور کچھ سوچ کر اب انہوں نے میسجز اوپن کیے تھے اور جیسے جیسے ”رقیب“ کے نمبر پر سینڈ کیے میسجز وہ پڑھتی جا رہی تھی ان کے چہرے کی رنگت بھی بدلتی جا رہی تھی، کہ میسجز پر انتہائی گھٹیا الفاظ لکھے گئے تھے ایک کے بعد ایک میسج اوپن کر کے انہوں نے پانچ میسجز پڑھے تھے جبکہ جسے بھیجے گئے تھے اس نے آخر کے دو میسج تو پڑھے ہی نہ تھے کہ تین میسجز ہی اسے بدگمان کر گئے تھے ایک کے بعد ایک میسج اوپن کرتے

ہوئے چھٹا میسج انہوں نے اوپن کیا تھا۔
 ”شینا ڈارلنگ! میں نے جو سوچا تھا وہ انجام بھی دے گیا ہوں کہ جس لڑکی پر صفدر حیات کا نظر انتخاب ٹھہرا تھا وہ اگر صفدر حیات کی بانہوں میں نہیں آسکتی تو اسے اتنی آسانی سے کسی اور کا بھی بننے نہیں دوں گا کہ میں تو اس کے حسن کے جلوے سوچ سوچ کر بے بسی محسوس کروں اور وہ میرا رقیب جو اسے لے اڑا ہے اس کے ساتھ مزے کرے تو ایسا نہیں ہوگا کہ جو کچھ میں اس کو میسج کے ذریعے کہہ چکا ہوں اس کے بعد بھی عزت سے تو کیا نفرت کے ساتھ بھی اپنے گھر میں بسائے گا تو اس سے بڑا بے غیرت دنیا میں نہ ہوگا۔“ ان کی آنکھوں سے آنسو گر رہے تھے کہ وہ بے خیالی میں وہ ٹیکسٹ بھی پڑھ چکی تھیں جو شینا کو کیا گیا تھا، انہوں نے خود کو بہت ملامت کی تھی کہ انہیں خود میں اور صفدر حیات میں کوئی فرق نظر نہیں آ رہا تھا کہ اس نے ہوینا بخاری کی کردار کشی کی تھی اور انہوں نے خدیج بخاری کی وہ سیل فون اپنے ساتھ لے آئی تھیں اور اپنے نمبر سے رقیب کا نمبر ڈائل کیا تھا اور اس سے مل کر سیل فون اسے دے دیا تھا ان کی ہی مانند مشاغل حمید بھی منہ کے بل گرا تھا۔

”مجھے معاف کر دیں ہوینا۔“ جیسے ہی تمام تر تفصیل کا اختتام ہوا تھا کمرے میں سناٹا چھا گیا تھا اور سنائے میں اس کا رونا بلکنا دراڑیں ڈالتا جا رہا تھا کہ وہ ہارے ہوئے شکستہ انداز میں گھٹنوں کے بل اس کے قدموں میں جھک گیا تھا اور نہ صرف اپنے جرم کی معافی لبوں سے مانگی تھی اس کے پاؤں بھی پکڑ لئے تھے۔

”میں آپ کا گناہ گار ہوں ہوینا، مجھے بخش دیں۔“ وہ اس کے پاؤں پکڑے بچوں کی طرح رو رہا تھا کہ وہ دو قدم پیچھے ہو گئی تھی۔

”ہم انہیں معاف نہیں کر سکتے، معاف نہیں کر سکتے۔“ وہ اذیت زدہ لہجے میں بولی تھی اور وہ اپنے آنسو صاف کرتے اس تک آئے تھے۔

”ہم نے آپ سے کہا تھا ناں کہ اللہ سب سے بڑا منصف ہے وہ ضرور ہمارے ساتھ انصاف کرے گا، آپ کو آپ کے صبر کا پھل مل گیا ہے وئی اور جس اللہ کے لئے آپ نے صبر کیا تھا اسی اللہ کے لئے مشاغل کو معاف بھی کر دیں کہ اللہ معاف کرنے والوں کو بہت پسند کرتا ہے۔“ ان کا وہی نرم عاجزانہ سا انداز تھا وہ رونا بھول کر انہیں دیکھنے لگی تھی، اس کی آنکھوں میں واضح شکوہ تھا اور وہ اس کی آنکھوں کی تحریر پڑھتے دھیمے سے مسکا دیئے تھے۔

”ہم آپ کی جگہ ہوتے تو تب بھی ہم اتنی آسانی سے اپنے مجرم کو معاف کر دیتے۔“ انہوں نے اس کی آنکھوں کی تحریر زبان سے کہی تھی اور اس کے آنسو گرنے لگے تھے۔

”ہاں کیونکہ کردار کشی صرف عورت کی نہیں ہوتی کہ انگلیاں اٹھانے والے مرد کے بے داغ کردار کو بھی اپنے شک کی آگ سے جلا کر خاکستر کر دیتے ہیں جس اذیت سے آپ محض چار ماہ گزری ہیں ہم نے یہ اذیت چھ سال برداشت کی ہے۔“ ان کی آنکھیں یکدم لہورنگ ہو گئی تھیں اور وہ تینوں ہی انہیں دیکھنے لگے تھے۔

”اور پھر بھی ہم انہیں معاف کر چکے ہیں کہ ہم نے اپنا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیا تھا اور اس منصف نے جب انصاف کر دیا ہے ہمیں اپنی رحمت سے بندوں کی عدالت میں بھی سرخرو کر دیا ہے تو ہم کیوں اپنے رب کی نافرمانی کے مرتکب ہوں کہ ہمارا اللہ معاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے اور ہماری دی ایک معافی اگر ہمیں ہمارے اللہ کے قریب کر سکتی ہے اس کے پسندیدہ لوگوں

کی صف میں جگہ دے سکتی ہے تو ہزار تو لاکھوں اذیتیں بھی فراموش کی جا سکتی ہیں اور ہم نے اپنے رب کی رضا کے لئے انہیں معاف کر دیا ہے اور آپ مشاغل کو معاف کرتی ہیں یا نہیں، یہ آپ کا ذاتی فعل ہو گا، بس ہم تو یہی چاہتے ہیں کہ آپ خوش رہیں۔“ ان کے خوب رو چہرے پرسکون و اطمینان رقم تھا اور انہوں نے فیصلے کی ڈور انہیں سونپ کر بات ہی ختم کر دی تھی اور اس نے اپنے سر پر ٹھہرے ان کے دست شفقت پرسکون سے ایک فیصلہ لے لیا تھا کہ جب وہ اتنے اچھے اور پرسکون تھے تو ان کی پرورش و تربیت انہی کے ہاتھوں میں ہوئی تھی اس لئے وہ ان کی سوچ کی مخالفت نہیں کر پائی تھی اور مطمئن سی ان کی روش پر چل پڑی تھی کہ یہی سیدھا اور فلاح کا راستہ تھا۔

☆☆☆

”ہم نے آپ کو معاف کی رمث!“ ان کے الفاظ کیا تھے اس کے رونے میں شدت آگئی تھی کہ اس نے جس وقت انہیں ایک ٹیکسٹ کیا تھا تو اسے امید نہیں تھی کہ وہ آجائیں گے اور اس کی آنکھوں میں حیرت دیکھ کر بولے تھے۔

”آپ کی پکار پر ہم سے رہا نہیں کیا، ہم آپ کے بلانے کے سبب اور مقصد سے انجان صرف یہاں تک اس لئے آئے کہ آپ کو انتظار کی اذیت نہیں سونپنا چاہتے تھے۔“ وہ انہیں دیکھ کر کچھ بول نہیں پائی تھی کہ وہ اپنے ازلی سنجیدہ لہجے میں شروع ہو گئے تھے اور اس کے آنسو گرنے لگے تھے کہ وہ اس کے بلانے کا مقصد ہی جان گئے تھے اور وہ ندامت سے کوئی معافی کے لئے اپنے منہ سے کوئی لفظ ادا کرتی کہ وہ اسے معافی نامہ ہی دے گئے تھے۔

”یہ آپ کیا کر رہی ہیں؟“ ان کے خود ہی

بنا معافی طلب کیے معاف کر دینے پر وہ خود کو بہت چھوٹا سمجھنے لگی تھی اور وہ جو جانے لگے تھے ان کے پاؤں جکڑ گئی تھی اور وہ تو اپنے پورے وجود سے کانپ اٹھے تھے۔

”میں آپ کی مجرم ہوں خدیج، گناہ سرزد ہوا ہے مجھ سے، مجھے یوں اتنی آسانی سے معاف نہ کریں، مجھے سزا دیں کہ میرا گناہ معافی کے لائق نہیں ہے۔“ وہ اس سے اپنے پاؤں چھڑاتے ناصطے پر ہوئے تھے اور وہ ہلکتے ہوئے کہتی چلی گئی تھی۔

”آپ خود کو ہمارا مجرم مانتی ہیں ہو سکتا ہے ایسا ہو مگر ہمارے دل کی عدالت میں آپ ہمیشہ سرخرو رہی ہیں اور جب ہمارا دل ہی آپ کو مجرم نہیں مانتا، تو ہم دماغ کی خاطر کیسے آپ کو مجرم تسلیم کر کے سزا دے ڈالیں کہ آپ کو سزا دینے کا مطلب ہے خود کو سزا دینا اور ہم تو پچھلے کئی طویل سالوں سے سزا جھیل رہے ہیں، مزید کسی سزا کسی تکلیف و آزار کے محمل نہیں ہو سکتے۔“ وہ جذباتی لہجے میں اذیت کے رنگ سجائے کہتے چلے گئے تھے اور وہ رونا بھول کر انہیں دیکھنے لگی تھی۔

”درد جتنا گہرا ہوتا ہے، محبت اتنا ہی اثر رکھتی ہے اور ہم نے تو آپ سے ہر سود و زیاع کے امتیاز کو بھلا کر محبت کی تھی، آپ نے جب تک محبت کا جواب محبت سے دیا ہم آپ کے رہے اور جب آپ کی محبت نے نفرت، بدگمانی و شک کے رنگ اپنائے ہم تب بھی آپ کے ہی رہے کہ بدگمان تو آپ ہوئیں تھیں، ہماری محبت، ہمارے کردار پر تو آپ کو شک تھا، ہمیں نہیں، تو ہم کیسے آپ کی محبت دل سے نکال کر آپ کو فراموش کر دیتے؟“ وہ اس کی آنکھوں کی بے یقینی کو پڑھتے ہوئے آزر دگی سے بولے تھے۔

”آپ میری بدگمانی کو دور تو کر سکتے تھے؟“

مجھے بتا سکتے تھے ناں کہ میں غلط ہوں۔“ وہ ان کے عین سامنے آن رکی تھی۔

”آپ کو ہم پر ہماری محبت پر اعتبار نہیں تھا، ہماری خاموشی پر آپ کو اعتبار نہ آیا تو آپ ہماری زبان سے نکلے کسی لفظ پر اعتبار کر لیتیں؟“ وہ سرخ آنکھوں سے ان کے متورم چہرے کو دیکھتے دگرنگی سے سوال کر گئے تھے اسے برزخ میں اتار گئے تھے۔

”مجھے اعتبار کرنا محبت کرنا ہی نہیں آیا، میں آپ سے محبت کرنے کے باوجود شک کی اندھی آگ میں جھلکتی آپ کو خود سے دور کر گئی، اتنے سال آپ سے دور رہی، بدگمان رہی، کبھی خیال آیا بھی کہ آپ ایسے نہیں ہیں، آپ ایسے ہو نہیں سکتے، اپنے ہی خیال کو جھک کر بدگمانی کو مضبوط کرتی رہی، آپ سے بیک وقت محبت و نفرت کرتی رہی، ہوینا سے نفرت کرتی رہی اس کے لئے بددعائیں کرتی رہی۔“ وہ ان کے قدموں میں ہی گرتی چلی گئی تھی۔

”میں نے آپ سے بہت محبت کی تھی اور جب آپ ہوینا کے لئے اپنی فکر دکھاتے تھے تو مجھے اچھا نہیں لگتا تھا مگر میں نے کبھی ظاہر ہی نہیں کیا اور جب آپ نے مجھ سے شادی سے انکار کیا تو مجھے لگا کہ میرے خدشے جیت گئے، ہوینا نے آپ کو مجھ سے چھین لیا ہے۔“ وہ ہچکیوں کے درمیان بول رہی تھی اور وہ دو قدم پیچھے لے گئے تھے اور ضبط سے اس کو سن رہے تھے۔

”آپ کی آنکھوں میں صرف میں رہنا چاہتی تھی اور جب آپ نے شادی سے انکار کیا تو میں نے وہ تمام اسباب گھڑ لئے جو سوچے تک نہ تھے اور میرے لگائے ہر الزام کو آپ نے خاموشی سے سن لیا، میں آپ کی طرف سے بے اعتبار و بے یقین ہو گئی تھی تو آپ نے بھی مجھے یقین د

اعتبار سوچنے کی کوشش نہ کی۔“ وہ نم آنکھوں میں شکوے لئے انہیں دیکھنے لگی تھی۔

”ہم آپ کی سوچ سے انجان تھے، نہیں جانتے تھے کہ آپ ونی کے بارے میں کس طرح سوچتی ہیں کہ وہ تو اس وقت محض میٹرک کی اسٹوڈنٹ تھیں ہم انہیں ایک بچی کی طرح ٹریٹ کرتے تھے، وہ دنیا میں ہمارا واحد رشتہ ہیں اسی لئے ہم ہمیشہ ان کے لئے فکر مند رہے، آپ ان کے لئے کس حد تک غلط گمان کرتی ہیں یہ تو ہی اس دوپہر پتہ چلا جب ہم نے آپ سے شادی نہ کرنے کی بات کی، ہم تو حیران رہ گئے تھے کہ ہمارے انکار سے ونی کا کیا تعلق؟ اور جب آپ نے ونی اور ہمارے متعلق مغلظات اپنی زبان سے نکالے تو ہمارے دل نے خواہش کی تھی کہ زمین پھٹے اور ہم اس میں سما جائیں لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا رمشہ! آپ کہتی رہیں اور ہم سنتے رہے، ہم نے وہ سب سنا جو ذہن و دل کے پردے پر کبھی نہیں لہرایا تھا مگر ہم نے اپنی صفائی میں ایک لفظ نہیں کہا کہ اپنی صفائی پیش کر دیتے تو آپ شرمندہ ہوتیں اور ہم آپ کو شرمندہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔“ وہ ان سے قدرے فاصلے پر کارپٹ پر گر سے گئے تھے۔

”آپ کو صفائی پیش کر دیتے تو آپ شادی کا مطالبہ کرتیں، ہم سے شادی نہ کرنے کا جواز مانگتیں جو ہم نہیں دے سکتے تھے اس لئے آپ کو بدگمان ہی چھوڑ کر آپ سے جدا ہو گئے، لیکن آپ کی جدائی نے ہمیں جتنا نہیں مارا، جتنا آپ کے لفظوں آپ کے شک نے ہم سے لمحہ لمحہ جینے کا حق چھینا ہے، آپ اتنی بے رحم کیسے ہو سکتی ہیں رمشہ، کہ آپ نے یوں ہمیں اپنی نظروں سے گرا دیا؟ خود کو ہم سے چھین لیا؟ ہمیں اذیتوں کے حوالے کر دیا، ہم سے ہماری ونی کو چھین لیا، وہ

ونی جو ہمارے چاچا کی بیٹی تھیں، جنہیں ہم بیٹا کہتے تھے، جو ہمارے ہاتھوں میں پلی بڑھی تھیں، ہمارا ہاتھ ان کے سر پر دست شفقت بن کر ٹھہرتا تھا اور آپ نے محض اپنے شک و بدگمانی کے سبب ونی کو بے سارباں کر دیا، ہم نے ان سے نرم لہجے میں بات کرنی چھوڑ دی، ان کے سر سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا، وہ ہماری طرف لپکتی رہیں اور ہم ان سے کنارہ کشی کرتے گئے اور پھر بھی ہماری ذات ہمارا کردار پھر سوال بن گیا، شاغل حمید پر بھروسہ کیا اور انہوں نے بھی آپ کی روش اپنائی، ونی کو بے اعتبار کر ڈالا، ہم کہا غلط تھے رمشہ؟ جو ہمارے ساتھ آپ نے اور شاغل نے اتنی سنگدلی دکھائی ہمارا ہر سالس ہمارے لئے آزار بنا دیا۔“ ان کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے تھے۔

”آپ کو کھونے سے ڈرتی تھی اور جب آپ نے جدائی کا پروانہ تھمایا تو مجھے یہی لگا کہ آپ ہوینا کی وجہ سے مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتے میرے سوچنے، سمجھنے کی ہر صلاحیت ہی مفلوج ہو گئی تھی۔“ وہ سسک اٹھی تھی۔

”اور ایسی کیا بات تھی کہ آپ نے میری غلط فہمی دور نہ کی، بتائیے مجھے کیوں کیا تھا آپ نے مجھ سے شادی سے انکار کہ آج آپ کو میں چپ نہیں رہنے دوں گی، آپ کی خاموشی کی میں نے پہلے ہی بہت سزا جھیلی ہے، صغیر حیات کے موبائل فون کے ذریعے سچائی مجھ پر نہ کھلتی تو مزید جھیلی رہتی، دنیا تو اپنی خراب کر ہی لی تھی، دو پاک باز لوگوں پر بہتان باندھنے کے سبب میری آخرت بھی خراب ہوئی۔“ اس کے رونے میں بدستور اضافہ ہو رہا تھا۔

”ہم نے آپ کو معاف کر دیا ہے اور اللہ سے دعا کریں گے کہ آپ کو معاف کر دیں۔“ وہ آستین کے کف سے آنسو گڑتے کھڑے ہو گئے

تھے۔

”جواب دیئے بغیر نہیں جا سکتے آپ خدیجہ!“ وہ ان کا بازو تھام گئی تھی۔

”گزر اوقت آنہیں سکتا رمشہ! جو ہوا اسے بھول جائے اور یہ یقین رکھئے گا کہ آپ کے ہر الزام نے کیسے ہی ہمارا جگر چھلنی کیا ہو، آپ کے الفاظ کی بازگشت ہماری نیند کی راہ میں آئی رہی ہو ہم نے آپ کے لئے کبھی دست بد دعا بلند نہ کیا، ہمیشہ اللہ سے آپ کے لئے دعا کی، ہم نے مشکل وقت کو اللہ کی رضا جان کر گزارا اس لئے آپ کو معاف کرنے نہ کرنے کا سوال ہی نہیں ہے۔“ وہ اپنے مخصوص ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہتے چلے گئے تھے۔

”ہم آپ کے اطمینان کے لئے ذہن و دل کی سچائی و آمادگی سے کہہ دیتے ہیں کہ ہم نے آپ کو معاف کیا، آپ خود کو ہمارا مجرم سمجھنا چھوڑ دیں۔“ وہ نرمی سے اس کا ہاتھ اپنے بازو سے ہٹا گئے تھے۔

”خاموشی اور ایثار ہر مسئلے کا حل نہیں ہوا کرتے خدیجہ اور آپ نے جو غلطی چار سال پہلے کی تھی اس کو دہرا رہے ہیں، مجھے میری انجھنوں کے ساتھ چھوڑ کر جا رہے ہیں، جبکہ سوال کے جواب نہ ملیں تو بدگمانی کو جنم دیتے ہیں، پہلے شاید میری محبت کی شدت نے مجھے آپ سے بدگمان کر دیا تھا اور ایسا پھر ہوا تو اس میں آپ کی اچھائی کا ہاتھ ہو گا۔“ اس کی نرم مگر بھاری آواز پر ان کے قدم ہتھم گئے تھے۔

”جب آپ کو پہلی دفعہ یونیورسٹی میں دیکھا تھا ہم نے تب ہی فیصلہ کر لیا تھا کہ آپ سے ہی شادی کریں گے اسی لئے تو ماں جی کی شال آپ کو دی تھی۔“ وہ ان دونوں کی یادوں ان خوشگوار لمحات میں کھو سے گئے تھے۔

”مگر ہم نے سوچا بھی نہیں تھا کہ قسمت ہمارے ساتھ اتنا بھیاں ک مذاق کرے گی، ہمیں اپنی خواہشات، اپنے ارمان اپنے ہی قدموں تلے روند کر آپ سے اپنی راہیں الگ کرنی پڑیں گی۔“ انہوں نے اذیت سے اپنے لب بھینچ کر گویا خود کمپوز کرنے کی ناکام کوشش کی تھی۔

”آپ کی خوشیوں، آپ کی آسودگی اور آپ کے وجود کی تکمیل کے لئے ہمیں ایک ایسا فیصلہ لینا پڑے گا کہ ہم اندر سے مرجائیں گے مگر ہم نے آپ کے لئے اپنا نہیں سوچا، ہمارے ساتھ میں آپ کی نا آسودگی پھن پھیلائے بیٹھی تھی اس لئے ہم نے آپ سے کہہ دیا کہ ہم آپ سے شادی نہیں کر سکتے کہ رمشہ ہم ایک حادثے میں بہت بڑی کمی کا شکار ہو گئے تھے اور ہم سے شادی کے بعد جس کی آپ بھی شریک بن جاتیں اور یہ ہمیں گوارہ نہیں تھا رمشہ، کہ ہم آپ کو دھوکا دیتے، آپ کو آپ کے حق سے محروم کر دیتے۔“ ان کے چہرے پر اذیت کا جال بچھا ہوا تھا۔

”ہم باپ نہیں بن سکتے رمشہ۔“ اس نے یکدم ان کے چہرے کی جانب دیکھا تھا ان کا چہرہ آنکھیں لہو رنگ ہو رہی تھیں اور وہ اس وقت ایسی اذیت سے گزر رہے تھے جیسی اذیت انہوں نے یہ روح فرسا خبر سن کر محسوس کی تھی اور وہیں کھڑے کھڑے مر سے گئے تھے۔

”اور ہم آپ کو اپنی کمی کا شریک نہیں بنا سکتے تھے اس لئے شادی سے انکار کیا اور آپ نے ہماری تکلیف کو جانے بنا ہمارے اقدام کو سمجھے بنا ہمیں اپنی ہی نہیں خود ہماری نظروں سے بھی گرا دیا، آپ کے الزام پر جتنا دکھ نہیں ہوا تھا جتنی تکلیف دنی کے حوالے نے دی تھی اور جب جب آپ کے الفاظ کی بازگشت بڑھی ہم نے سوچا کہ ہم آپ کو معاف نہیں کر پائیں گے کہ

آپ نے ہم سے ہمارا واحد رشتہ چھین لیا تھا لیکن جب آپ نے نیکسٹ کیا کہ آپ ہم سے ملنا چاہتی ہیں ہم آپ کے گھر آ جائیں تو ہم انکار نہیں کر سکے آپ کا مان نہیں توڑ سکتے تھے۔“ وہ لب اور مٹھیاں بچھینچے خود کو کپوز کرنا چاہ رہے تھے۔

”آپ کی اچھائیاں تو سنہرے حروف سے لکھے جانے کے لائق ہیں خدیج، بس ہم ہی آپ کی قدر نہیں کر سکے اور چاہے آپ نے ہمیں بد دعا نہ دی ہو مگر آپ کی دعا خاموش آہ ہمیں لگ گئی، آپ ہمیں آسودہ دیکھنا چاہتے تھے لیکن آسودگی ہم سے دو ماہ میں ہی روٹھ گئی، کہ ہم نے آپ پر بہتان باندھا تھا آپ نے چاہے کچھ کہا نہیں مگر اللہ تو سب سے بڑا منصف ہے اس نے ہمیں سزا دی، آپ سے جدا ہونے کے اگلے ماہ ہی ارشد سے شادی کر لی تھی کہ دل کے نہ چاہتے ہوئے بھی بابا کے جڑے ہاتھوں کا مان میں نے رکھ ہی لیا تھا مگر محض دو ماہ بعد ارشد ایک کار ایکسڈنٹ میں مجھے اتنی بڑی ذمہ داری سونپ کر چلے گئے، وہ وقت جیسے میں نے گزارا یہ بس میں ہی جانتی ہوں کہ اس معاشرہ میں اکیلی عورت کا جینا جیسے ناممکن سا ہو گیا ہے، میری بیوی کا صدمہ بابا جھیل نہیں سکے تھے وہ فقط تین ماہ بعد ہی مجھے چھوڑ گئے، مجھے کوئی خدیج نہ مل سکے جو میرے لئے سائبان بن جاتے، مجھے دنیا کی میلی نظروں سے بچا لیتے کہ میں ہوینا کی طرح خوش نصیب نہیں تھی، میری مشکلات خود میری خریدی ہوئی تھیں اور میں نے اکیلے ہی دنیا کا مقابلہ کیا، میرے بچوں کے دنیا میں آنے سے ان کی دیکھ بھال و تربیت تک ہر کام میں نے اکیلے کیا، جب مرنے لگتی تو خود ہی سنبھل گئی مگر جب مجھ پر حقیقت منکشف ہوئی تو احساس ہوا کہ رشتے انسان کے لئے کتنی بڑی اماں ہوتے ہیں اور بے

اماں ہو جانے والی ہو پنا بخاری کو آپ نے کن حالات میں سائبان بخشی تھی، ہو سکے تو مجھے معاف کر دیجئے گا خدیج کہ میں نے آپ کو اور ہوینا کے بارے میں غلط گمان کیا، آپ کے پاکیزہ رشتے کو اپنی سوچ کی گندگی سے پراگندہ کر دیا، میں جان گئی ہوں کہ رشتے تو احساس کے انسانیت کے ہوتے ہیں کہ خون کے رشتے بھی کس طرح بدل جاتے ہیں خوب جان گئی ہوں کہ آپ نے ہوینا سے کزن کا رشتہ بھی یاد رکھا اور اللہ کے احکامات و ہدایات بھی فراموش نہ کیں اور میرا سگا ماں جایا، خون کا رشتہ بھی بھول گیا، اسے اللہ کے احکامات بھی یاد نہ رہے میں یہاں بے اماں اپنی آبرو کی جنگ اکیلے ہی لڑتی رہی اور میرا بھائی وہاں دیار غیر میں بسا رہا میری کسی پکار پر لوٹ کر نہیں آیا کہ اس کے اندر کا احساس ہی مٹ گیا ہے اور اسی لئے میں خود اکیلے ہی اپنا اور اپنے بچوں کے سروائیول کی ٹیگ و دو میں لگی ہوں۔“ وہ بری طرح بلک رہی تھی۔

”کیونکہ یہی مکانات عمل ہے، انسان جو بوتا ہے وہی کاٹتا ہے، میں نے آپ کے اور ہوینا کے لئے کانٹے بوئے جو میرے ہی دامن سے آن لپٹے ہیں۔“ اس کی گریہ و زاری بڑھتی جا رہی تھی کہ اسے اپنی غلطی کا شدت سے احساس ہو گیا تھا۔

”ہم نے تو صرف عزت و محبت کے بیج کاشت کیے تھے تو ہم نے کیوں نفرت و شک کی فصل کاٹی؟“ اس کا رونا ان کی برداشت سے باہر تھا مگر وہ بہت ضبط و حوصلہ سے کام لیتے رہے تھے کہ یکدم اس کو کاندھوں سے تھام کر بھٹکھوڑتے سوال کر گئے تھے۔

”یہ آپ کی آزمائش تھی خدیج! جس میں آپ کھرے اترے ہیں اور ہم ٹھکست کھا گئے

اسی لئے آج خود سے آپ سے ہو پنا سے نظر تک ملانے کے قابل نہیں رہے۔“ مستقل رونے سے اس کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔

”مصائب اللہ کی طرف سے ہوتے ہیں رمہ، کہ اللہ کو مصیبت یا راحت دینے کے لئے اسباب کی ضرورت نہیں ہوتی۔“ وہ اس کے شانے آزاد کرتے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

”مکافات عمل اور آزمائش کا تعلق صرف ہماری سوچ سے ہے، کسی مصیبت پر ہماری سوچ کہتی ہے کہ یہ آزمائش ہے اور کوئی مصیبت ہمیں ہمارے لئے کی سزا لگنے لگتی ہے، جبکہ درحقیقت ہر چیز، ہر مصیبت، ہر راحت صرف اللہ کا فیصلہ، اس کی مرضی ہوتی ہے، آپ کا ہماری زندگی میں آنا اللہ کی رضا تھا، آپ کا چلے جانا بھی اللہ کی رضا تھا، آپ کا ارشد کی بیوی بننا، ان کا اور آپ کا ساتھ طویل نہ ہوتا یہ بھی اللہ کی رضا تھا جسے آپ سزا سمجھ رہی ہیں کہ یہ آپ کی آزمائش بھی تو ہو سکتی ہے اور ہم بھی تو کوئی فرشتہ نہیں ہیں، نہ جانے دن بھر میں کتنی غلطیاں، کتنے گناہ کرائے ہیں پتہ نہیں ہمارا کون سا عمل ہمارے اللہ کو پسند نہ آیا ہو اور اس کے عوض ہمیں ذلت کے روپ میں سزا ملی ہو۔“ وہ رونا بھول کر ان کو دیکھنے لگی تھی۔

”ہم اللہ کی حکمت اس کی مصلحت تک نہیں پہنچ سکتے رمہ، تو ہم کیسے ہی خود سے مکافات عمل اور آزمائش کی پریشانیاں تراش لیتے ہیں جبکہ اللہ صرف لے کر تو نہیں آزماتا، دیے کر بھی تو آزماتا ہے، کبھی اولاد کا نہ ہونا آزمائش تو کبھی اولاد کا ہونا سب سے بڑی آزمائش۔“ وہ نہایت ٹھہرے ہوئے لہجے میں ایقان کی شدت سے کہہ رہے تھے۔

”جو ہوا اسے بھول جائیے کہ وہ سب دیے ہی ہوتا تھا کہ وہ سب آپ کی اور ہماری تقدیر

لکھنے والے اللہ کی رضا تھی اور دعا سے صرف تقدیر بدلتی ہے، اس لئے اللہ کی رضا میں راضی رہنا سیکھے زندگی خود بہ خود سہل ہو جائے گی۔“ وہ اپنے آنسو پونچھ گئے تھے اور تب ہی کسی بھی پکار پر رمہ متوجہ ہوئی تھیں جبکہ وہ بری طرح چونک اٹھے تھے، آواز کی جانب رخ کیا تھا، بے بی پنک کمر کی خوبصورت سی فراک میں گلابی چہرے والی وہ تقریباً پانچ سال کی بچی دوڑ کر رمہ کے پیروں سے لپٹ گئی تھی جسے رمہ نے اپنی گود میں اٹھالیا تھا۔

”خدیج! یہ آمنہ ہے میری بیٹی۔“ رمہ نے بھیکے لہجے میں تعارف کی رسم نبھائی تھی خدیج بخاری نے اس کے چہرے کی جانب دیکھا تھا اس کے متورم چہرے پر نرمی سی پھیل گئی تھی۔

”ہم سے شادی کریں گی رمہ؟“ وہ جو بیٹی کی کسی بات کی وجہ سے پوری طرح اس کی جانب متوجہ تھی ان کی بات پر بے یقینی سے انہیں دیکھنے لگی تھی۔

”کچھ نامکمل ہم ہیں رمہ، کچھ کیاں آپ میں ہوں گی اور ہم ایک دوسرے کی کیوں کو بانٹ لیں گے، آپ ہماری کمی کے ساتھ سمجھوتہ کر لیجئے گا اور ہم آپ کے رشتوں کے ساتھ سمجھوتہ کر لیں گے۔“ وہ نہایت ٹھہرے ہوئے لہجے میں گویا ہر بات کہہ گئے تھے، خود سمجھوتہ کرنے کی بیٹی کو اپنانے کے لئے تیار تھے اور ان سے کہہ رہے تھے کہ وہ ان کی کمی کو بھی اپنالیں۔

”ہم آپ کے لائق نہیں ہیں خدیج!“ اس کی آنکھوں سے پھر اشک رواں ہو گئے تھے۔

”یہی تو ہمیں لگا تھا رمہ کہ ہم آپ کے لائق نہیں ہیں اس لئے خود آپ کی زندگی سے نکل گئے تھے جس طرح ہم نے سوچا اور فیصلہ کیا ویسے ہی آپ بھی سوچ کر فیصلہ کریں گی تو ہم ایک بار

کہ جیسے وقت بہت پیچھے چلا گیا ہو اور انہوں نے
ہوینا بخاری کو لیا ہو، ان کی آنکھیں احساسِ تشکر
سے بھیکتی چلی گئی تھیں۔

☆☆☆

”سالِ نو مبارک ہو خدیج۔“ وہ گزرے دو
سالوں میں اور بھی حسین ہو گئی تھی وہ اس کی آواز
پر ملے تھے اور اس کے سامنے آ کر دلکشی سے کہنے
پر مسکرا دیے تھے۔

”آپ کو بھی نیا سال مبارک ہو، اللہ آپ کو
یہ سال مبارک کرے، یہ سال آپ کا دامن
خوشیوں سے بھر دے۔“ انہوں نے اس کے سر
پر دستِ شفقت رکھا تھا۔

”آمین۔“ رمشہ مسکرا کر ان دونوں کے
پاس آن ٹھہری تھی اور وہ خدیج بخاری کے سامنے
سے ہٹ کر رمشہ سے ملنے لگی تھی۔

”شاعِل بھائی کہاں ہیں؟“ رمشہ کا انداز
شرارت لئے ہوئے چھیڑنے والا تھا۔

”آئے تو ہم ان کے ہی ساتھ ہیں مگر وہ
اندر کیوں نہیں آئے پتہ نہیں، ہم جا کر دیکھتے
ہیں۔“ وہ جھینپ کر کہتی جانے کے ارادے سے
پلٹی تھی کہ شاعِل حمید کو آتے دیکھ رک گئی تھی کیونکہ
وہ اپنے بیٹے کو گود میں اٹھائے اور آمنہ کی انگلی
تھاڑے وہیں چلا آیا تھا۔

”باہر نئے سال کا جشن منانے کے لئے
لوگوں نے جو پٹاخوں اور پھلجویوں کا انتظام کیا
ہوا ہے ان دونوں شرارتیوں کی ضد پر وہی دیکھتے
رک گیا تھا، آپ ناحق میری تلاش میں نہ لکھیں کہ
میں لوٹ آیا ہوں۔“ شاعِل کا انداز نہایت
لا پرواہ اور شرارت کا عنصر اپنے اندر سمیٹے ہوئے
تھا۔

”یہ اللہ کا ہم پر کرم تھا کہ ہم دونوں ہی
وقت پر لوٹ آئے تھے۔“ رمشہ کی آنکھیں بھینکنے

پھر الگ ہو جائیں گے اور اب کے ہم آپ کو کھونا
نہیں چاہتے رمشہ۔“ ان کے لہجے میں یاسیت ہی
نہیں جذبے بھی بول اٹھے تھے، وہ بھیکتی آنکھوں
سے انہیں دیکھنے لگی تھیں اور ٹھوکریں کھا کر انسان
کی اتنی تو پرکھ آ گئی تھی کہ وہ ان کی آنکھوں سے
ہی جان گئی تھیں کہ وہ یہ فیصلہ آج بھی صرف ان
کی خوشی کے لئے لے رہے تھے اور یہ احساس
اس کو بے چین کر گیا تھا کہ جس شخص کو اس نے
محبت کے نام پر ذلیل کیا تھا وہ آج بھی ان پر
مہربان تھا۔

”پلیز رمشہ! ہاں کہہ دیں کہ ہم آپ کی بیٹی
کو اپنی بیٹی کی طرح چاہے چاہ نہیں سکیں گے لیکن
ان کے احترام و عزت میں کبھی کمی نہیں آنے دیں
گے، ونی کی طرح ان کو پیار و عزت سے بہتر
زندگی فراہم کرنے کی ہر ممکن کوشش کریں گے،
بس آپ ایک بار ہم پر اعتبار تو کر کے دیکھیں؟“
وہ دھیمے سے لہجے میں گنجی ہوئے تھے اور وہ خود کو
بہت چھوٹا محسوس کرنے لگی تھی کہ اس شخص نے ان
سے آج بھی اپنے لئے کچھ نہیں مانگا تھا اور انہوں
نے مسکرا کر اقرار کر لیا تھا کہ وہ ان کی اچھائی کی
ہی نہیں تقدیر کی بھی متعارف ہو گئی تھی اور اس کی
تقدیر میں ان کا ساتھ اسے ہی لکھا تھا اس لئے وہ
راضی ہو گئی تھی کہ اس پر یہ راز بھی عیاں ہو گیا تھا
کہ اس کی بیٹی کے لئے خدیج بخاری کے علاوہ
کوئی شجر سایہ دار نہ تھا کہ جس کی اماں میں وہ اور
ان کی بیٹی سکھ و عزت سے رہ سکیں، ان کو مسکراتے
دیکھ کئی برسوں بعد وہ بھی مطمئن سے مسکرا دیے
تھے کہ ان کے اقرار پر انہیں یہی لگا تھا کہ اللہ ان
سے راضی ہے اسی لئے ان پر ایک اور ذمہ داری
ڈال دی ہے وہ سرخروئی کی دعا دل میں کرتے
رمشہ کی گود سے آمنہ کو لے لیا تھا اور اس بھی پری
کو گود میں لیتے ہوئے انہیں یہی احساس ہوا تھا

گلی تھیں۔
 ”آج سال کا پہلا دن ہے، ہم صرف اچھے دنوں کو یاد کریں گے تاکہ پورا سال ہمارا احساس تشکر میں گزرے۔“
 ”خبردار جو آپ دونوں میں سے کسی نے کوئی فضول سی بات سے خوشگوار لمحات کو پھیکا کرنا چاہا۔“ وہ ڈپٹے والے انداز میں مدبرانہ لہجے میں بولی تھی۔

”جو حکم ملکہ عالیہ!“ شاعری کی بات پر وہ جھینپ گئی تھی اور وہ دونوں مسکرا دیئے تھے، رمشہ ان کو دیکھنے لگی تھی جو ہوینا کے دو سالہ بیٹے کو پیار کرتے، آمنہ کی جانب بھی متوجہ تھے کہ وہ ان سے کوئی فرمائش کر رہی تھی اور وہ مسکرانے لگے تھے، گزرے تین سالوں کے لمحہ لمحہ نے انہیں احساس دلایا تھا کہ ان کا فیصلہ درست تھا۔

”آپ خدیجہ کو ایسے کیوں دیکھ رہی ہیں، نظر لگانے کا ارادہ ہے۔“ ہوینا نے اس کی چوری نہ صرف پکڑی تھی متبسم لہجے میں بھانڈا بھی پھوڑ دیا تھا اور وہ خفیف سی ہو کر نگاہ جھکا گئی تھی، وہ ان کے شرمائے ہوئے چہرے کو دیکھ مطمئن سے مسکرا دیئے تھے کہ وہ اپنی ہی نہیں ہوینا کی زندگی سے بھی مطمئن تھے کہ شاعری حمید نے اپنے برے رویے کی نہ صرف معافی مانگی تھی گزرے سالوں میں اس کا ازالہ بھی بڑی خوبصورتی سے اسے چاہت و عزت دے کر کر دیا تھا وہ شاعری حمید کے ساتھ ایک خوشگوار ازدواجی زندگی بسر کر رہی تھی اور وہ خود رمشہ کے ساتھ میں مطمئن تھے کہ بے اعتباری کے بادل چھٹ گئے تھے، ہوینا کو شاعری ”سید ہاؤس“ میں اسی حق و مان کے ساتھ لے کر آتا تھا جیسے کوئی بھی بہن، بیٹی اپنے میکے جاتی ہے اور رمشہ نے اپنی محبت اور توجہ سے ان کی ہر تکلیف کا نہ صرف ازالہ کیا تھا انہیں آسودہ زندگی

اچھی کتابیں پڑھنے کی عادت ڈالیں

ابن انشاء

☆ اور دو کی آخری کتاب.....

☆ غارِ گندم.....

☆ دنیا گول ہے.....

☆ آوارہ گرد کی ڈائری.....

☆ ابن بطوطہ کے تعاقب میں.....

☆ چلتے ہو تو چین کو چلیئے.....

☆ نگرانی نگرانی پھر مسافر.....

☆ خط انشاء جی کے.....

☆ اس بستی کے اک کوہِ چہ میں.....

☆ چاند نگر.....

☆ دل وحشی.....

☆ آپ سے کیا پردا.....

ڈاکٹر مولوی عبد الحق

☆ تواندارو.....

☆ کتاب کلام میر.....

لاہور اکید می

چوک اور دو بازار لاہور

فون: 042-37321690, 3710797

خواب، خواہش اور آرزو

فرخ طاہر

وہ جیسے ہی جاب سے لوٹی گھر میں داخل ہوتے ہی اس کی نظر صحن میں رکھے اماں کے مخصوص تخت کی طرف انہی، جو کہ آج خالی تھا، اسے اچنکھا ہوا کیونکہ ایسا کبھی نہیں ہوا تھا، وہ جب بھی سکول سے لوٹتی تھی اماں وہاں موجود ہوتی تھیں، پرسوج انداز میں چاروں طرف نظر دوڑاتی وہ اس خالی تخت پر بیٹھ گئی، ہاتھ میں پکڑی کتابیں اور بیگ سائیڈ پر رکھتے ہوئے اس نے اپنے پیروں کو سینڈل کی قید سے آزاد کرائے اور

پاؤں اوپر کر کے ان کو دبانے کے لئے ہاتھ آگے بڑھایا ہی تھا جب اس کی نظر کے سامنے چائے کا کپ ٹھہر گیا۔

اس نے حیرانگی سے نظر اٹھا کر اوپر دیکھا اس کے سامنے سعدیہ کھڑی تھی۔
”سعدیہ تم.....؟ آج کالج نہیں گئی کیا؟“
اس نے چائے کا کپ تھام کر حیرت بھرے انداز میں پوچھا۔

”نہیں آپ!“ وہ سامنے پڑی چیئر پر بیٹھتے

ناولٹ

ہوئے مزید بولی۔

”آپ کو بتایا تو تھا، فیس جمع کروانے کی آج آخری تاریخ تھی، کالج کل وارنٹ دی تھی اگر کل بھی فیس جمع نہ کروائی تو رپزل کے آفس میں لے جائیں گے، مجھے بالکل بھی اچھا نہیں لگتا اس طرح رپزل کے سامنے جانا، ہر ایک کو پتا لگ جاتا ہے کہ میں نے فیس جمع نہیں کروائی، آپ نے کہا تھا آج آپ میسے لے آئیں گی، اگر آپ آج لے آئی ہیں تو مجھے دیں کل میں جا کر جمع کروادوں گی۔“ اس نے خاصی تفصیل سے اس کے سوال کا جواب دیا تھا۔

”مگر آج تمہارا اتنا اہم ٹیسٹ تھا سعدیہ۔“

”چائے ہاتھ میں پکڑے وہ بھول چکی تھی۔“

”ٹیسٹ اہم تھا، مگر آپلی میں انسلٹ کروانا





نہیں چاہتی تھی۔“ اس نے منہ بسورا۔
 ”میری وجہ سے تمہارا ٹیسٹ مس ہو گیا۔“
 اسے شدید افسوس نے آن گھیرا، سعدیہ کچھ بولتی
 مگر سائیڈ کمرے سے نکلتی فوزیہ نے تیزی سے
 کہا۔

”افسوس تو ایسے کر رہی ہو جیسے نجانے کیا ہو
 گیا ہو، ایک ذرا سائٹس ہی تو تھا نہیں ہوا تو نہ
 صحیح کوئی فرق نہیں پڑتا۔“

”بہت فرق پڑتا ہے اماں، میڈیکل کی
 ٹف پڑھائی میں تو ایک لمبھٹی سے بھی بہت
 نقصان ہو جاتا ہے۔“ عازہ نے انہیں سمجھایا۔
 ”کوئی نقصان نہیں ہوتا، میڈیکل پڑھ کر
 اس نے کون سا ڈاکٹر لگ جاتا ہے، ڈاکٹر بننے
 کے لئے بہت روپیہ درکار ہوتا ہے اور یہاں تو
 کھانا پینا مشکل ہے، نجانے تمہیں کیوں شوق چڑ
 آیا ہے اسے ڈاکٹر بنانے کا، جبکہ یہ بات تم بھی
 اچھی طرح جانتی ہو، تمہارا یہ شوق لا حاصل
 ہے۔“ اس کے برابر میں بیٹھتی فوزیہ نے تیز لہجے
 میں کہا تھا۔

”کوئی لا حاصل نہیں اماں، آپ اس
 معاملے میں کچھ مت بولا کریں میری شدید آرزو
 ہے میری بہنیں کامیاب انسان بن جائیں اور
 اس کے لئے مجھے جتنی بھی محنت کرنا پڑے گی میں
 کروں گی، بس آپ انہیں کچھ مت کہا کریں۔“
 عازہ نے التجا کی تھی۔

”اونہ۔“ فوزیہ سر جھٹک کر رہ گئی، عازہ
 نے بیگ سے پیسے نکال کر سعدیہ کی طرف
 بڑھائے۔

”یہ میں کچھ ایڈوانس لے کر آئی ہوں کم از
 کم تم تو اپنی فیس جمع کرواؤ، باقی سب باتیں
 ذہن سے نکال کر بس اپنی پڑھائی پر توجہ دو۔“
 سعدیہ خاموشی سے اپنی جگہ سے اٹھی اس سے فیس

کی رقم لی اور اندر کی طرف بڑھ گئی، جب فوزیہ
 نے اس سے کہا۔
 ”اس کی فیس کے لئے رقم تو تم لے آئی،
 میں نے تمہیں تین دن پہلے کہا تھا تمہارے ابا کی
 ساری دوائیاں ختم ہو گئی ہیں اس کے لئے تم پیسے
 نہیں لائی؟“

”لائی ہوں اماں، یہ ابا کی دوائیاں میں خود
 لے کر آئی ہوں۔“ اس نے کتابوں کے ساتھ رکھا
 دوائیوں کا لفافہ ان کی طرف بڑھایا۔

”آدھی تنخواہ تو ایسے ہی ختم ہو گئی، باقی
 آدھی تنخواہ میں پورا مہینہ کیسے گزرے گا۔“ انہوں
 نے بڑبڑاتے ہوئے شاپر پکڑ لیا۔

اس کی چائے ٹھنڈی ہو کر بے ذائقہ ہو چکی
 تھی، اس نے کپ پرے سرکا دیا، اماں نے کچھ
 غلط تو نہیں کہا تھا، آٹھ گے پورا مہینہ پڑا تھا اور پیسے
 کہاں سے آئے گے۔

اس کا تعلق ٹڈل گھرانے سے تھا، پڑھنے کا
 شوق تھا اپنی ہی کوششوں سے اس نے جیسے تیسے
 ایم اے انگلش کر ہی لیا، ساتھ ساتھ نوکری بھی
 جاری رکھی، یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ اتنے مشکل
 حالات میں اس نے ایم اے پاس کر لیا، ایم اے
 مکمل ہوتے ہی اس نے ایک اسکول میں ایلائی
 کیا، برائیویٹ سکول تھا اسے نوکری مل ہی گئی،
 تنخواہ گو کہ زیادہ نہیں تھی مگر اس مہنگائی کے
 حالات میں سات ہزار بھی بہت بڑی رقم تھی، گھر
 کی واحد نفیل وہ خودھی، ابا مختلف بیماریوں کی زد
 میں آ کر چار پائی سے لگ کر گھر کی ہر ذمہ داری
 سے آزاد ہو گئے، اس کے علاوہ اس کی تین بہنیں
 اور ایک بھائی تھا اس کی شدید خواہش تھی اس کے
 بہن بھائی پڑھ کر کچھ بن جائیں تاکہ ان کی
 غربت کے دن ختم ہو جائے، اپنی خواہش کی تکمیل
 کے لئے وہ جی جان سے محنت کرتی تھی مگر سات

ہزار میں کہاں تک خواہش پوری ہو سکتی تھیں اتنے میں ضرورتیں ہی پوری ہو جاتی تو بڑی بات تھی یہی وجہ تھی اگر ایک خواہش پوری ہوتی تو دوسری ادھوری رہ کر اسے احساس دلاتی کہ وہ ابھی انہیں مکمل خوشیاں دینے میں کامیاب نہیں ہوئی ہے۔

”اماں تم فکر مت کرو اللہ ہماری مدد کرے گا۔“ اس نے فوزیہ سے زیادہ خود کو تسلی دی تھی، فوزیہ نے ایک خاموش نظر اس کے سپرد کی اور کمرے کی طرف بڑھ گئی، تو وہ بھی گہری سانس لے کر اپنا سامان سمیٹتی وہاں سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

☆☆☆

فوزیہ پورے انہماک سے سبزی کاٹنے میں مصروف تھی جب کسی نے پوری قوت سے دروازہ بجا کر اس کا انہماک توڑا تھا۔

”ہائے ہائے کیا دروازہ توڑنے کا ارادہ ہے، دم تو لو، آرہی ہوں۔“ وہ وہیں سے اونچی آواز میں چلا کر بولی۔

پھر اپنے سامنے پڑی سبزی ہٹا کر پاؤں نیچے کیے تخت کی سائیڈ میں پڑی چپل پہنی اور چھری ہاتھ میں لئے تیزی سے دروازے کی طرف بڑھی۔

”کون؟“ دروازے کے قریب پہنچ کر اس نے احتیاطاً پوچھا۔

”میں ہوں کلثوم۔“

”کلثوم۔“ اس نے زیر لب بڑبڑایا اور دروازہ کھول دیا، اپنے سامنے موجود ہستی کو دیکھ کر وہ حیرت بھرے انداز میں بولی۔

”تم آج یہاں کا راستہ کیسے بھول گئی؟“ اپنے دروازے پر کھڑی بڑی سی گاڑی پر نظر پڑی تو وہ مرعوب سی ہونو وارد خاتون نے کہا۔

”آج تمہاری یاد آئی تو چلی آئی، اب تم راستہ دو تو میں اندر آ جاؤں۔“ کلثوم پوری طرح

دروازے کے بچوں بیچ کھڑی تھی، اس کی بات پر ایک دم کھسیا کر راستہ چھوڑ لی بولی۔

”میری یاد آئی اور تم چلی آئی، بات ہضم کرنا تھوڑا مشکل ہے مگر چلو کر ہی لیتے ہیں۔“ اس کے لبوں پر طنز یہ مسکراہٹ درآئی تھی۔

مگر کلثوم برا منائے بنا اسی طرح مسکرائی آگے بڑھی اور محسن میں پڑی کرسی پر بیٹھ گئی، فوزیہ دروازہ بند کرتی اس کے نزدیک چلی آئی اور اس کے سامنے تخت پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

”کیا لوگی؟“

”کسی بھی تکلف کی ضرورت نہیں ہے میں ابھی ناشتہ کر کے آئی ہوں، تم بتاؤ بچے کہاں ہیں تمہارے؟ گھر پر اکیلی ہو کیا؟“

”ہاں اس وقت میں اکیلی ہوتی ہوں بچے سب پڑھنے گئے ہیں۔“ فوزیہ نے بتایا۔

”اچھا..... اور عائزہ کیا کر رہی ہے آج کل، اس کا ایم اے مکمل ہو گیا؟“ اس کی دلچسپی اپنے بچوں میں دیکھ کر وہ ایک بار پھر حیران ہوئی تھی اس کی حیرت بجا تھی، کلثوم گو کہ اس کی تایا زاد کزن تھی کبھی ان کے حالات بھی انہی کی طرح ہوا کرتے تھے مگر جب سے کلثوم کا بڑا بیٹا باہر گیا تھا تب سے ان کے حالات بھی سدھر گئے اور یہ خود بھی بدل گئے، غریب رشتے داروں سے ہر تعلق ختم کر کے انہوں نے اپنی الگ دنیا بنالی تھی، لوگوں کے ذہن سے وہ بھولنے لگے تھے کہ اچانک اس کی آمد اور وہ بھی اس طرح کہ وہ خود اس کے بچوں میں دلچسپی لے رہی تھی اور تو اور وہ یہ بھی جانتی تھی کہ عائزہ ایم اے کر چکی ہے، فوزیہ کے لئے آج حیرت کا دن تھا، اپنی حیرت پر قابو پا کر اس نے کہا۔

”ہاں عائزہ کا ایم اے کب کا مکمل ہو گیا ہے آج کل وہ ایک سکول میں پڑھا رہی ہے،

سات ہزار روپے کماتی ہے۔“ اس کے انداز میں ذرا سا فخر در آیا تھا، جب کلثوم مسکرا کر بولی۔
 ”سات ہزار میں کیا ہوتا ہے، مہنگائی اس قدر بڑھ گئی ہے خدا کی پناہ اور کمال بھائی تو بیمار رہتے ہیں عائزہ بیچاری اکیلی پورا گھر سنبھالے ہوئے ہے۔“ فوزیہ بری طرح چونکی تھی، کلثوم ان کے حالات سے اس قدر باخبر، حیرت در حیرت تھی۔

”تم یہ سب کیسے جانتی ہو؟“ اس نے پوچھ ہی لیا۔

”لو یہ کون سی مشکل بات ہے، تم میری بہن ہو بس ذرا مصروفیات میں میں ملنے نہیں آسکی ورنہ جو بھی ملنے آتا تھا میں اس سے تمہاری خبر ضرور لیتی تھی۔“ انہوں نے اس کی حیرت دور کی، اسے یقین تو نہیں آیا مگر اقرار میں سر ہلا دیا۔

”اچھا یہ بتاؤ عائزہ کی منگنی کتنی کر دی کیا؟“ انہوں نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے سرسری انداز میں پوچھا تھا۔

”اسی یہ کیا پوچھ رہی ہے۔“ فوزیہ نے آنکھیں سکیڑ کر اس کے چہرے کے تاثرات سے کچھ جانچنا چاہا۔

مگر کلثوم پوری طرح بے نیاز بنی ادھر ادھر دیکھ رہی تھی، وہ کچھ بھی اخذ نہیں کر پائی۔

”یہ سبزیاں اگا کر اچھا کیا تم نے گھر کی سبزیوں کی تو بات ہی الگ ہوتی ہے۔“ اپنی پہلی بات کا جواب جانے بنے اس نے بات کر دی۔

”ہاں یہ عائزہ کو شوق ہے وہی آئے دن کچھ نہ کچھ کرتی رہتی ہے۔“ فوزیہ ذرا سی الجھن کا شکار ہوئی تھی۔

ایک کے بعد ایک سوال اور جواب سننے کا وقت بھی نہیں، گہرا سانس بھرتی وہ خود ہی بتانے لگی۔

”عائزہ کی منگنی کہیں نہیں کی میں نے۔“
 ”کیوں؟ ایم اے کے اسے دو سال تو ہو گئے ہیں پھر کیوں نہیں کی؟“ اب کہ انہوں نے اپنی نظریں اس کی طرف موڑ دی، گویا کہ مکمل توجہ۔

”تمہاری بات کا جواب تم خود بھی جانتی ہو کلثوم، ابھی کچھ دیر پہلے تم خود کہہ رہی تھی عائزہ اکیلی پورا گھر سنبھالے ہوئے ہے، تو جب ہمارے گھر کی ذمہ داری عائزہ پر ہے تو پھر ہم اس کی شادی کیسے کر سکتے ہیں؟ اور بالغرض ہم اس کی شادی کا سوچ بھی لیں تو ان حالات میں کیسے شادی ہو سکتی ہے، شادی کے لئے بہت سی رقم چاہیے ہوتی ہے، بہت سے خرچے ہوتے ہیں، کہاں سے ہو گا یہ سب؟ اور پھر سب سے بڑی بات شادی کے لئے لڑکے کی ضرورت ہوتی ہے ہمارے جیسے غریبوں کے گھروں میں کون رشتہ لے کر آئے گا۔“ وہ تو جیسے پھٹ ہی پڑی تھی۔

”گھر کے مسئلوں سے توجہ ہٹے تو اس طرف سوچتی یہ میں نے تو آج تک عائزہ کی شادی کا نہیں سوچا۔“ فوزیہ آخر میں دھیمی آواز میں بڑبڑائی تھی۔

”مگر مجھے سمجھ نہیں آ رہا تم یہ سب کیوں پوچھ رہی ہو؟“ بالآخر اس نے اپنی الجھن بیان کر ہی دی۔

”میں عائزہ کے رشتے کے لئے آئی ہوں۔“ انہوں نے اپنے آنے کی وجہ کیا بیان کی فوزیہ تو جیسے اچھل ہی پڑی۔

”تم اور عائزہ کے رشتے کے لئے؟“
 حیرت، بے یقینی، خوشی، آس نجانے کیا کچھ تھا اس کے سوال میں۔

”ہاں میں اپنے احسان کے لئے عائزہ کا رشتہ چاہتی ہوں۔“

”احسان تمہارا بڑا بیٹا، وہی جو باہر کے کسی ملک میں رہتا ہے؟“ اس نے استفسار کیا۔
 ”ہاں وہی۔“ انہوں نے اقرار میں سر ہلایا۔

”مجھے یقین نہیں آ رہا تم میری بیٹی کا رشتہ چاہتی ہو، تمہیں تو ایک سے بڑھ کر ایک لڑکی مل سکتی ہے۔“
 ”بالکل مل سکتی ہے مگر مجھے عائزہ پسند ہے۔“

”اس پسندیدگی کی وجہ جان سکتی ہوں؟“
 اس نے فوراً پوچھا تھا۔

”اور احسان تو باہر ہوتا ہے پھر عائزہ کا مستقبل کیا ہو گا نہ یہاں کی نہ وہاں کی۔“
 ”دیکھو فوزیہ! تم نے اب تک بیٹی کی شادی کا سوچا تک نہیں جبکہ اس کی شادی کی عمر ہو چکی ہے اور تم نے اب تک ایسا اس لئے نہیں سوچا، کیونکہ وہ تمہاری کماؤ بیٹی ہے جس نے پورا گھر سنبھال رکھا ہے۔“

”میں ٹھیک کہہ رہی ہوں ناں؟“ اپنی بات درمیان میں روک کر اس نے استفہامیہ اس کو دیکھا جواباً وہ نظر چڑا گئی۔

کیونکہ یہ سچ ہی تھا اپنی خود غرضی میں وہ اس حد تک ڈوبی ہوئی تھی کہ آج تک اس طرف اس کی توجہ گئی ہی نہیں تھی، کلثوم مزید گویا ہوئی۔

”میرا احسان باہر ہوتا ہے دو مہینے سے وہ یہاں آیا ہوا ہے اس کے جانے میں مزید ایک مہینہ باقی ہے میں چاہتی ہوں اس بار اس کی شادی کر دوں وہ وہاں اکیلا ہوتا ہے ٹھیک طرح اپنا خیال بھی نہیں رکھ پاتا، بس اسی لئے میں نے سوچا ہے اس کی شادی کر دوں اس کی دلہن کے ساتھ بیجیوں، بیوی ساتھ ہوگی تو میں مطمئن ہو جاؤں گی کہ وہاں اسے گھر کا سا سکون میسر ہوگا،

اب مجھے لڑکی تلاش تھی ملنے کو اور بھی بہت سی لڑکیاں مل سکتی تھیں مگر فوزیہ میں اور لڑکیوں کی گارنٹی نہیں دے سکتی کہ وہ وہاں جا کر ہمارے بیٹے کو بھی ہم سے دور کر دے وہ ہمیں بھول ہی جائے پیسے وغیرہ بھیجنا بند کر دے، بس اسی لئے میں نے اور کسی لڑکی کا سوچا ہی نہیں میرے ذہن میں عائزہ کی صورت اتر آئی عائزہ مخنتی بچی ہے گھر کو سنبھالا ہوا ہے اگر اس کی احسان سے شادی ہو جاتی ہے تو وہ احسان کے ساتھ باہر چلی جائے گی وہاں عورتیں بھی کام کرتی ہیں، احسان کی طرف سے کوئی روک ٹوک نہیں ہوگی، عائزہ وہاں نوکری کر لے گی بدلے میں جو تنخواہ ہوگی تم لوگوں کو بھیجوا دے گی، تم لوگوں کو بھی فائدہ ہو جائے گا حالات سدھر جائیں گے، بس عائزہ کو احسان کا خیال رکھنا ہوگا، باقی جو بھی وہ کرنا چاہے گی کر سکے گی۔“ انہوں نے بڑی تفصیل سے اپنی بات اسے سمجھائی تھی، فوزیہ جو خاموشی سے اسے سن رہی تھی اس کے چپ ہونے پر بولی۔

”احسان کی بیوی ہونے کے ناطے اس کا خیال رکھنا تو عائزہ کا فرض ہوگا، اس بات کی فکر نہیں ہے مجھے، مگر تمہاری دوسری بات میرے دل کو لگی ہے۔“

”عائزہ اتنی محنت کر کے یہاں سات ہزار کماتی ہے اتنی ہی محنت وہاں کرے گی تو لاکھوں کمائے گی۔“ اس کی آنکھوں میں بڑی معنی خیزی چمک ابھری تھی، کلثوم مسکرا دی۔

وہ اچھی طرح فوزیہ کی فطرت جانتی تھی، اسی لئے اس نے اپنی بات اس انداز میں اس کے سامنے رکھی تا کہ وہ اس کی بات پوری طرح سمجھ کر اس سے متعلق ہو جائے۔

”اگر اس نے پیسوں کے لالچ میں اب تک عائزہ کی شادی نہیں کی تھی تو پیسوں ہی کے

لاچ میں وہ اس کی شادی کر بھی سکتی تھی۔“

کلثوم کی بات میں کافی دم تھا، فوزیہ پوری طرح اس سے متفق ہوتی نظر آ رہی تھی، جب سامنے کے کمرے سے کمال کھانستا ہوا باہر نکلا۔

”کون آیا ہے؟“

”کلثوم ہے میری تایا زاد بہن۔“ اس نے اونچی آواز میں بتایا، کمال ان کے قریب آ گیا۔

”السلام علیکم بھائی!“ کلثوم نے فوراً سلام

کیا تھا۔

”وعلیکم السلام بہن کیسی ہو؟“ کمال نے

فوزیہ کے برابر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

”میں ایک دم ٹھیک ہوں۔“ اس نے ہلکی

سی مسکراہٹ کے ساتھ بتایا۔

”آج ادھر کیسے آنا ہوا؟“

”یہ عازہ کے رشتے کے لئے آئی ہے۔“

جواب فوزیہ کی طرف سے آیا تھا۔

”عازہ کے لئے؟“ وہ حیرت سے پورے

کا پورا فوزیہ کی طرف مڑ گئے۔

”ہاں۔“ پھر فوزیہ نے کلثوم کی پوری بات

ان کے گوش گزار کی کمال ایک دم سوچ میں پڑ گئے۔

”کیا یہ ٹھیک ہو گا؟“ انہوں نے کلثوم کی

طرف نظر کی تھی۔

”ہاں بھائی مجھے پورا یقین ہے انشاء اللہ یہ

ہمارے حق میں اچھا ہو گا، میں نے بہت سوچ

سمجھ کر عازہ کا انتخاب کیا ہے۔“

”آپ لوگوں کو کوئی اعتراض ہو تو

بتائیں۔“ وہ تیر پھینک چکی تھی جو پہلے ہی نشانے

پر لگ چکا تھا مگر پھر بھی کمان ان کے ہاتھ میں پکڑا

دی۔

”اعتراض تو کوئی نہیں، مگر پتا نہیں عازہ

راضی ہو گی بھی یا نہیں۔“ کمال نے ہلکا سا

اعتراض کیا تھا۔

”کیوں راضی نہیں ہو گی، وہ ضرور راضی ہو

گی میں منالوں کی اسے۔“ فوزیہ نے فوراً ان کا

اعتراض رد کیا تھا۔

”ہاں آپ لوگ عازہ سے معلوم کر لیں،

احسان کے جانے میں ایک مہینہ باقی ہے، ہمیں

پہلے نکاح کرنا ہو گا، پھر عازہ کا ویزہ وغیرہ کا کام

ہونے میں ہی یہ مہینہ لگ جائے گا تو وہ احسان

کے ساتھ باہر چلی جائے گی۔“ کلثوم نے ایک

بار پھر انہیں مستقبل کا خواب دیکھایا تھا۔

”ہاں ہاں کیوں نہیں میں آج ہی عازہ

سے پوچھوں گی وہ انکار نہیں کرے گی تم بس ہاں

ہی سمجھو۔“ فوزیہ نے اپنی طرف سے حامی بھر لی۔

”شکریہ فوزیہ، تم پھر بھی عازہ کی مرضی

جان لو، میں پھر آؤں گی، ابھی میں چلتی ہوں۔“

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”کچھ کھا تو لیتی۔“ فوزیہ کو اخلاق میزبانی

نبھایا پھر سے یاد آیا تھا۔

”رہنے دو پھر کبھی صبح ابھی ڈرائیور باہر کھڑا

ہے میں چلتی ہوں۔“ وہ الوداعی سلام کر لی مڑی

اور واپسی کے لئے نکل گئی۔

جبکہ فوزیہ اور کمال اس رشتے کے متعلق

گفتگو کرنے لگے، کلثوم کی آفر ان کے دل کو لگی

تھی، روشن مستقبل ان کی نظروں کے سامنے

گھومنے لگا تھا، وہ اس رشتے سے مکمل متفق تھے

اور عازہ کو بھی راضی کر لینے کا خیال رکھتے تھے۔

☆☆☆

آج اس کے سکول میں پہلا پیپر تھا جس کی

وجہ سے وہ آج معمول سے تھوڑا لیٹ گھر لوٹی

تھی، جیسے ہی وہ گھر میں داخل ہوئی اس کی نظر

منتظر بیٹھی فوزیہ کی طرف اٹھی۔

فوزیہ کے چہرے پر بڑی واضح خوشی کی

جھک اور بے چینی نمایاں تھی، وہ شدید تھکی ہوئی تھی مگر پھر بھی مسکرا کر ان سے بولی۔

”کیا بات ہے اماں بہت خوش دیکھائی دے رہی ہیں۔“ کتابیں برابر میں رکھتی وہ ان کے پاس بیٹھ گئی۔

”ہاں آج اماں کی لاٹری نکل آئی ہے۔“ سعدیہ ہنستی ہوئی کچن سے برآمد ہوئی اس کے پیچھے ٹمن پانی کا گلاس لئے آرہی تھی۔

”اچھا وہ کیسے؟“ اس نے معاملے میں دلچسپی ظاہر کی۔

ٹمن نے پانی کا گلاس اس کی طرف بڑھایا جبکہ سعدیہ سامنے پڑی کرسی پر بیٹھ گئی، اس نے خاموشی سے گلاس پکڑا تو ٹمن بھی سعدیہ کے برابر جا بیٹھی۔

”آپ کے لئے بڑا زبردست پریوزل آیا ہے۔“ سعدیہ نے خوشی سے بتایا، پانی کا گھونٹ اس کے حلق میں پھنس گیا۔

”پریوزل..... میرے لئے؟“ اس نے اپنی طرف اشارہ کیا۔

”ہاں بالکل۔“ فوزیہ جوش سے کہتی اسے تفصیل سے بتانے لگی۔

”وہ تمہاری کلثوم خالہ ہے ناں جس کا بڑا بیٹا باہر ہوتا ہے وہ ہی کلثوم اپنے بیٹے کا رشتہ لے کر آئی تھی۔“

”احسان کا رشتہ میرے لئے؟“ اس نے بھنویں سکیز کر پوچھا، اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا اس اچانک ملنے والی خبر پر کیا رد عمل ظاہر کرے۔

”تمہیں یقین کیوں نہیں آ رہا عازہ تم کسی سے کم ہو کیا؟“ فوزیہ نے کہا۔

”ہاں..... نہیں تو اماں مگر مجھے شادی نہیں کرنی۔“ جب اسے کچھ نہیں سوچا تو انکار کرتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

”اتنے اچھے رشتے سے انکار کر رہی ہو تم؟“ فوزیہ کو جیسے شاک لگا۔

”ہاں اماں۔“ اس نے جھک کر کتابیں اور پیپر اٹھائے اور جانے کے لئے آگے بڑھ گئی، پھر ذرا سا گردن موڑ کر ان سے بولی۔

”اور نہ ہی میرے حالات مجھے شادی کی اجازت دیتے اور سچ تو یہ ہے میں نے بھی شادی کا سوچا ہی نہیں ہے، میرے اوپر اتنے فرض ہیں اس زندگی میں وہ پورے ہو جائیں میرے لئے یہی بہت ہوگا۔“ پھر ان کو سننے بنا وہ اپنے کمرے میں آ گئی۔

اس کی ساکن زندگی میں کسی نے پتھر مار کر ہلچل پیدا کرنے کی کوشش کی تھی یہی وجہ تھی اس ہلچل نے اس کو ڈسٹرب کیا تھا، مگر وہ اپنے فرائض اور اپنی ذمہ داریوں کو کس طرح بھول سکتی تھی، سو اس نے انکار کر کے اس پتھر کو واپس پھینکنے کی کوشش کی تھی۔

کتابیں اور پیپر بک ریک میں رکھ کر وہ چادر بچھے پلنگ پر آ بیٹھی فوزیہ اس کے پیچھے کمرے میں چلی آئی۔

”اماں کیا ہوا؟“ انہیں دیکھ کر اس نے انجان بننے کی کوشش کی۔

”میں تمہیں اس رشتے سے انکار کرنے نہیں دوں گی۔“ اس کا انداز جتنی تھا۔

”اماں میں آپ کو اتنی خود غرض نظر آتی ہوں، شادی کر کے میں اپنی زندگی میں مگن ہو جاؤں اور پھر یہاں آپ سب کا کیا ہوگا؟ ابھی معید پڑھ رہا ہے سعدیہ، ٹمن، صدف میں سے کوئی بھی گھر سنبھالنے کے لائق نہیں ہوا ہے آپ کیوں یہ سب بھول رہی ہیں۔“ وہ ان کی ایک ہی تکرار سے زچ ہو گئی تھی۔

”میری بچی ایسے نہ کرنے کو تمہیں کون کہہ

رہا ہے؟“ فوزیہ اس کے برابر میں آ بیٹھی۔

”تو پھر۔“ وہ استفہامیہ ان کو دیکھنے لگی۔

”کلتھوم کا کہنا ہے جو تم شادی کر کے احسان کے ساتھ باہر چلی جاؤ گی وہاں تم احسان کا خیال رکھنا وہ نوکری پر چلا جائے تو تم خود بھی نوکری پر چا سکتی ہو، یہاں تم سات ہزار کمارہی ہو وہاں تم لاکھوں کماد کی وہ پیسے تم ہمیں بھیج سکتی ہو تم پہ کوئی پابندی نہیں ہوگی، سو جو تم اتنی رقم کماد کی تو ہماری زندگیاں کتنی بدل جائیں گی، یہ ترس ترس کے جینا ختم ہو جائے گا بیٹی، تمہارا ایک فیصلہ ہم سب کی زندگی سدھار دے گا۔“ فوزیہ نے اسے سمجھانا چاہا۔

”اماں وہاں کے لاکھوں سے اچھے یہاں کے سات ہزار ہیں میں آپ لوگوں کے ساتھ ہوتی ہوں اور وہاں جا کر کیا ہو گا یہ آپ خود بھی سوچ سکتی ہیں۔“ وہ ابھی بھی ماننے کو تیار نہیں تھی۔

”تو کیا ہوا ہمارا ایک ساتھ رہنا لازمی تو نہیں ہے آج نہیں تو کل تمہیں شادی کر کے یہاں سے چلے ہی جانا ہے تو اب کیوں نہیں۔“ انہوں نے ابھی بھی ہمت نہیں ہاری تھی۔

”اماں مجھے پھر بھی شادی نہیں کرنی ہے بس میرے بہن بھائی کسی قابل ہو جائیں ان کی شادیاں کر دیں گی، میرے لئے یہی بہت ہو گا۔“ اس نے قطعی انداز میں کہا اور کپڑے تبدیل کرنے والی روم میں چلی گئی۔

فوزیہ کچھ دیر تو بیٹھی رہی پھر بڑبڑاتی ہوئی اٹھ کر وہاں سے اپنے کمرے میں آ گئی، وہ کپڑے بدل کر باہر آئی تو کمرہ خالی تھا وہ سکون کا سانس لیتی سونے کے لئے لیٹ گئی، یہ اس کا معمول تھا سکول سے آ کر تھوڑی سی نیند لیتی پھر رات کا کھانا بناتی سکول کا کوئی کام ہوتا تو اسے

کامل کرتی، سکول سے واپسی پر وہ بہت تھکن اور نیند محسوس کر رہی تھی مگر اس وقت لاکھ کوشش کرنے پر بھی نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی ایک دم ہی اس کی نیند ختم ہو گئی تھی، زبردستی کرنے پر سر میں درد ہونے لگا تو اٹھ بیٹھی۔

”پتا نہیں کیا مصیبت ہے اچھی بھلی گزر رہی تھی، یہ کلتھوم خالہ کہاں سے ٹپک پڑی۔“ وہ جھنجھلا گئی۔

کافی دیر خالی ذہن بیٹھی یونہی سوچتی رہی پھر اٹھ کر باہر آ گئی، صحن میں کوئی بھی نہیں تھا وہ اماں، ابا کے کمرے میں چلی آئی، اس وقت سب وہاں موجود تھے، اس نے ایک نظر سب پر ڈالی۔

فوزیہ ذرا غصے میں دکھائی دے رہی تھی جبکہ اس کے بہن، بھائی بہت زیادہ خوش دکھائی دے رہے تھے، معید کی نظر اس پر پڑی تو تیزی سے اس کے پاس آیا۔

”آپی آپ باہر جا کر اپنی پہلی تنخواہ میں سے مجھے لیپ ٹاپ بھیجنا میرے ہر دوست کے پاس لیپ ٹاپ ہے بس میرے ہی پاس نہیں ہے۔“ ایک حسرت مچی حواس کے انداز سے عیاں ہو رہی تھی۔

”اور مجھے پیسے بھیجنا ڈھیر سارے، میں بہت اچھے کالج میں داخلہ لوں گی پھر بڑی ڈاکٹر بنوں گی، آپ کی خواہش یہی ہے نا؟“ سعدیہ کہاں پیچھے رہنے والی تھی۔

وہ ابھی بھی اپنی اوقات سے بڑھ کر ان کے لئے محنت کر رہی تھی مگر پھر بھی ان کی وہی ناتمام خواہشات، وہ ایک دم تھکنے لگی، صحن اور صدف بھی اپنی فرمائشیں نوٹ کر وارہی تھیں۔

اس نے ان سب کو غور سے بہت غور سے سنا تھا، پھر ایک نظر اپنے ماں باپ کی طرف کی، کمال انہیں سنتے ہوئے مسکرا رہے تھے جبکہ فوزیہ

خاموش تھی، اس نے پھر ایک نظر اپنے بہن بھائیوں کی طرف کی، دبا دبا جوش، خواہشات کی تکمیل کی آس اور نجانے کس بات کی خوشی اس کے دور چلے جانے کا دکھ تو ان میں سے کسی کے بھی چہرے پر دیکھائی نہیں دے رہا تھا۔

”میں ساتھ رہوں یا نا رہوں ان کے شوق ان کی خواہشات ان کی آرزوئیں پوری ہو جائیں بس، تو پھر میں کیوں ان کی آرزوؤں کی تکمیل میں رکاوٹ بنوں؟“

”جب مجھے یہاں بھی یہی سب کرنا ہے تو وہاں کیوں نہیں۔“ اس کے ارادے بدلنے لگے۔

”مگر اپنے پیاروں کی یاد، ان کا ساتھ؟“ اس کے دل نے دوہائی دی تھی۔

”تو کیا ہوا وہ تو وہاں بھی ساتھ ہوگا۔“ اس نے دل کو جھڑک دیا، دل خاموش ہو گیا ایک دم چپ، بہت غور کرنے پر محسوس ہوا یہ دھڑک رہا ہے، مدھم مدھم، ست، رکا رکا سا، اسی کا ارادہ پختگی کی منزل پہ آن پہنچا، اس نے ایک آخری نظر ان کے چہروں پر ڈالی۔

کیا پتا کہیں کچھ ویسا مل جائے جس کی ایسے چاہ تھی، مگر ایسا ہوا ہی نہیں وہ افسردہ ہونے لگی تھی جب اس کے فرائض بھرے احساسات نے اسے ہمت بخشی۔

”تم ہار نہیں سکتی۔“ وہ لب بھینچ کر مسکرا دی، نظریں جھکائے اس نے خود کو کہتے سنا۔

”میں اس شادی کے لئے تیار ہوں۔“ وہ مڑی اور کمرے سے جانے لگی، اس نے دوبارہ مڑ کر ان کے چہروں کو نہیں دیکھا تھا جانتی تھی اب وہاں کیا ہوگا؟

خوشی اور بے تحاشا خوشی؟ اور واقعی اس کے اقرار نے ان کے دل خوشی سے بھر دیئے تھے،

تیاری کے نام پر ان کے پاس کیا تھا؟ کچھ بھی نہیں اور پھر کلثوم نے کچھ بھی کرنے سے منع کیا تھا۔

ان کے گھر میں ایک دم ہی خوشیاں اس طرح برسی تھیں کہ ان سے سنبھالنے نہیں سستھل رہی تھی، شوق کا یہ عالم تھا کہ وہ یہ خبر سب کو سنانے کو بے چین ہو گئے۔

☆☆☆

وہ جس جگہ رہتے تھے وہ ایسا علاقہ تھا جن میں گھر اور لوگ ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تھے، ذرا جو کچھ ہوتا خبر سب تک پہنچ جاتی، فوزیہ نے خوشی سے معمور لہجے میں عازہ کی اچانک چپک اٹھنے والی قسمت کی خبر ساتھ والی ہمسائی کو دی تھی، آس پڑوس کے لوگوں نے جیسے ہی سنا ان کی خوشی میں شامل ہونے کے لئے مبارک باد دینے چلے آئے، وہ سب عازہ کی قسمت پر رشک کر رہے تھے، کچھ نے تو یہاں تک کہہ ڈالا۔

”کاش عازہ جیسی قسمت ہر لڑکی کو ملے۔“ بے وقوف لوگ بنا سوچے سمجھے کچھ بھی مانگ لیتے ہیں کسی بھی چیز کی فرمائش کر دیتے ہیں، ذرا سا کسی کو عروج پر جانا دیکھ کر جھٹ سے خود بھی اس بلندی تک پہنچنے کی دعائیں کرنے لگتے ہیں، یہ جانے بنا آگے یہ عروج عروج ہی رہے گا؟ پابند ترین زوال ثابت ہوگا۔

نتائج سے بے خبر انہوں نے خواہش کی فوزیہ کا سینہ فخر سے کچھ اور پھول گیا، آخر کو عازہ اس کی بیٹی تھی اور جب یہ خبر عازہ کی بیسٹ فرینڈ آسیہ تک پہنچی تو وہ گویا اثری ہوئی عازہ کے پاس پہنچی تھی۔

”عازہ یہ میں کیا سن رہی ہوں؟“
”کیا سن لیا تم نے؟“ سر جھکائے پیر چپک

کرتی وہ حد درجہ انجان بنی تھی۔

”تم تو جیسے جانتی ہی نہیں ہوتاں۔“ وہ جھنجھلا گئی۔

”تو تم بتا دو۔“ اب کہ اس نے سراٹھا کر اس کو دیکھا تھا۔

”تم شادی کر رہی ہو؟“ اس نے پوچھا۔

”ہاں۔“ اس نے اقرار میں سر ہلایا۔

”اور شادی کر کے اتنی دور چلی جاؤ گی، تمہیں پتا بھی ہے وہ لڑکا کہاں رہتا ہے، کس ملک میں؟“ وہ اشتیاق بھرے انداز میں بولتی اس کے سامنے بیٹھ گئی۔

”ہاں یہ تو معلوم ہے شادی کر کے دور چلی جاؤں گی مگر یہ نہیں معلوم کہاں جاؤں گی؟“ اس کا اطمینان ہنوز برقرار تھا۔

”تم نے پوچھا نہیں؟“

”نہیں تو اور ویسے بھی اس سے کیا فرق پڑتا ہے میں کہیں بھی جاؤں اب جانا تو ہے ناں۔“ بڑا سکون بھرا جواب ملا تھا لگتا تھا اس نے خود کو مضبوط کر لیا ہے۔

”ہاں یہ تو ٹھیک کہا تم نے۔“ آسیہ نے اقرار میں سر ہلایا پھر مزید بولی۔

”خالہ بتا رہی تھی تم وہاں جا کر بھی نوکری کرو گی لاکھوں روپے کماد گی۔“ عائرہ کے لبوں سے بے ساختہ مسکراہٹ رہنکی تھی، عجیب سی مسکراہٹ۔

”پیسہ اور بس پیسہ، انسان کا اس کے جذبات کا تو جیسے کوئی مول ہی نہیں تھا۔“

”ہاں ارادہ تو یہی ہے۔“ اس نے دوبارہ نظریں پیریز پر مرکوز کر دی۔

”اچھا تو پھر مجھے کیا سمجھو گی؟“ اس کے سوال پر عائرہ نے ایک دم چونک کر نظریں اٹھا کر اسے دیکھا تھا، اس کے دل کو گہرا دھچکا لگا تھا،

آنکھوں کی سطح پر یکدم نئی جھلملائی تھی۔

کوئی ایک تو ایسا ہوتا جسے میرا دور چلے جانا سوہان روح لگتا، اس نے سوچا تھا کوئی اور نہ سچ آسیہ جب اس کے دور جانے کی خبر سنے گی تو اس سے لڑے گی، اس کی منت کرے گی۔

”مجھے چھوڑ کر مت جاؤ۔“ مگر ایسا تو کچھ بھی نہیں ہوا تھا، لب بھینچ کر اس نے اسے دیکھا تھا۔

”تم بھی آسیہ، تم تو میری بیسٹ فرینڈ تھی تمہیں تو مجھ سے دوری کا احساس ہونا چاہیے تھا۔“ وہ صرف سوچ کر رہ گئی، درد کی ٹیسوں کو ایک دکھی مسکراہٹ میں سمیٹے اس نے کہا۔

”جو تم کہو گی وہی بھیجوں گی۔“

”اوہ تم واقعی میری اچھی دوست ہو۔“ وہ خوشی سے اس سے لپٹ گئی تھی، کلثوم خالہ نے ایک مہینے کا وقت دیا تھا۔

”چلو مجھ سے نہ سچ میری ذات سے کسی کو خوشی مل جائے یہ بھی بہت ہے۔“ گہری سانس ہوا کے سپرد کرتی وہ اس کی فرمائشوں کو سننے لگی۔

☆☆☆

دو دن بعد انتہائی سادگی کے ساتھ اس کا نکاح ہوا تھا۔

بڑا ہی عجیب ملن تھا سب کے دل تو خوش تھے مگر خوشی کا کوئی سماع نہ تھا، نہ تو اس کے ہاتھوں پر مہندی لگی تھی نہ ہی اس نے سہاگ کے نام کا جوڑا پہنا تھا بنا کسی ہار سنگھار کے وہ عائرہ کمال سے عائرہ احسان ہو گئی۔

مہمانوں کے نام پر اس کے محلے کے چند لوگ اور کلثوم خالہ کے ہمراہ آئی اس کی فیملی شامل تھی جن کی خاطر تواضع کے لئے زیادہ تکلف کرنے کی بجائے چائے اور مٹھائی پر اکتفا کیا گیا تھا، نکاح کی رسم کے بعد سب کچھ معمول پر آ

گیا۔

ابھی اس کے بعد تھوڑے دن باقی تھے یہ دن گھر میں بیٹھ کر گزارنے کے بجائے اس نے سکول جاری رکھا تھا، عام سی روٹین کے ساتھ یہ دن بھی گزر گئے، اب اس کے جانے میں دو دن رہ گئے تھے جب فوزیہ نے اس کے لئے بنائے چند نئے جوڑے اور مختلف ضروریات کی اشیاء بیگ میں ڈال کر اس کی پیکنگ مکمل کی تھی۔

آخری دن وہ اپنی فیملی کے ساتھ گزارنا چاہتی تھی، اس نے سکول سے ریزائن کر دیا تھا، اس کے دل کی حالت عجیب سی ہو رہی تھی، سب کے درمیان بیٹھی بس انہیں دیکھے جاتی تو کبھی اونچی اونچی آواز میں بولنے لگ جاتی، فرمائش کر کے اس نے اپنا من پسند کھانا بنوایا اور جب کھانے بیٹھی تو ایک لقمہ بھی حلق سے نہ اتارا گیا، بالآخر کھانا جوں کا توں چھوڑ کر وہ وہاں سے اٹھ گئی، وقت رخصت احسان اور کلثوم اسے لینے آن پہنچے تھے، آج اس کے وداع کا دن تھا، کافی لوگ اس سے ملنے آئے تھے مگر اس وقت وہ اس قدر غائب دماغ تھی کہ ڈھنگ سے ان سے مل بھی نہ سکی، آخر میں اپنے پاں باپ بہن بھائیوں سے ملتی وہ کافی دلگیر ہو رہی تھی۔

لاکھ ضبط کے باوجود بھی اس کی آنکھوں سے چند آنسو پلکوں کا بند توڑ کر باہر نکلے تھے، جنہیں سر جھکا کر اس نے اپنے پلو میں جذب کر لیا۔

دروازے تک پہنچ کر اس نے پلٹ کر ذرا دور کھڑے اپنے پیاروں پر نظر کی تھی، سب کے چہروں پر جگمگاتی خوشی دیکھ کر وہ خود بھی مسکرا دی۔

”انہی کی خوشی میں تو میری خوشی ہے۔“ ان سب کو خدا کے حوالے کرتی وہ دروازہ پار کر گئی۔

کلثوم خالہ کی فرمائش تھی ایرپورٹ پر زیادہ رشتہ دار اسی وجہ سے اس کی فیملی کا کوئی فرد اسے

الوداع کرنے ایرپورٹ نہیں آیا تھا، گاڑی میں اس وقت اس کے علاوہ احسان، کلثوم خالہ اور احسان سے چھوٹا اس کا بھائی موجود تھا، باقی کا سارا وقت اس نے خاموش سامع بنے گزارا، اور جب ان کی فلائیٹ کی اناؤنسمنٹ ہونے لگی تو اس نے احسان کے ہمراہ اپنی ساس سے الوداعی دعائیں سمیٹی اور اپنی منزل کی طرف آگے بڑھ گئی۔

☆☆☆

جہاز جیسے جیسے بلندی کی طرف بڑھ رہا تھا اس کے خوف میں بتدریج اضافہ ہو رہا تھا ڈر کے مارے اس نے آنکھیں سختی سے میچ رکھی تھی، جہاز نے ایکدم جھٹکا کھایا اور انتہائی بلندی پر پہنچ کر سیدھا ہو گیا، ایکدم جھٹکا لگنے کی وجہ سے اس نے ساتھ بیٹھے احسان کا بازو زور سے پکڑ لیا۔

وہ اس کی نئی نوپلی دہن تھی اسے خود اس کا ساتھ دینا چاہیے تھا، مگر یہاں حال یہ تھا اس کا ساتھ مانگنے کو اس نے خود ہاتھ بڑھایا تھا، مگر دوسری طرف سے نہ تو کوئی بیٹھا جملہ سننے کو ملا تھا نہ کوئی شوخ شرارت ہوئی تھی اور نہ ہی اپنے ساتھ کا احساس دلانے کو دلا سہ دینے کو اس نے اپنا ہاتھ بڑھایا تھا، اس نے حیران ہو کر اپنا ہاتھ واپس کھینچ لیا۔

جھکی نظروں سے اس نے اپنے برابر بیٹھے احسان کو دیکھا، وہ اس کی طرف مکمل بے نیاز سیٹ کی پشت سے سر نکالے آنکھیں بند کیے شاید سو رہا تھا، اسے تسلی ہوئی۔

”سو رہے ہیں۔“ اب کی بار اس نے ذرا سا مڑ کر نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔

سینے پر ہاتھ باندھے آنکھیں بند کیے احسان واقعی سوتا ہوا محسوس ہو رہا تھا، اس نے گہری نظر سے اس کا جائزہ لیا۔

بلیو جیو پر بلیک شرٹ پہنے سفید رنگت کا مالک احسان اتنا وجیہ تو تھا کہ کوئی بھی لڑکی اس کے ساتھ کی تمنا کرے اور یہ پیارا سا شخص بن مانگے میری قسمت نے مجھے دے دیا۔

وہ بنا پلک جھپکے اسے دیکھ رہی تھی، یہ اس کی نظروں کا ارتکاز تھا یا احسان سویا ہوا نہیں تھا اس نے بند آنکھیں کھول کر بڑی خاموش نظر اس کی نذر کی تھی، وہ گڑ بڑا کر قدرے کنفیوز ہوتی سیدھی ہو گئی، دل ایکدم ہی دھڑکا تھا۔

”کیا یہ جاگ رہے تھے؟“

”تو پھر مجھ سے انجان کیوں بنے ہوئے تھے؟“ وہ انجھن کا شکار ہونے لگی تھی، مگر اس سے پوچھنے کی ہمت نہ کر سکی، باقی کا سارا سفر انہوں نے اسی خاموش کیفیت میں گزارا تھا، ایک کے سامنے سوچوں کا انبار لگا ہوا تھا تو دوسرا اس سے مکمل بے نیاز دیکھائی دے رہا تھا۔

سفر تمام ہوا اور جہاز لندن ایئر پورٹ پر لینڈ کر گیا۔

احسان نے ایئر پورٹ سے باہر آ کر ٹیکسی ہار کی اور ایک بار پھر سفر شروع ہو گیا اور اب بھی خاموشی تھی، سفر تمام ہوا تو ٹیکسی ایک بڑے سے گھر کے سامنے رک گئی وہ ان جگہوں سے مکمل انجان تھی اس لئے احسان کی تھلید کر رہی تھی، گھر کا بڑا سا گیٹ کھلا تھا گاڑی کی وردی پہنے کوئی شخص باہر آیا تھا، احسان نے اسے ٹیکسی سے سامان اندر لانے کو کہا اور خود اندر کی طرف قدم بڑھا دیئے، اس نے ایک بار پھر اس کی تھلید کی اور اس کے پیچھے اندر چلی آئی، صاف ستھری سنگ مرمر کی بنی روٹ سے گزرتے ہوئے اس نے نظر اٹھا کر اپنے ارد گرد دیکھا تھا، دائیں طرف چھوٹا مگر کھلا سرسبز لان تھا اس کا دل ایکدم ہی چاہا وہ ننگے پاؤں سرسبز گھاس پر چلے۔

مگر اپنی خواہش کا گلا دباتی اس نے نظر کا زاویہ ہی بدل لیا، احسان ایک بڑے سے ہال کمرے میں داخل ہو چکا تھا، وہ بھی اس کے پیچھے اندر چلی آئی، کمرے میں ان دونوں کے علاوہ کوئی تیسرا موجود نہیں تھا، وہ وہیں دروازے کے پاس رک گئی، جبکہ احسان آگے بڑھ کر صوفے پر بیٹھ گیا، کافی دیر وہ اسی طرح کھڑی رہی تھی تب شاید احسان کو اس کے نا ہونے کا احساس ہوا تھا، اس نے گردن موڑ کر اسے دیکھا اور پہلی بار اس سے مخاطب ہوئے۔

”آپ وہاں کیوں رک گئی ادھر آ کر بیٹھیں۔“ اس کی طرح اس کی آواز بھی خوبصورت تھی وہ مرعوب ہوتی آگے بڑھی اور سامنے پڑے صوفے پر ٹک سی گئی۔

”اب رہنا تو یہی تھا پھر یہ تکلف کیسا؟“ اس نے سوچا ضرور تھا مگر اپنی لشت کا انداز تبدیل نہیں کیا تھا۔

وہ نظریں جھکائے اپنے ناخن کھرچ رہی تھی جب اس نے ایک بار پھر احسان کی آواز سنی تھی۔

”میں نہیں جانتا آپ اس شادی کے لئے کیوں تیار ہوئیں، شاید باہر کی دنیا کے چارم نے آپ کو یہ فیصلہ کرنے پر مجبور کیا ہو، مگر میں نے یہ شادی صرف اور صرف اپنی ماں کی خواہش پر کی ان کو لگتا تھا میں یہاں اکیلا ہوتا ہوں کوئی میرا خیال رکھنے والا نہیں ان کی ممتا بے چین رہتی تھی اسی لئے انہوں نے کہا میں کسی سے شادی کر کے اسے اپنے ساتھ یہاں لے آؤں تاکہ وہ میری طرف سے بے فکر ہو جائیں، میری ماں کا کہا ہر لفظ میرے لئے حکم کا درجہ رکھتا ہے اسی لئے میں اس شادی سے انکار نہیں کر پایا، میں اپنی ماں کو دکھ دینا نہیں چاہتا تھا اسی لئے میں ان کو یہ بھی

نہیں بتا سکا کہ میں یہاں شادی کر چکا ہوں، میری بیوی ہے جو میرا بہت خیال رکھتی ہے، میرے دو بچے ہیں جو مجھے بے حد عزیز ہیں، مگر اس سب کے باوجود بھی ان کے کہنے پر میں آپ سے شادی کے لئے تیار ہو گیا۔“ یہ پہلی بار تھا کہ وہ مسلسل بول رہا تھا درمیان میں وہ ذرا دیر کو رکا تو اس نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا، وہ ایک بار پھر بول رہا تھا اس کی نظریں اس کے ہلتے لبوں پر ٹھہری گئی۔

”حسین لوگ سفاک بھی ہوتے ہیں اس کو یہ اندازہ آج ہوا تھا۔“

اسے اپنوں سے اتنی دور لا کر وہ اسے حقیقت سے اب آگاہ کر رہا تھا۔

”امی نے بتایا تھا آپ ٹڈل کلاس فیملی سے تعلق رکھتی ہیں اور یہاں نوکری کرنا چاہتی ہیں، جیسے بھی صحیح مگر اب آپ میری زندگی میں داخل ہو چکی ہیں میں آپ کے ساتھ مزید کوئی ظلم کرنا نہیں چاہتا، (اس سے زیادہ ظلم اور ہو بھی کیا سکتا تھا)۔“ وہ دم سادھے انکشافات کی زد میں تھی۔

وہ اپنی ایک الگ خوشحال فیملی رکھتا تھا اس کی ضرورت تو تھی ہی نہیں پھر وہ یہاں کیا کرے گی؟ ایک بہت بڑا سوالیہ نشان اس کے سامنے کھڑا اس کا منہ چڑا رہا تھا۔

”شاید زندگی شروع ہونے سے پہلے ہی ختم ہو گئی۔“ وہ مزید بھی کچھ کہہ رہا تھا اس نے ایک بار پھر اپنی توجہ اس کی جانب مبذول کی۔

”میں اپنی بیوی بچوں کے ساتھ بہت خوش ہوں میری بیوی مجھ سے بہت محبت کرتی ہے، میں آپ کے اور اپنے رشتے کے متعلق ہر گز اسے کچھ نہیں بتاؤں گا۔“

”آپ اپنی الگ زندگی گزار سکتی ہیں آپ چاہیں گی تو میں آپ کو طلاق دینے کو تیار ہوں،

آپ یہی کسی مسلم لڑکے سے شادی کر لیتا۔“

”نہیں نہیں۔“ اس کی بات کاٹتے ہوئے وہ درمیان میں تیزی سے بولی تھی۔

”مجھے طلاق مت دیں، اگر آپ کسی کو بتانا نہیں چاہیے میں آپ کی بیوی ہوں تو بے شک مت بتائیں مگر مجھے یہاں سات سمندر دور لا کر یوں اکیلا مت کریں، مجھے آپ سے اور کچھ بھی نہیں چاہیے مگر پلیز مجھے طلاق مت دیں۔“ وہ ہلچلی ہوئی تھی۔

”اوکے۔“ اس نے کندھے اچکا دیئے۔

”جیسے آپ کی مرضی مگر میں آپ کو اپنے

ساتھ نہیں رکھ سکتا میں اپنی بیوی کو اطلاع دئے بنا

ایک دن پہلے آیا ہوں وہ اپنی بدر کی طرف گئی

ہوئی ہیں میں نے جان بوجھ کر انہیں اپنے آنے

کی اطلاع نہیں دی وہ بھی بس اس لئے تاکہ

یہاں آپ کو تمام حقیقت سے آگاہ کر سکوں اسی

طرح نہ آپ کو برا بھلا ہوگی نہ مجھے، میں ان کے

سامنے آپ کو اپنی کزن کہہ کر متعارف کرواؤں گا

جو یہاں نوکری کی غرض سے آئی ہے، آپ کی

رہائش کا بندوبست میں کل تک کر دوں گا، کسی

جواب کا انتظام بھی کر دیا جائے گا، بس میں آپ

کی اتنی مدد کر سکتا ہوں اس سے زیادہ نہ میں کچھ

کر سکتا ہوں اور نہ ہی آپ مجھ سے امید رکھیے گا،

پھر اب آپ جیسا چاہے ویسے زندگی گزاریں

میری طرف سے کوئی روک ٹوک نہیں ہوگی۔“

اس نے بڑی صفائی سے اسے اس کی اوقات یاد

دلا دی تھی، اس وقت اسے کچھ بھی محسوس نہیں ہو

رہا تھا، نہ کوئی دکھ، نہ کسی زیادتی کا احساس؟ اس

کے ہلتے لب بند ہو چکے تھے، اس نے نظر اٹھا کر

اس کا چہرہ دیکھا۔

”وہ اسے پہلے سے کہیں زیادہ دور محسوس

ہوا تھا۔“

”یہ میرا تھا ہی کب؟“

کچھ دیر پہلے اسے اپنی قسمت سمجھنے والی سوچ رہی تھی کہ دل ہی دل میں ہنس دی، اس کے ساتھ ظلم تو ہوا تھا مگر اس کے باوجود وہ اس کی اس قدر نوازشوں پر اس کی شکر گزار ہو رہی تھی۔

وہ اس کی رہائش کا اس کی نوکری کا بندوبست کر رہا تھا، اس کو یہی بہت کچھ محسوس ہو رہا تھا، اس نے اس کا شکریہ ادا کیا تھا جس پر اس نے ہلکی سی تکلف بھری مسکراہٹ اس کی نذر کی اور اٹھ کھڑا ہوا۔

”آپ آج کا دن یہاں گزار سکتی ہیں۔“ ایک اور مہربانی کرتا وہ میز اور باہر نکل گیا، وہ ابھی تک اسی انداز میں بیٹھی تھی۔

”اگر یہ یہاں لا کر مجھے طلاق دے کر گھر کے باہر در بدر کرنے کو چھوڑ دیتا تو میں کہاں جاتی؟“ ایک خوفناک سوچ نے اس کا دل دہلایا تھا۔

ایک بار پھر اس نے ممنون نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا جہاں سے کچھ دیر پہلے احسان باہر گیا تھا۔

خود کو دھوکہ دینے والے شخص کی ممنون ہوتی وہ بھول رہی تھی ایک ذات خدا کی بھی ہے جو کبھی اپنے بندوں کو اکیلا نہیں چھوڑتا، احسان کی اس قدر نوازشوں میں نجانے خدا کی کیا مصلحت پوشیدہ تھی؟

☆☆☆

آج اسے اپنوں سے دور ہوئے تیسرا دن تھا جبکہ یہاں ان بے مہر لوگوں کے درمیان اس کی پہلی صبح تھی، رات سوچوں کے درمیان پوری رات جاگتے گزری تھی دن کی پہلی کرن پھوٹنے لگی تو نیند اس پر مہربان ہو گئی تھی یہی وجہ تھی وہ دن بھر سوئی رہی، اب جب آنکھ کھلی تو

دھوپ کی تیز کرنیں وینڈو سے اندر آ کر کمرے کو مزید روشن کر رہی تھی، ایکدم آنکھ کھلنے پر پہلے تو اسے سمجھ ہی نہیں آیا وہ کہاں ہے کچھ دیر وہ اسی طرح ساکت و صامت پڑی رہی پھر جب تمام حسیں بیدار ہوئیں تو وہ ایکدم تیزی سے اٹھ بیٹھی، اپنے چاروں طرف نظر دوڑائی وہ پشیمان ہوئی تھی۔

پہلے ہی دن اس قدر سوئی، مگر یہاں پروا کسے تھی، اس نے گردن موڑ کر دیکھا اس کا بیگ وہیں پڑا تھا جہاں کل اس نے رکھا تھا، وہ بیڈ سے اتر آئی۔

کل کی نسبت آج باہر سے چہل پہل کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں، اس کا مطلب تھا احسان اپنے بیوی بچوں کو لے آیا ہے۔

آنے والے حالات کے لئے چند پل اس نے وہی کمرے ہو کر کچھ سوچا پھر گہری سانس بھرتی فریش ہونے کے لئے واش روم کی طرف بڑھ گئی، چکنے فرش والا واش روم کسی کمرے کی طرح بڑا روشن اور صاف تھا، اسے اپنے کمرے کا تنگ سا واش روم یاد آ گیا، جہنی روائیکدم ہی گھر سے گھر والوں کی طرف بھگی تھی، اس کے دل میں ہوک سی اٹھی۔

مگر وہ کیا کر سکتی تھی ابھی تو اس کے پاس گھر والوں سے رابطے کا کوئی بھی ذریعہ نہیں تھا، جب کوئی کام ہو ہی نہیں سکتا تو پھر اس کے متعلق سوچنے سے کیا حاصل؟ دماغ میں آئی سوچوں کو جھٹکتی وہ دانت صاف کرنے لگی، فریش ہو کر جب وہ واش روم سے باہر آئی کمرہ اب بھی اسی طرح خالی تھا۔

”شاید مجھے یہاں لا کر بھول گئے ہیں۔“ کافی دیر وہ اس امید کے ساتھ وہاں بیٹھتی رہی شاید کسی کو اس کا احساس ہو جائے، مگر انتظار بے

سود رہا، بھوک نے ستایا تو وہ بے چین ہو گئی کافی دیر خود پر ضبط کیا مگر جب بھوک سے بحال ہونے لگی تو خود دروازہ کھول کر باہر آ گئی، باہر بھی کوئی نظر نہیں آیا۔

”نجانے سب کہاں گئے؟“ وہ اندازے کے مطابق سامنے چلنے لگی۔

”کوئی تو منزل مل ہی جائے گی۔“ کبھی کبھی اندازے بھی درست ثابت ہوتے ہیں اس کے ساتھ بھی یہی ہاتھ تھا، وہ ٹھیک جگہ پہنچی تھی، اندر سے آتی آوازیں کسی کی موجودگی کا احساس دلا رہی تھیں، یہ باورچی خانہ تھا وہ جھجکتی ہوئی اندر داخل ہو گئی۔

اندر احسان اور اس کے ساتھ شاید اس کی بیوی کھڑی تھی، دونوں اس کی طرف پیٹھ موڑے کھڑے تھے، وہ لڑکی شاید کچھ پکا رہی تھی جبکہ احسان پشت پر ہاتھ باندھے اس سے باتیں کر رہا تھا۔

وہ وہیں رک گئی، اسے فوری طور پر کچھ سمجھ نہیں آیا اس پل وہ کیا کرے واپس پلٹ جائے یا انہیں اپنی طرف متوجہ کرے، اسی شش و پنج میں کھڑی وہ انگلیاں مڑ رہی تھی جب احسان کی نظر اس پر پڑی۔

”ارے آپ جاگ گئیں؟“ اس لڑکی نے اسی پل مڑ کر احسان کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا تھا، احسان اگر حسین تھا تو اس کی بیوی حسین تر تھی۔

وہ دونوں ساتھ ساتھ کھڑے ایک شاندار پرفیکٹ کپل محسوس ہو رہے تھے، اس کی نظریں احسان کی بیوی پر لگی تھیں۔

جو اپنے لمبے براؤن بالوں کی چوٹی آگے ڈالے رف سے چلیے میں بھی بہت خاص دیکھائی دے رہی تھی، وہ اس قابل تھی کہ اس کی رفاقت

میں کوئی بھی شخص خوشگوار زندگی گزار سکتا تھا، احسان نے جو کہا ٹھیک کہا تھا، وہ ایمان لے آئی۔

”اس قدر خوبصورت بیوی کے ہوتے بھلا میری ضرورت کیا ہو سکتی ہے؟“ اس نے ایکدم اس پر سے نظریں ہٹالیں۔

”جی۔“ اس نے مختصر جواب دیا تھا۔

”راضیہ یہ ہے میری کزن عازہ، جس کا میں نے تمہیں بتایا تھا؟“ وہ مسکرا دی ایک خوبصورت سی مسکراہٹ۔

”ہیلو عازہ ہاؤ آر یو۔“ اس بار اس نے اپنے چند لفظ اس کی نذر کیے، تو وہ بھی ہلکی سی مسکراہٹ لبوں پہ سجائے مختصر ابولی۔

”فائن۔“

”آپ کو بھوک لگی ہوگی میں نے آپ کے لئے ناشتہ تیار کیا ہوا ہے۔“ شاید احسان نے اس کے متعلق اپنے طریقے سے کافی اچھی طرح سمجھا دیا تھا جب ہی وہ اس سے اس قدر خوش اخلاقی سے پیش آرہی تھی، اس نے اقرار میں سر ہلا دیا، اسے واقعی سخت بھوک لگ رہی تھی، تب راضیہ نے کچن ٹیبل پر ہی اس کے لئے ناشتہ سرو کر دیا، احسان انہیں اکیلا چھوڑ کر باہر چلا گیا۔

عازہ نے تھوڑا سا سکون محسوس کیا اور خاموشی سے بیٹھ کر ناشتہ کرنے لگی، راضیہ پاکستان کے لوگوں کے متعلق گفتگو کرنے کے دوران احسان کی فیملی کے متعلق اس سے سوال کرنے لگی اور ساتھ ساتھ اپنے کام بھی نمٹاتی رہی، اس نے اس کے سوالوں کے مختصر جواب دیئے جہاں احسان کی فیملی کے متعلق سوال شروع ہوئے تو اس نے گول مول جواب دے کر اسے مطمئن کر دیا۔

ناشتے سے فراغت کے بعد وہ کچن سے باہر آئی راضیہ اس کے ہمراہ تھی وہ اسے ساتھ لئے

ٹی وی لاؤنج میں چلی آئی جہاں احسان اپنے بچوں کے ساتھ ویڈیو گیم کھیل رہا تھا، انہیں اندر آتے دیکھ کر وہ سیدھا ہو بیٹھا وہ اور راضیہ ایک ہی صوفے پر بیٹھ گئیں، تب احسان اس سے مخاطب ہوا۔

”عائزہ آپ کی رہائش کا مسئلہ حل کر دیا ہے اسی ایریا میں قریب ہی ایک گھر میں آپ کو اس کی اوپری منزل رینٹ پر لے دی ہے، آپ اس میں آرام سے رہ سکتی ہیں ویسے تو میں خود بھی وہاں کا چکر لگا آیا ہوں وہاں ہر سہولت موجود ہے مگر پھر بھی آپ کو کوئی مسئلہ ہو تو آپ بلا جھجک بتا سکتی ہیں۔“

”جی۔“ وہ مسکرا کر سر جھکا گئی۔

”مسٹر احسان اس اتنے بڑے گھر میں مجھے ایک کونے میں جگہ دے دیتے تو میں وہاں بھی ایڈجسٹ کر لیتی، یہ اتنے تکلف کی کیا ضرورت تھی، مگر شاید ضرورت تھی۔“ وہ خود سے سوالاً جواباً ہوئی تھی، احسان مزید کہہ رہے تھے۔

”اور آپ کے لئے فوری طور پر ایک شاپ پر سیل گرل کی جاب مل سکی ہے آپ کچھ عرصہ وہاں تجربہ کرنا پھر جب آپ ٹھیک طرح سے ایڈجسٹ ہو جائیں گی تو کوئی اور جاب دیکھیں گے۔“ وہ اس کے لئے اتنی سٹرگل کر رہا تھا یا شاید اپنے لئے، مگر جو بھی تھا کم از کم اس کے لئے اچھا تھا، اس دیار غیر میں اس کی جاب کا بندوبست تو ہوا اور پھر اس کا مقصد بھی تو یہی تھا، اس نے احسان کا شکر یہ ادا کیا تھا۔

پھر اس نے مزید چند گھنٹے وہاں گزارے تھے پھر احسان اسے اس گھر تک چھوڑنے اس کے ساتھ آیا تھا، یہ ایک چھوٹا سا کشادہ گھر تھا اس ایک کے لئے تو یہ خاصا بڑا تھا، گھر کی لوکیشن کافی اچھی تھی، اس میں دو کمرے، کچن اور واش روم

تھے بائیں طرف ایک چھوٹا سا ٹیرس بھی نظر آ رہا تھا، وہ اس کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئی تو وہاں ضروریات زندگی کے لئے استعمال ہونے والا کافی سامان موجود تھا۔

”ایک اور مہربانی؟“ اس نے تشکر بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا مگر وہ اس کی طرف دیکھے بنا اسے بتا رہا تھا۔

”یہ کچھ سامان ہے، اس کے علاوہ کچن کے استعمال کے لئے بھی اشیائے خوردنوش کے ساتھ ساتھ کچن کا ضروری سامان بھی موجود ہے، جو ایک مہینہ تک آپ کے لئے کافی ہوگا، باقی بعد میں آپ خود دیکھ لیجئے گا۔“

گو کہ وہ اس کی ذمہ داری بس جب تک کہ لئے تھی جب تک وہ خود کمانے کے قابل نہیں ہو جاتی، پہلی تنخواہ ملنے تک کے دنوں کے لئے اس نے اپنی ذمہ داری کو بخوبی نبھانا چاہا تھا اور خوب نبھا بھی رہا تھا۔

وہ خاموش ہی رہی، گھر اچھی طرح دیکھ لینے کے بعد وہ اسے اس شاپ کو دیکھانے کے لئے لے آیا جہاں اسے کام کرنا تھا، شاپ گھر سے زیادہ دور نہیں نہ تھی، انہوں نے یہ راستہ پیدل طے کیا تھا، عائزہ راستے کو ازبر کرنے کی کوشش میں لگی رہی۔

”آج کے بعد اسے ان راستوں پر تنہا ہی تو چلنا تھا۔“

احسان نے شاپ کے چند اور لوگوں سے اس کا تعارف کرایا تھوڑی بہت جان پہچان کے بعد وہ واپسی کے لئے پلٹ آئے۔

”خاموش راستے، خاموش ہمسفر۔“

ناک کی سیدھ میں خاموش چلنے کے بعد وہ عائزہ کے گھر کے باہر رک گئے آگے کا سفر اسے خود طے کرنا تھا، وہ آگے بڑھ جانا چاہتی تھی جب

احسان نے اسے بکارا۔

”عائزہ یہ سیل فون آپ کے لئے۔“ اس نے پلٹ کر اس کے ہاتھ میں دبے موبائل کو دیکھا پھر اس کی طرف نظر کی ایکدم ہی اس کے لبوں پہ مسکراہٹ در آئی۔

”کیا کہوں تمہیں مسٹر احسان، ظالم مہربان یا معصوم انسان۔“

”مگر جو بھی ہے تم نے اب تک کی اپنی تمام ذمہ داریاں اچھی طرح پوری کر دی۔“

سیل فون اس کی ضرورت تھی، سو اس نے خاموشی سے موبائل اس کے ہاتھ سے لے لیا۔

اب کی بار اس نے شکریہ جیسے لفظ ادا نہیں کئے تھے، آخر یہاں تک شکریہ ادا کرتی وہ اس کی مہربانیوں کے بوجھ تلے دبنے لگی تھی۔

”چلو ایک اور مہربانی سچ۔“ اس پر آخری نظر ڈال کر وہ پلٹی اور گیٹ سے اندر داخل ہو گئی، احسان بھی وہاں سے پلٹ گئے۔

”وہی طور پر مل جانے والوں کے راستے اب سے جدا جدا تھے۔“

☆☆☆

کمرے میں پہنچ کر سب سے پہلے اس نے احسان کے دیئے موبائل سے اپنے گھر کال کی تھی۔

پہلی ہی بیل پر اس کی کال پک کر لی گئی تھی، اس نے بڑی خوش دلی سے انہیں سلام کیا تھا۔

فوزیہ اس کی آواز سن کر پہلے تو حیران ہوئی اسے یقین کرنا مشکل لگ رہا تھا، عائزہ اتنی دور ہو کر بھی ایکدم ان کے قریب محسوس ہونے لگی تھی۔

”عائزہ تم، تم ٹھیک تو ہو؟“

”وہاں خیریت سے پہنچ گئی، احسان کیسا ہے؟“ انہوں نے ایک سانس میں کئی سوال کر

ڈالے تھے۔

اتنی دور پردیس میں اپنے پیاروں کی آواز کس خوشی سے دوچار کرتی ہے اس بات کا اندازہ عائزہ کو اچھی طرح ہو رہا تھا، اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔

”اماں میں ٹھیک ہوں، تم سب کیسے ہو؟“ اس کی آواز بھرا گئی۔

”ہم سب بھی ٹھیک ہیں، تمہارا گھر کیسا ہے؟“ تیز اونچی آواز میں اشتیاق بھرا تھا۔

”سب اچھا ہے اماں، ابا کیسے ہیں، سعید، سعدیہ، ثمن اور صدف سب کیسے ہیں ان سے میری بات کرواؤ ناں۔“ وہ ایکدم بے چین ہو گئی، اپنوں سے دوری کا احساس حد سے بڑھنے لگا تھا، آنسوؤں کی روانی میں روانی آ گئی تھی۔

”ہاں یہ سب یہاں کھڑے ہیں یہ لو پہلے اپنے ابا سے بات کرو۔“ اس نے موبائل کمال کے ہاتھ میں دیا تھا۔

”کیسی ہے میری بیٹی؟“ کتنی چاسنی بھری تھی ان کے انداز میں اس کا دل کھینچنے لگا۔

”ٹھیک ہوں ابا آپ اپنا خیال رکھتے ہیں ناں؟“

”ہاں بیٹی میں خیال رکھتا ہوں اور.....“

ان کی بات درمیان میں رہ گئی ان کے ہاتھ سے موبائل معید نے اچک لیا تھا۔

”آپ آپ کو نوکری مل گئی؟“

”ہاں معید مجھے بڑی اچھی نوکری ملی ہے۔“ اس کے لبوں پہ پہلی بار ہلکی سی مسکراہٹ آ کر فوراً معدوم ہو گئی۔

”اچھا آپ یہ سعدیہ بھی بات کرنا چاہ رہی ہے۔“

”ہاں بات کرواؤ۔“ اس نے کہا۔

اس سے پہلے سعدیہ بات کرتی موبائل

سے ابھرتی ٹوٹو کی آواز سے رابطہ منقطع ہونے کی نشاہدی کردی۔

”شاید بیلنس ختم ہو گیا۔“ اس نے موبائل بگ میں رکھا اور کمرے کے بیچ کھڑے ہو کر ارد گرد بکھرا سامان دیکھا۔

یہ سب اسے سیٹ کرنا تھا، کچھ دیر کھڑا رہنے کے بعد دوپٹہ سائیڈ پر رکھ کر وہ کام میں جست گئی، دوڑھائی گھنٹے کی محنت کے بعد وہ تمام سامان ان کی جگہوں پر سیٹ کر چکی تھی اتنی محنت مشقت کے بعد اسے بھوک ستانے لگی تھی، سو اس نے اپنے لئے چائے بنائی فریج میں ڈبل روٹی موجود تھی اس نے اس کے چار سلائس سینک کر چائے کے ساتھ کھا کر اپنی بھوک مٹائی، پیٹ بھرا تو نیند آنکھوں میں اترنے لگی۔

ویسے بھی رات ہو رہی تھی، اس نے کھڑکیاں اور دروازے اچھی طرح بند کئے اور سونے کے لئے لیٹ گئی، دن بھر محنت کا نتیجہ تھا اسے فوراً ہی نیند آ گئی۔

مصرفیت کے بعد اب نیند اس کے لئے بہت بڑی نعمت تھی جس نے اس کا دھیان اپنے اکیلے پن کی طرف جانے ہی نہیں دیا تھا ورنہ یہاں پردیس میں اکیلا پن اس کا سانس لینا دو بھر کر دیتا۔

آج کا دن تمام ہوا آگے کیا ہونا تھا یہ وقت گزرنے پر معلوم ہونا تھا۔

☆☆☆

رات جلد سو جانے کی وجہ سے اس کی آنکھ وقت سے پہلے کھل گئی، وہ ایکدم گہری نیند سے جاگی تھی، دن کا اجالا بند کھڑکیوں کے شیشوں سے اندر آ کر کمرہ بکا روشن کر رہی تھی اس نے آنکھیں کھول کر موبائل پر ٹائم دیکھا، ابھی پانچ بج تھیں۔

اسے سات بجے جا ب پر جانا تھا، ابھی اس کے پاس مزید دو گھنٹے باقی تھے، موبائل رکھ کر وہ دوبارہ آنکھیں بند کیے لیٹ گئی۔

بند آنکھوں کے پیچھے گزیرے وقت کی یادوں نے دستک اچانک ہی دی تھی۔

”عائزہ اٹھ جاؤ تمہیں سکول بھی جانا ہے ورنہ دیر ہو جائے گی۔“

اس کی صبح روز فوریہ کی آواز سن کر ہوا کرتی تھی، وہ اتنی فکر سے اسے اٹھایا کرتی تھی کہ اکثر ان کا فکر مندا انداز دیکھنے کے لئے وہ جان بوجھ کر سوتی بن جایا کرتی تھی اور آج وہ خود ہی بیدار ہو گئی، اماں کی آواز اس پاس ہوا میں تحلیل ہو گئی۔

”اماں!“ اس کے لبوں نے بنا آواز لرزش کی تھی۔

”کیوں خود سے اتنی دور کر دیا اماں۔“

اب لیٹا رہنا دو بھر ہونے لگا تو وہ کمبل پرے دھکیل کر بستر سے اتر آئی، گھر صاف پڑا تھا اس کے پاس کرنے کو کچھ بھی نہیں تھا، وہ بلا ارادہ ہی کھڑکی کے پاس آئی اس کی سلائیڈ ہٹا کر باہر جھانکنے لگی۔

ایک دم ٹھنڈی ہوائ نے اس کا استقبال کیا، کچھ دیر آنکھیں بند کئے وہ ہوا کا لطف لیتی رہی، پھر آنکھیں کھول کر ارد گرد کا جائزہ لینے لگی۔

یہ شاید گھر کا پچھلا حصہ تھا، جس کا بڑا حصہ لان پر مشتمل تھا اسے ایکدم ہی خوشگواریت کا احساس ہوا، پھول ہمیشہ سے اس کی کمزوری رہے تھے اور یہاں تو ہر طرح کے پھول دیکھائی دے رہے تھے، وہ اشتیاق بھری نظروں سے پھولوں کو دیکھنے لگی جب ایک کونے میں اسے ایک لڑکی دیکھائی دی جو پائپ ہاتھ میں لئے پودوں کو پانی دے رہی تھی، وہ لڑکی پورے انہماک سے اپنے کام میں مگن تھی، اس نے بے

ساختمی اے اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے
پکارا تھا۔

”ہیلو۔“ اس لڑکی نے اس کی سمت دیکھا تو
اس نے ہاتھ ہلا کر اس کی توجہ حاصل کی، اس لڑکی
نے اسے دیکھا تو ریکی مسکراہٹ کے ساتھ جواباً
ہاتھ ہلا کر ہیلو کیا تھا۔

”ہیلو..... ہاؤ آر یو؟“

”می فائن۔“ اس نے جواباً مسکرا کر کہا۔

”فارغ ہیں تو نیچے آ جائیں، ساتھ میں
ناشتہ کریں گے۔“ اس نے خوش اخلاقی سے اسے
نیچے آنے کی دعوت دی، تو اس نے کچھ سوچ کر
حامی بھر لی۔

اب اس دیس میں بنا شناسائی کے گزارا
کیسے ممکن تھا؟ کھڑکی بند کرتی وہ پیچھے ہٹی اور کچھ
دیر بعد فریش ہو کر اس کے سامنے موجود میز
پر ناشتہ لگائے اس کی منتظر تھی۔

اس نے خوبصورت مسکراہٹ کے ساتھ اس
کا استقبال کیا تھا۔

”کل پورا دن آپ سے ملاقات ہی نہیں ہو
سکی۔“ اس نے کہا۔

”جی کل میں بھی مصروف تھی پھر رات بھی
جلدی سو گئی۔“ اس نے جواب دیا۔

”چلیں کوئی بات نہیں ابھی ناشتہ شروع
کریں۔“ اس نے ناشتہ سرو کرنا شروع کر دیا۔

ایک پلیٹ میں بل والا پراٹھا تھا جس کے
اوپر آلیٹ رکھا تھا ساتھ میں چائے اور اچار،
خالص پاکستانی ناشتہ دیکھ کر اس نے حیرت سے
اسے دیکھ کر پوچھا۔

”آپ پاکستانی ہیں؟“

”جی بالکل کوئی شک ہے کیا؟“ اس کے
لیپوں پہ دبی دبی مسکراہٹ تھی، پھر وہ مزید بولی

”کیا میں پاکستانی نہیں لگتی؟“

”لگتی ہیں مگر اس قدر خالص پاکستانی
نہیں۔“ اس نے انہی کے انداز میں کہتے ہوئے
ناشتے کی طرف اشارہ کیا تھا۔

”اصل میں آپ کی طرح میں بھی پاکستان
سے آئی ہوں مجھے کئی سال ہو گئے یہاں آئے
ہوئے، کافی عرصہ ہوا میں نے اس طرح کا ناشتہ
کرنا چھوڑ دیا ہے پھر اتنے اہتمام کی فرصت بھی
نہیں ملتی یہ تو آج آپ کی وجہ سے میں نے
خصوص ناشتہ بنایا ہے، مسٹر احسان نے بتایا تھا
آپ پاکستان سے آئی ہیں۔“ اس نے کافی
تفصیل سے جواب دیا تھا، اس نے قدرے
تکلف سے ناشتہ شروع کر دیا جب انہوں نے
کہا۔

”تکلف کیسے بنا آرام سے ناشتہ کریں۔“
تو وہ ان کے بے تکلفانہ انداز دیکھ کر خود بھی
ریلیکس ہو گئی۔

”میرا نام عازہ ہے۔“ اس کو اپنا تعارف
کراٹا یاد آیا۔

”اوہ اتنی اہم بات تو ہم بھول ہی گئے۔“
اس نے سر پر ہاتھ مارا۔

”میرا نام عظمیٰ ہے، یہاں ایک آفس میں
کمپیوٹر آپریٹر کی جاب کرتی ہوں، تم کس لئے
یہاں آئی ہو؟“ اس نے تکلف کی آخری دیوار بھی
گرا دی۔

”میں یہاں کس لئے آئی ہوں۔“ اس نے
زیر لب بڑبڑایا، پھر مسکرا کر اس کی طرف دیکھ کر
بولی۔

”معاش روزگار یہاں تک کھینچ لایا۔“
”مطلب پیسے کمانے آئی ہو۔“ اس نے کہا
تو اس نے اقرار میں سر ہلا دیا۔
”اچھا تو پھر یہاں کس قسم کی جاب ملی؟“ وہ

استفہامیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔
 ”میں یہاں ابھی کچھ نہیں جانتی، مگر احسان صاحب نے یہاں ایک شاپ پر سیل گرل کا کام دلویا ہے۔“ اس نے بتایا۔

”ہنہ، تعلیم کتنی ہے تمہاری؟“ ناشتے کے ساتھ ان کی گفتگو بھی جاری تھی۔

”میں نے انگلش ایم اے کیا ہے، ساتھ میں کچھ کمپیوٹر کورسز بھی کیے ہوئے ہیں۔“ اس نے اپنی قابلیت سے آگاہی دی۔

”کمپیوٹر کورس کر رکھا ہے تو تمہیں آفس میں جاب مل سکتی ہے، سیل گرل کی تنخواہ تو اتنی زیادہ نہیں ہوگی۔“

”تو پھر اب میں کیا کروں؟“ وہ مدد طلب نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

”اس شاپ پر جوائننگ کب سے دینی ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”آج سے۔“ اس نے بتایا۔

”تو پھر تم وہاں مت جاؤ ان لوگوں سے ایکسیوز کر لو، تم میرے ساتھ چلو، میرے آفس میں فوری ورکر کی ضرورت ہے، تمہیں وہاں جاب مل جائے گی، تنخواہ اتنی تو ہوگی کہ پاکستانی حساب سے ایک لاکھ تک بن جائے گی۔“ چائے کا سیپ لیتے ہوئے اس نے بتایا۔

”ایک لاکھ۔“ اس کے ہاتھ سے کپ پھسلنے لگا تھا جسے مضبوطی سے دونوں ہاتھوں میں تھام کر گرنے بجایا تھا۔

”ہاں تم ہے کیا؟“ اس نے پوچھا۔
 ”نہیں، نہیں تو، یہ تو بہت زیادہ ہے۔“ وہ سادگی سے سچ بتا گئی۔

”انوسٹ گرل۔“ اس کی اس قدر سادگی سے اس کے لبوں پر مسکراہٹ بکھیر دی تھی۔

”اب ناشتہ ختم کر کے تیار ہو جاؤ پھر ساتھ

چلتے ہیں۔“ وہ ناشتہ ختم کر چکی تھی اسے جلدی کرنے کی تلقین کی۔

تو اس نے باقی بچی چائے کا لمبا سا گھونٹ بھرا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

”میں تیار ہوں بس اپنا بیگ لے کر آتی ہوں۔“ اس نے سر ہلا کر جانے کی اجازت دی تو وہ اوپر جانے کے لئے اندرونی راستے کی طرف مڑ گئی۔

یہ ایک ہی گھر تھا مگر اوپر کا پورشن الگ کرنے کے لئے اس کا ایک راستہ الگ سے نکال رکھا تھا، جبکہ ایک راستہ نیچے کے پورشن کے ساتھ بھی جوڑا گیا تھا، اس وقت اس نے یہی اندرونی راستہ چنا تھا، چند سیکنڈ بعد وہ بیگ لئے دوبارہ نیچے آ گئی۔

عظمیٰ اس کی منتظر تھی اسے دیکھ کر وہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی، پھر گھر کو لاک کرتی وہ دونوں ایک ساتھ وہاں سے نکل گئی۔

☆☆☆

عظمیٰ کے آفس میں اس کی جاب ہو گئی، وہ بہت زیادہ خوش اور مطمئن تھی احسان کے بعد اب عظمیٰ نے اس کی بہت مدد کی تھی، عظمیٰ کے ساتھ کی بدولت وہ بہت جلد اس ماحول میں سیٹ ہو گئی، اسے یہاں آئے مہینہ ہونے والا تھا، اتنے عرصے میں وہ کافی حد تک عظمیٰ کے ساتھ گھل مل گئی تھی، اس کا تعلق کراچی سے تھا تو عظمیٰ کا تعلق اسلام آباد سے تھا، عظمیٰ اس کے ساتھ کافی مخلص ثابت ہوئی تھی، ہر قدم پر وہ اس کا ساتھ دے رہی تھی، اس کی طرح عظمیٰ بھی پیسے کما کر گھر بھیجا کرتی تھی، اس نے ان دنوں بس ایک بار ہی گھر بات کی تھی، اپنے ساتھ لائے روپے وہ بہت کفایت شعاری سے خرچ کر رہی تھی، اس عرصے میں احسان سے اس کی ملاقات دوبارہ نہیں ہوئی

تھی اور نہ ہی ملاقات کے امکانات نظر آ رہے تھے، وہ خود بھی اس کی زندگی میں کوئی مشکل پیدا کرنا نہیں چاہتی تھی، جتنا وہ اس کے لئے کر چکا تھا وہ اتنے پر ہی اس کی شکر گزار تھی۔

اس وقت جاب سے واپسی کے بعد وہ اپنے لئے چائے بنا رہی تھی جب عظمیٰ اوپر چلی آئی، اسے کمرے میں موجود نہ پا کر وہ کچن میں اس کے پاس آگئی۔

”میرے لئے بھی ایک کپ بنا لینا۔“ وہ بے تکلفی سے کہتے ہوئے کاؤنٹر پر چڑھ کر بیٹھ گئی۔

”تم آج اوپر کیسے؟“ وہ بہت کم اوپر آیا کرتی تھی زیادہ تر عازہ نیچے جاتی تھی۔

”بس آج میں نے سوچا میں خود اوپر کی ہوا کھانے آ جاؤں۔“

عظمیٰ کافی ملنسار لڑکی تھی خود بھی ہر دم ہنستی رہتی اور کوشش کرتی اس کے ساتھ موجود ہنسی بھی تمام فکر و الم بھول کر مسکرائے۔

عازہ نے ہنستے ہوئے کیبل میں ایک کپ چائے کا پانی اور ڈال دیا۔

ماحول پر کچھ پل کے لئے خاموشی چھا گئی، جسے محسوس کر کے عازہ نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔

”کیا ہوا خاموش کیوں ہو گئی؟“ چائے کو دم لگا کر وہ اس کے قریب چلی آئی۔

”بس ویسے ہی۔“ اس نے ٹالنا چاہا مگر اسے صاف محسوس ہوا وہ کچھ کہنا چاہتی ہے۔

”ایسے تو تم کبھی خاموش نہیں ہوتی، ضرور کوئی بات، اتنا الجھک کیوں رہی ہو، کہو جو کہنا چاہتی ہو۔“ اس نے اس کا حوصلہ بڑھایا تھا جس کی بدولت وہ بولنے پر آمادہ نظر آنے لگی۔

”دراصل میں کافی دن سے آج بات

پوچھنا چاہ رہی تھی مگر پوچھ نہیں پائی کہ کہیں تم ناراض نہ ہو جاؤ، کہیں میں تمہارے کسی پرسنل میں مداخلت نہ کر دوں۔“ اس کے انداز میں اب بھی ہچکچاہٹ نمایاں تھی۔

چائے پک چکی تھی، عازہ نے وقتی خاموشی کے ساتھ چائے دو کپوں میں ڈالی اور کپ چائے اس کے پاس آ کر ایک کپ اس کی طرف بڑھا دیا، اس نے خاموشی سے کپ تھام لیا۔

”آؤ اندر چل کر بات کرتے ہیں۔“ اس نے باہر کی طرف قدم بڑھائے تو وہ بھی کاؤنٹر سے اتر کر اس کی معیت میں کمرے میں چلی آئی۔

دونوں ایک ہی صوفے پر بیٹھ گئیں، عازہ نے پاؤں پر پاؤں چڑھا کر رخ اس کی طرف کیا پھر گویا ہوئی۔

”عظمیٰ تمہارے مجھ پر اتنے احسان ہیں تم جان بھی مانگو تو بھی میں منع نہ کر پاؤں گی اس انجانے ملک میں جہاں میرا کوئی اپنا نہیں تھا وہاں تم نے اپنوں سے بڑھ کر میرا ساتھ دیا، تمہارا احسان میں کبھی نہیں بھول سکتی اور اس احسان کو بھی درمیان میں نہ لاؤں تو میڈم تم میری دوست ہو اور دوست کا اتنا حق تو ہوتا ہے کہ اس سے ناراض نہ ہوا جائے اپنے پرسنل اس سے چھپائے نہ جائے، تم دوست ہو میری۔“ اس نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے اس کو اس کی اہمیت کا احساس دلایا، پھر بولی۔

”میں تم سے کبھی بھی ناراض نہیں ہو سکتی، تم بلا جھجک کچھ بھی پوچھ سکتی ہو، میں تم سے کچھ نہیں چھپاؤں گی۔“ اس نے ہاتھ بڑھا کر اس کے کندھے پر رکھ کر دبایا گویا اسے حوصلہ دے رہی ہو، تب اس نے کہا۔

”میں تمہارے اور احسان کے رشتے کے

متعلق جاننا چاہتی ہوں، میرا مطلب ہے وہ تمہارا کیا لگتا ہے جو پاکستان سے تمہیں یہاں لے تو آیا مگر پلٹ کر خبر نہیں لی، اگر وہ تمہیں یہاں لایا تو ضرور تمہارا رشتے دار ہوگا، مگر یہ کیسا رشتے دار ہے جس نے پہلے دن کے بعد پلٹ کر تمہاری خبر نہیں لی؟“ اس نے اپنی سوچ کی وضاحت کی تھی۔

”بس اتنی سی بات۔“

”پاگل مجھے پریشان کر دیا کہ پتا نہیں کیا بات ہے جو تمہیں اسی طرح بولنے سے روک رہی ہے۔“ سر جھٹک کر اس نے چائے کا سیب بھرا۔
”یہ اتنی سی بات ہے کیا؟ میں کتنے ہی دن سے اس بات کو لے کر پریشان ہوتی رہی۔“
”تو کس نے کہا تھا پریشان ہوتی رہو، تم پہلے دن ہی پوچھ لیتی۔“

”اچھا اب تو پوچھ لیا ناں تم اب تو بتا دو۔“ وہ جاننے کی متنی تھی۔

”احسان سے میرا نکاح ہوا تھا۔“ کپ سائیڈ میں رکھ کر اس نے جیسے دھماکہ کیا۔

”نکاح..... مطلب وہ تمہارا شوہر ہے۔“ اس کو یقین ہی نہیں ہو رہا تھا۔

”ہاں۔“ اس نے مختصر کہا۔

”تو یہاں لا کر تمہیں یوں چھوڑ کیوں دیا؟ تم بیوی ہو اس کی۔“ اس کے چہرے پر اب بھن بھری کیفیت نمایاں تھی۔

”ہم..... نہیں بلکہ میں ایک ڈیل کے مطابق یہاں آئی ہوں۔“

”پلیز مجھے کھل کر بتاؤ۔“ چائے سے بھرا کپ جوں کا توں اس نے سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا، تب عائزہ نے اپنے اور احسان کے رشتے سے لے کر یہاں آنے تک کے تمام حالات اس کے گوش گزار کیے جسے سن کر اس کی آنکھیں حیرت

کی زیادتی سے پھیل سی گئی۔
”تمہارے ساتھ تمہارے گھر والوں نے ظلم کیا اور ان سے بڑھ کر ظلم احسان نے کیا، اگر یہ وہاں نکاح سے پہلے تمہیں یہ سب بتا دیتا تو تم خود اس رشتے سے انکار کر سکتی تھی بات تب بھی اس پر نہ آتی، مگر اس نے تم سے نکاح کیا تمہیں یہاں لایا اور چھوڑ دیا۔“

”چھوڑا کہاں، میں نے طلاق لینے سے انکار کر دیا۔“ عائزہ نے فوراً اس کے جملے کی تصحیح کی تھی۔

”چھوڑنا صرف طلاق دینا ہی نہیں ہوتا یہ جیسے تمہیں بے یار و مددگار چھوڑ دیا، اسے اور کیا کہتے ہیں؟ تم بیوی ہو اس کی اسے تمہیں ساتھ رکھنا چاہیے۔“ اس نے فوراً تیزی سے کہا۔

”بے یار و مددگار نہیں چھوڑا، یہاں لا کر میری مدد کی یہ گھر لے کر دیا، جس کی بدولت مجھے تم جیسی پیاری دوست ملی۔“ وہ احسان کو کسی صورت قصور وار ٹھہرنے دینا نہیں چاہتی تھی۔
”تم اس کی بیوی ہو۔“ عظمیٰ نے ایک ایک لفظ پر زور دیا تھا۔

”اس کی پہلے سے ایک خوبصورت بیوی ہے دو بچے ہیں جن کے ساتھ وہ خوش ہے اس کی فیملی مکمل ہے، پھر وہاں ان کے درمیان میری کیا ضرورت؟ ہمارا ساتھ ایک سمجھوتے کے تحت ہوا، میں یہاں پیسے کمانے آئی ہوں، پیسے کماؤں گی مگر بیچ دوں گی بس بات ختم۔“

”تم اکیلی کب تک رہو گی، آج نہیں تو کل تمہیں ایک ساتھی کی ضرورت محسوس ہو گی عائزہ۔“

”تم بھی تو اکیلی رہی ہو۔“ اس نے جتنا ہی نظروں سے اس کو دیکھا تھا۔

”میری بات اور تمہی یار، میں ممکن شدہ ہوں

میں طے شدہ وقت کے لئے یہاں آئی تھی وہ وقت مکمل ہونے کو ہے، میں واپس چلی جاؤں گی، وہاں جا کر میری شادی ہو جائے گی، مگر تمہارا کیا ہوگا؟“

”ایک عدد شوہر، وہ بھی ایسا جو تمہیں کبھی ساتھ نہیں رکھے گا، اس کی موجودگی میں تو تم کہیں کی نہیں رہو گی، نہ تم پیچھے پلٹ سکتی ہو نہ آگے بڑھ سکتی ہو۔“ وہ اس کے لئے از حد پریشان تھی۔

”میں نہ تو پلٹنا چاہتی ہوں اور نہ ہی آگے بڑھنا چاہتی ہوں۔“

”یہاں جیسے گزر رہی ہے گزار لوں گی پھر اپنے ملک اپنوں میں لوٹ جاؤں گی۔“ اس نے عظمیٰ کی پریشانی کم کرنا چاہتی تھی۔

”اچھا تو اپنوں میں لوٹ جانے کے بعد تم کیا کرو گی؟“ وہ استہزائیہ ہنسی تھی۔

”پتا نہیں۔“ اس نے ایکدم ہی اس کی باتوں سے دامن چھڑایا۔

”ہا ہا ہا، یہ مسئلے کا حل نہیں ہے عازہ۔“ اس نے تیکھے چہوٹوں سے اسے گھورا، پھر ذہن میں کچھ خیال آنے پر وہ اس کی طرف کھسک کر تیزی سے بولی۔

”اس کے پاس پیسے کی کمی نہیں ہے، پھر تم خود بھی کمانے لگی ہو، وہ دودو بیویاں رکھ سکتا ہے

ناں تو اسے کہو تمہیں اپنے ساتھ رکھے۔“

”پاگل ہوئی ہو کیا؟“ عازہ نے ایکدم ہی اسے ٹوک دیا۔

”کیوں؟ اس میں حرج کیا ہے؟“ اس نے ابرو اچکا کر اسے دیکھا۔

”اس نے پہلے دن پہلی ملاقات میں مجھے جتا دیا تھا کہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ بہت خوش ہے کسی دوسرے کی اسے فطعی ضرورت نہیں ہے اور

میں نے خود اس کی بیوی کو دیکھا ہے اتنی پیاری

اتنی خوبصورت کے میں تو دیکھتی رہ گئی، مجھ میں ہے ہی کیا جو مجھ پر توجہ دی جائے، نہیں بس میں ان کے درمیان گھس کر تنکوں بننا نہیں چاہتی، میں اکیلی ہی ٹھیک ہوں۔“ خود ترسی کا شکار ہوتی آخر میں ایکدم دو ٹوک بات کہہ کر اس نے بات ختم کرنا چاہی تھی۔

”آج تو تم اکیلی ٹھیک ہو مگر دیکھوں گی کب تک اکیلی ٹھیک ہو تم، حق رکھتے ہوئے بھی استعمال کرنا نہیں چاہتی تم۔“ عظمیٰ کو اس لا حاصل

بحث سے مایوسی ہوئی تھی جب ہی بد مزہ ہو کر جانے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”چائے تو پی لو۔“ عازہ نے اخلاقا اسے روکنا چاہا تھا۔

”تم ہی پوچھ چائے، وہ بھی اکیلی۔“ اس نے چلے دل کے ساتھ منہ بنا کر کہا اور وہاں سے چلی گئی۔

عازہ مسکرا دی، اسے اس کے خلوص بر رتی برابر بھی شک نہیں تھا، مگر وہ کر بھی کیا سکتی تھی،

نجانے اب اسے آدھے سر میں درد کیوں رہنے لگا تھا اس وقت بھی ایکدم درد کی ٹیس تیزی سے ابھرنے لگی تو دونوں ہاتھوں میں سر تھام کر بیٹھ گئی،

اچانک ہی عظمیٰ کی آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی تھی۔

”تم کب تک اس طرح اکیلی رہو گی۔“

اس نے لب بچھ کر اپنے ارد گرد دیکھا، ہر طرف خاموشی کا راج تھا، اس کا دھیان ٹٹنے لگا۔

”یہ عظمیٰ بھی پاگل ہے، پتا نہیں خود بھی کیا کیا سوچتی رہتی ہے اور میرے ذہن میں بھی ڈال گئی۔“ گہرا سانس پھینچتی وہ صوفے سے اٹھ کر بیڈ

پر آ بیٹھی، دراز سے درد کی ٹیبلٹ نکال کر کھائی اور لائٹ آف کر کے سونے کے لئے لیٹ گئی۔

وہ عظمیٰ کی کہی باتوں کو ذہن سے نکالنا

چاہتی تھی مگر ذہن تھا کہ بھٹک بھٹک کر اس طرف بہک رہا تھا۔

”عظمیٰ نے کچھ غلط بھی تو نہیں کہا، احسان میرا شوہر ہے۔“ اس کے دل نے تاریکی میں عظمیٰ کے حق میں فیصلہ دیا تھا۔

دل کی بدلتی کیفیت پر اس نے ایکدم ہی حیران ہو کر پٹ سے آنکھیں کھولی تھی، ہر طرف اندھیرا تھا گھپ اندھیرا، اسے خوف محسوس ہونے لگا۔

”اف عظمیٰ۔“ بے چارگی سے کہتی اس نے اپنے گرد کبل کو مضبوطی سے لپیٹا اور کروٹ بدل کر سونے کی کوشش کرنے لگی۔

☆☆☆

آج وہ بہت خوش تھی پورا مہینہ انتظار کرنے کے بعد اس کے ہاتھوں میں وہ رقم تھی جس کی خاطر وہ یہاں موجود تھی۔

تنخواہ کے لفافے کو ہاتھ میں لئے اس کے تاثرات عجیب سے ہو رہے تھے، بھی دل خوشی سے بھر جاتا تو بھی یکدم افسردگی کی دھند اسے اپنی لپیٹ میں لے لیتی، اس کی خوشی آنسو بن کر اس کی آنکھوں میں چمک رہی تھی، وہ جلد از جلد گھر والوں کو اطلاع دینا چاہتی تھی، انہیں پیسے بھیجنا چاہتی ہے، گھر پہنچنے پر سب سے پہلے اس نے گھر فون کیا تھا، دوسری طرف سے کال سعدیہ نے پک کی تھی۔

”آپی یہ آپ ہیں ناں؟“ اسے اس کا نمبر ازبر تھا مگر پھر بھی احتیاطاً پوچھا تھا۔

”ہاں سعدی یہ میں ہوں عازہ، تم کیسی ہو گھر میں سب کیسے ہیں، اماں کہاں ہیں؟“ اس نے پوچھا۔

”اماں گھر ہیں آپی میں ابھی ان کو فون دیتی ہوں۔“ اس کی پھولتی سانس سے محسوس ہو رہا تھا

وہ تیزی سے چل رہی ہے۔

”تم کہاں ہو؟“ اس نے پوچھا۔
”میں ساتھ والی آنٹی کے گھر آئی تھی قرآن خوانی میں، بس یہ لیس میں آگئی گھر۔“ وہ لمبے لمبے سانس بھر رہی تھی۔

”اوہ تو تم مجھے پہلے بتا دیتی میں بعد میں فون کر لیتی۔“ وہ شرمندہ ہوئی۔

”ارے نہیں آپی ایک تو آپ اتنی دور سے بات کرتی ہیں وہ بھی اتنی مہنگی۔“

”ہائے آپی ہمیں کتنے پیسے جمع رہی ہیں۔“ اس نے اشتیاق سے گھرے انداز میں پوچھا۔

”بس یہ تو سر پرانز ہے۔“ اس کا تنک کرنے کا مکمل ارادہ تھا، جب موبائل اس کے ہاتھ سے فوزیہ نے لے لیا۔

”کب سے خود ہی باتیں کیے جا رہی ہے، مجھے بھی بات کرنے دے۔“ سعدیہ منہ بناتی ان کے پاس ہی بیٹھ گئی جبکہ فوزیہ عازہ سے بات کرنے لگی، عازہ نے ان کو بھی پیسے ملنے کی خوش خبری سنائی جسے سن کر وہ بہت زیادہ خوش ہوئی تھی اور اسے جلد پیسے بھیجنے کی تلقین کی۔

”عازہ یہاں پیسے ختم ہو گئے ہیں، تیرے اماں کی بیماری بھی بڑھنے لگی ہے دوائیاں بھی ختم ہو گئی ہیں تو اس لئے ان کی طبیعت بگڑنے لگی ہے اور معید، سعدیہ، ثمن، صدف کی فیسیں بھی جمع نہیں کروائی۔“ اس سے اس کے حالات کا سرسری سا جان کر انہوں نے اسے ایک نئی پریشانی سے دوچار کیا تھا۔

انہیں لگتا تھا احسان کی صورت وہاں سب ٹھیک ہے، اب انہیں کیا معلوم وہاں کیا ہوا؟ اور نہ ہی کسی انہوں نے اتنا کرید کے جاننا چاہا عازہ خود بھی انہیں بتانا نہیں چاہتی تھی، اس لئے اس بات کو پوشیدہ ہی رہنے دیا۔

”اماں، بس آج کا دن اور انتظار کر لیں میں کل ہی پیسے بھجوائی ہوں، پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ اس نے اپنے ساتھ ساتھ ان کو بھی تسلی سے نوازا تھا۔

کمال سو رہے تھے، باقی سب بچے پڑھنے گئے ہوئے تھے چاہنے کے باوجود بھی وہ ان سے بات نہیں کر پائی، پھر تھوڑی دیر اور بات کرنے کے بعد اس نے ان سے اجازت چاہی۔

ان سے بات کر کے اگر وہ خوش ہوئی تھی تو کمال کی بیماری کا سن کر پریشان بھی ہو گئی تھی، اس نے کل ہر حالت میں پیسے بھیجنے کا پختہ عزم کیا تھا۔

رات سونے سے پہلے اس نے آسیہ کو فون کیا تھا، وقت کے درمیانی فرق کی بدولت پاکستان میں صبح کا وقت تھا، وہ نیند سے جاگی تھی، جبھی اس کی آواز خمار آلودہ تھی۔

”کیسی ہو عاصی۔“ آج کتنے عرصے بعد وہ اس سے مخاطب تھی اس کے انداز میں ایکدم ہی اپنی واحد دوست کے لئے پیارا اُدا آیا تھا۔

”عائزہ..... تم..... یہ تم ہونا؟“ اس کی آنکھیں پوری کی پوری کھلی تھیں اور آواز میں تیزی آئی تھی، عائزہ مسکرا دی۔

”ہاں میں ہی ہوں۔“

”پتا بھی ہے میں نے تمہیں کتنا یاد کیا اور انتظار بھی۔“

”انتظار وہ کیوں؟“

”میں نے واپس آنے کا کب کہا تھا؟“

اس نے حیرت بھرے لہجے میں استفسار کیا۔

”آتے سے تو روکا نہیں اور اب ایسے

انتظار؟“

”تمہارا نہیں، وہ تم نے کہاں تھا مجھے بھی کچھ بھیجو گی؟“ اس نے دھڑلے سے بنا جھکتے

بول دیا۔

”اواچھا۔“ وہ ڈھیلی پڑ گئی۔

اس نے عجیب سے انداز میں پوچھا۔

”رہم تو کوئی بھی معمولی نہیں ہوتی عاصی، پاکستان میں ایک ایک روپے کے لئے محنت کی جاتی ہے تو یہاں ایک ایک ڈالر کے لئے۔“ اس کی آواز بہت دھیمی تھی۔

”چل اب ایسے بھی نہ کہہ، لاکھوں کما رہی ہوں تم۔“ اس نے ہاتھ اٹھ کر جیسے کبھی اڑائی تھی۔

”ہاں آج پہلی تنخواہ ملی ہے مجھے۔“ اس نے اسے بھی اطلاع دی۔

”واہ بھئی موج ہو گئی پھر تو آج تمہاری۔“

اس کا انداز عجیب نریدہ پن لئے ہوئے تھا۔

”نہیں تو بس، میں نے کیا موج کرنی، کل اماں لوگوں کو پیسے بھیجوں گی، ان کا پورا مہینہ مشکل میں گزار ہو گا۔“ اسے ایک بار پھر فکر ستانے لگی۔

”ہاں میں گئی تھی وہاں، کمال انکل کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔“ اس کے منہ سے ایک بار پھر ان کی طبیعت کا سن کر وہ کافی بے چین ہو گئی، ایکدم ہی اس کا دل اچاٹ ہو گیا، جیسی نیند کا بہانہ کر کے اس نے کال منقطع کر دی۔

”لگتا ہے ابا کی طبیعت کچھ زیادہ خراب ہے۔“ بیڈ پر دوڑا نو بیٹھے اس نے اپنے بازو زانو کے گرد لپیٹ رکھے تھے۔

نظریں سامنے دیوار پر لگی تصویر پر جمی تھیں اور دھیان کا چمچھی وہاں دور کہیں انہوں کے گرد پرواز کر رہا تھا، کافی دیر اسی طرح کم سم کیفیت میں بیٹھی سوچتی رہی، جب نیند سے آنکھیں جلنے

لگی تو انہی سوچوں کو ذہن میں لئے آنکھیں بند کیے لیٹ گئی۔

(باقی اگلے ماہ)

پستکس پارکس

نایاب جیادنی

دسویں قسط کا خلاصہ

منگورہ میں ہیام عشیہ کو کسی اجنبی کے ساتھ بے تکلفانہ انداز میں گفتگو کرتے دیکھ کر ٹھنک جاتا ہے، عشیہ کو کسی اجنبی کے ہمراہ دیکھنا، ہیام کے لئے کسی دھچکے سے کم نہیں۔
امام ایک روزہ چھٹی پہ اچانک گھر واپس آ جاتا ہے تو پورے گھر میں خوشی کی لہر دوڑ جاتی ہے لیکن ایک چھوٹی سی بات پر شانزے امام سے بدگمان ہو جاتی ہے۔
جہاندار کانیل بر کے لئے کانشس ہونا اور پری گل کی ہمدردی کرنا سبا خانہ کے مزاج پہ گراں گزرتا ہے، اس بات پہ سبا خانہ اور جہاندار کی تکرار ہو جاتی ہے۔
ہٹو خاندان کے قبرستان میں کھدائی کے دوران اسامہ کو ایک کتبہ ملتا ہے، جس پہ لکھے انتہائی اجنبی نام دیکھ کر حمت دم بخود رہ جاتی ہے۔
نیل بر اپنے دل کی بدلتی کیفیت پہ حیران اور متعجب ہے، اندرونی تبدیلی سے گھبرا کر وہ غیر ارادتا سرکاری بنگلے میں امام فریدے شاہ کی تلاش میں جاتی ہے تو پری گل کا باپ خان نیل بر کو بنگلے پہ دیکھ کر دھنگ رہ جاتا ہے۔
شاہوار عشیہ کے گمان میں عروفہ سے اتفاقاً ٹکرا جاتا ہے، عروفہ اپنا تعارف جب عشیہ کی بہن کہہ کر رواتی ہے تو شاہوار انتہائی شاکد رہ جاتا ہے۔

گیارویں قسط

اب آپ آگے پڑھیے





اس نے گہرا سانس لیا اور بلاٹل جانے پر خدا کا شکر ادا کرتی کچن کی طرف مڑ گئی، کچھ چور نگاہوں سے کچن کی طرف دیکھا تو کچن میں حمت نظر نہیں آئی تھی، نیل بر کچھ مطمئن سی دبے قدموں اندر آ گئی۔

بری جوانی ہی دھن میں پالک اور ساگ کے کترے کو پیلیے میں ڈال کر چولہے پہ چڑھا رہی تھی، نیل بر کو دیکھ کر ایک دم چونک گئی، پھر جلدی سے اپنے میٹھے لہجے میں پوچھا۔
”کچھ چاہیے تھابی بی!“

”ہاں..... نہیں۔“ نیل بر نے گڑبڑا کر جواب دیا تھا، پری اس ہاں اور نہیں میں ہونق بن گئی تھی، اس کی سوالیہ نظروں کو محسوس کر کے نیل بر نے جلدی سے بات بنا کر کہا۔

”تم نے آج اپنے بابا سے ملنے جانا نہیں تھا؟“ اس کا لہجہ حتی المقدور سرسری تھا۔
”جانا تھابی بی! پر ماڑا غریب کی کون سنتا ہے؟ صندیر خان بولتا اکیلے مت جانا اور جہاندار لالا کا کام ختم نہیں ہوتا، ام اپنے بابا سے ملنے جائے تو کیسے جائے۔“ پری کی افسردگی کو محسوس کرتے ہوئے نیل بر نے جھٹ اپنی خدمات پیش کر دی تھیں۔

”میں تم کو لے جاؤں؟ اپنی جیب پہ؟“ نیل بر کی آفر پہ پری ہکا بکارہ گئی تھی۔

”تم لے کر جائے گا؟ پر کیسے؟“ اس نے ہونق پن سے کہا تھا۔

”گدھی، جیب پہ، میں خود ڈرائیو کر لوں گی، تم جہاندار کو چھوڑ دو، ایک کام کر لے تو ہزار دفعہ احسان جاتا ہے۔“ نیل بر کا انداز نخوت سے بھرپور تھا، پری نے فوراً نفی میں سر ہلایا۔

”اوم..... نہیں بی بی، ایسا تو نہیں لالا۔“ جہاندار کی برائی اسے اچھی تو نہیں لگتی تھی، نیل بر کے ماتھے پہ بل آئے۔

”لالا کیسا ہے؟ یہ تم نہیں جانتی، میں جانتی ہوں۔“ نیل بر نے اپنی بات پہ زور دے کر کہا۔

”یہ بہرو پیا ہے، تم دیکھ لینا۔“

”بہرو پیا کیا ہوتا ہے بی بی؟“ پری کی آنکھیں کھل گئیں، گو کہ بہرو پیا کے معنی اس کی سمجھ سے

بالا تر تھے، تاہم اسے اتنی سوجھ بوجھ ضرور تھی کہ سمجھ جاتی، بی بی، لالہ کے لئے اچھے خیالات نہیں رکھتی تھی۔

”جو بھی ہوتا ہے، چھوڑو تم، آؤ میرے ساتھ۔“ اس نے قدرے ناگواری سے بات ختم کی

تھی، اسے جلد از جلد یہاں سے نکلنے کی بے چینی تھی، کیونکہ جہاندار کسی بھی وقت ان کے پروگرام پہ لات مارنے سر پہ سوار ہو جاتا۔

”اور یہ امارا اتنا کام؟“ پری بوکھلا گئی۔

”بھاڑ میں جائے کام، تمہارا بابا انتظار کر رہا ہوگا، چلو تم۔“ نیل بر نے آگے بڑھ کر برز بند

کیا، اس کے ہاتھ سے چاقو کھینچ کر سلیب پہ پھینکا اور اسے بازو سے پکڑ کر باہر لے گئی۔

☆☆☆

آج مطلع بہت شفاف تھا، نیلگوں آسمان کی نیلاہٹیں اپنا عکس چھوڑ رہی تھیں، سورج کی آبد و

تاب بھی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی، لیکن چمک دمک محض چند گھنٹوں پہ محیط تھی، اچانک ہیال کی

طرف سے سیاہ بادلوں کی فوج اُڑ آئی تھی پھر دیکھتے ہی دیکھتے تیز بارش کا سلسلہ شروع ہو گیا، کوہساروں کی قیا بھیگتی رہی اور پھولوں پہ شبنم کا چھڑکاؤ ہو گیا، مغرب سے کچھ پہلے سورج کی پھر سے رونمائی ہوئی تھی، جس کا مطلب یہ سمجھا جاتا تھا کہ کل بھی موسم کے تیور اچھے نہیں ہوں گے۔ بارش نے مناظر فطرت کی دلکشی میں اضافہ کر دیا تھا، دور کہیں بہت دور چونگرہ کی پہاڑی چوٹی پورے استور پہ سایہ فگن تھی۔

وہ اپنے گھر کی بالکونی میں کھڑی آس پاس کے ماحول میں گم نہیں تھی، اس کے خیالات کا پیچھی اڑاڑ کر اسامہ کی طرف لپکتا تھا، وہ کہاں چلا گیا تھا؟ بالکل اچانک، بغیر بتائے۔

پھر وہ سوچتی، وہ کسے بتا کر جاتا؟ عشیہ نے اپنا کوئی رابطہ نمبر اسے نہیں دیا تھا، وہ کس پہ کانٹیکٹ کرتا؟ پھر عشیہ کو مزید گھبراہٹ ہونے لگتی، وہ کم از کم روز گل کو تو بتا کر جاتا، لیکن وہ روز گل کو کیوں بتاتا؟ یہ کوئی بتانے والی بات تھی، کبھی عشیہ کا دل چاہتا تھا وہ ہوٹل روز گل میں جا کر روز گل سے اسامہ کے بارے میں پوچھ لے۔

اس کے گھر خیریت تو تھی؟ جو وہ اچانک چلا گیا، کیا خبر کوئی بیمار ہو، یا پھر؟ کچھ بھی تو ہو سکتا ہے؟ عشیہ کے دل کو پٹنگے لگے تھے، اندر گھبراہٹ نے کنڈلی مار رکھی تھی، کسی بھی کام میں دل نہیں لگتا تھا۔

وہ اندر ہی اندر اسامہ سے ناراض تھی، وہ اسے اطلاع کیے بغیر چلا کیوں گیا تھا؟ اسے بتا کر جاتا، کم از کم کوئی پیغام تو چھوڑتا۔

پھر وہ اسامہ کو خود ہی بے قصور مان جاتی، لیکن دل کو کسی پل قہر نہیں تھا، وہ انہی سوچوں میں گم تھی جب آہٹ پا کر کچھ چوکنا ہو گئی، اس کے پیچھے عروذہ کھڑی تھی، عشیہ نے گہرا سانس خارج کیا، عروذہ کا عشیہ کے پاس آنا کوئی نیک شگون نہیں تھا، جب بھی بات چیت ہوا کرتی تھی عموماً طنزیہ ہی ہوتی، عروذہ اسے جلانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتی تھی، ابھی بھی عشیہ کو خاموش دیکھ کر بظاہر بڑے سرسری انداز میں بولی۔

”آج تم گھر میں نظر آرہی ہو؟ بڑی حیرت کا مقام ہے۔“ عشیہ نے گردن موڑ کر نہیں دیکھا تھا، وہ عروذہ کا طنز محسوس کر سکتی تھی۔

”یہ دن تو تاریخ میں لکھنے والا ہے۔“ اسے خاموش پا کر عروذہ نے پھر سے طنز کا تیرا چھالا تھا، اب کہ عشیہ چاہ کر بھی خاموش نہیں رہ سکتی تھی۔

”جب کام ہو تب ہی گھر سے باہر نکلتی ہوں۔“

”کچھ کام ہمارے لئے بھی رکھ دیا کرو، اسی بہانے ہماری بھی کچھ تفریح ہو جائے گی۔“ عروذہ نے مسکرا مسکرا کر جیسے اندر کی کھولن باہر نکالی تھی، درپردہ وہ اسے جتا رہی تھی، کہ عشیہ کام کے بہانے باہر تفریح کرتی تھی، عشیہ کے لئے عروذہ کی بکواس جلتی پہ تیل ڈالنے کے مترادف تھی۔

”کسی ایک دن میرے جیسی تفریح کر کے دیکھنا، مزہ آ جائے گا۔“ عشیہ نے بمشکل غصہ دبا کر کہا تھا۔

”تم کبھی موقع تو دو۔“ عروذہ نے مسکرا کر ٹکڑا لگایا۔

”آج ہی موقع لے لو، لکڑی کے آرے سے لکڑیاں کٹوا کر لے آنا، آنا بھی چکی سے پسوانا ہے اور لچانوں کی دھنائی بھی کروانی ہے، ڈروے تو عمکیہ ڈال لے گی، باقی کا کام تم کر آنا۔“ عشیہ نے بھی بڑے سکون کے ساتھ اس کا جواب لوٹا دیا تھا۔

”اس کے علاوہ کوئی اور کام نہیں؟“ عروذہ نے دانت پیس لئے تھے۔

”مثلاً؟“ عشیہ کا سکون قابل دید تھا۔

”ہوٹل روز گل کے پھیرے لگانا۔“ عروذہ کا جواب عشیہ کو بھک سے اڑا گیا تھا، اس کا سکون

اندر ہی اندر درہم برہم ہو گیا۔

”میں بلا ضرورت کبھی روز گل کے ہوٹل نہیں گئی۔“ وہ اسے وضاحت دینا نہیں چاہتی تھی مگر

پھر بھی۔

”چلو ضرورتاً تو جاتی ہوتا۔“ عروذہ کی آنکھوں میں تیز لپک بھر گئی تھی۔

”پھر وہاں اس آرکیا لوجسٹ سے ملاقات بھی ہوتی ہوگی؟“ اس کے لہجے میں واضح طنز کی

کاٹ تھی، عشیہ جیسے سرتا پاسلگ گئی۔

”اپنی بکواس بند کرو، تمہیں بولتے ہوئے ذرا شرم نہیں آتی۔“ عشیہ نے تلخی سے کہا تھا، عروذہ

کی بکواس اس کا فشار خون بڑھا گئی تھی، تو کیا عروذہ بھی جان گئی تھی؟

”تمہیں غصہ کس بات پہ آرہا ہے؟ میں نے کچھ غلط تو نہیں کہا۔“ وہ معصوم بن کر بولی تھی۔

”مجھے کیوں غصہ آئے گا، بس تمہاری ذہنیت پہ افسوس ہوتا ہے۔“ عشیہ کا لہجہ تاسف سے بھر

گیا۔

”اور مجھے تمہاری حرکتوں پہ افسوس ہوتا ہے۔“ عروذہ نے نہایت آرام سے عشیہ کو بے آرام

کر دیا تھا، وہ سرتا یا غصے سے کپکپا گئی تھی۔

”کون سی حرکتیں؟“ عشیہ کے ماتھے پہ بل پڑ گئے تھے، عروذہ اس کی خاموشی کا نا جائز فائدہ

اٹھا رہی تھی، اس کا منہ بند کرنا ناگزیر تھا۔

”اب کیا ایک ایک کھول کر بتاؤں۔“ عروذہ نے سابقہ مکاری بھری معصومیت سے کہا تو عشیہ

کا دماغ ٹپ اٹھا۔

”تو بتا دو، جو تمہارے سطحی دماغ کی ایجاد ہے۔“ وہ زہر خند تھی۔

”تمہیں غصہ کس بات پہ آرہا ہے، ابھی تک میں نے کوئی غصہ دلانے والی بات تو نہیں کی۔“

عروذہ اس کے پیچ و تاب کھانے سے لطف اندوز ہو رہی تھی، عشیہ نے خون کے گھونٹ اندر اتارے

تھے، ورنہ دل تو چاہ رہا تھا، رکھ کے عروذہ کے منہ پہ طمانچہ دے مارے۔

”ابھی تک کوئی بات نہیں کی؟“ وہ اندر ہی اندر بل کھا رہی تھی، پھر پلٹنے لگی تو عروذہ نے جلدی

سے اسے روکا۔

”میری بات تو سن کر جاؤ۔“ اس کے پکارنے پہ عشیہ کو لامحالہ رکنا پڑا تھا۔

”ابھی کچھ سنانے کو رہتا ہے؟“ عشیہ کا لہجہ کیسلا تھا، عروذہ کو بڑا ہی مزہ آیا۔

”بہت کچھ۔“ وہ چٹکارہ لے کر بولی تھی، اس نے استفہامیہ نظروں سے اسے دیکھا تھا، جیسے

کہہ رہی تھی کہ جو بکنا ہے بکو۔

عروفہ اس کے تپنے اور تمللانے کو صاف محسوس کر رہی تھی، لیکن وہ عادتاً مجبور تھی، کچھ عشیہ کے ساتھ اس کا رقابت اور اندرونی دشمنی کا رشتہ تھا، بہنوں والی فطری محبت اور دوستی کی تو بات ہی نہیں تھی۔

”وہ ہے نا، شاہوار بٹو، تمہارا پوچھ رہا تھا۔“ عروفہ نے بالآخر اگل ہی دیا، عشیہ جو بے نیازی کھڑی تھی، لمحہ بھر کے لئے اپنی جگہ پہ اچھل گئی، اسے اپنی سماعتوں پہ جیسے یقین نہیں آیا تھا۔

”کون شاہوار بٹو؟“ بہت دیر بعد عشیہ نے سنبھل کر اپنی حیرت اور بے یقینی پہ قابو پایا تھا، اس کے حیران ہونے پہ عروفہ کو طنز کرنے کے بہت سے موقع فراہم ہو گئے تھے۔

”ارے..... تم بھول بھی گئی؟“ وہ کمال چالاکی سے حیران ہونے کی اداکاری کر رہی تھی، عشیہ کا دل چاہا، اس کی ساری اداکاری کو ہوا کر دے، مگر عروفہ کو کچھ کہنے کا مطلب تھا، بھڑوں کے چھتوں میں ہاتھ ڈالنا، کیونکہ وہ مورے کی بہت لاڈلی تھی، جھوٹ سچ کچھ بھی ملا کر انہیں بتاتی، وہ یقین کر لیتی تھیں۔

”مجھے تو کچھ یاد نہیں۔“ عشیہ نے لب بھینچ لئے تھے۔

”میں یاد دلادیتی ہوں۔“ وہ برجستہ جملہ اچک کر بولی تھی۔

”وہی نا، جو تمہیں اپنی عالیشان جیب میں گھر تک چھوڑ گیا تھا۔“ عروفہ کے بتانے پہ عشیہ کی بھنویں تن گئی تھیں۔

”اچھا..... تو وہ تم ہی تھی، جس نے مجھے جیب سے اترتے دیکھا تھا، پھر مورے کو شکایت لگا دی تھی، تمہیں شرم تو نہیں آتی، بہت کمینہ ہو تم۔“ عشیہ کا دل چاہا اس کٹنی کی گردن ہی مروڑ ڈالے۔

”میں نے تو اسامہ کو گھر تک دوایوں کا سا پراٹھا کے لاتے ہوئے بھی دیکھا تھا، ویسے عشیہ تم کمال کے گلے رکھتی ہو، باتوں میں درغلا کر اچھے بھلے بندوں سے کام کروا لیتی ہو۔“ عروفہ کا تعریفی انداز بھی آگ لگا دینے والا تھا، عشیہ تو سرتا پاس لگ اٹھی تھی، اس کی برداشت اپنے اختتام تک پہنچ گئی تھی، وہ غصے میں جیسے پھنکار اٹھی تھی۔

”جس طرح کی تمہاری گھٹیا سوچ ہے نا، ویسی ہی تمہاری گھٹیا باتیں ہیں، میں تمہارے منہ ہی نہیں لگنا چاہتی، تم اس قابل ہی نہیں۔“ عشیہ کا رواں رواں سلگ رہا تھا، عروفہ پہ اس کی سلگن کا الٹا اثر ہوا، وہ خوب لطف اندوز ہو رہی تھی۔

”منہ لگنے کے قابل تم ہو بھی نہیں۔“ عروفہ نے مزہ لیتے ہوئے کہا تھا۔

”بائی داوے، یہ تو بتاتی جاؤ، تم سیریس کس کے ساتھ ہو، اسامہ یا شاہوار؟“ اس کے اگلے الفاظ عشیہ کو ہاتھ اٹھانے پر مجبور کر چکے تھے، اس کا ہاتھ کیا اٹھا، عروفہ کا دایاں گال سلگتا رہ گیا تھا، وہ جیسے شا کڈ رہ گئی تھی، اسے عشیہ سے یہ امید ہی نہیں تھی، عروفہ پہلے تو بے یقین اور ہکا بکا رہ گئی تھی پھر اس کا مارے غصے اور اشتعال کے برا حال ہو گیا تھا، وہ جیسے عشیہ پہ پل پڑی تھی۔

”تمہاری جرات کیسے ہوئی مجھ پہ ہاتھ اٹھانے کی؟“ عروفہ کسی بھری شیرنی کی طرح عشیہ کو گھور رہی تھی، مارے غصے کے کبھی مٹھیاں کھولتی تھی کبھی بند کرتی تھی، اس کا انگ انگ شرارے چھوڑ

رہا تھا۔

”اور تمہاری جرات کیسے ہوئی میرے بارے میں بکواس کرنے کی۔“ عشیہ اب پرسکون تھی اور بڑے آرام سے بازو لیٹے بات کر رہی تھی، جبکہ عروفہ کو خود یہ کنٹرول کرنا محال ہو رہا تھا۔

”میں نے جو کہا، سچ کہا، تم بالکل ایسی ہو، مورے ٹھیک کہتی ہیں، کام کے بہانے یا ہر نکلتی ہو اور غیر مردوں سے مراسم رکھتی ہو، پہلے شاہوار اور پھر اسامیہ تمہارا پوچھتا پھر رہا تھا، تمہیں شرم نہیں آئی۔“ عروفہ نے جب زہرا گلنا شروع کیا تو پھر رکی نہیں تھی، اگلی پچھلی کرسیں نکالنے لگی تھی۔

”جو بکتی ہو، بکتی رہو، میری جوتی کو بھی پرواہ نہیں۔“ عشیہ نے سر جھٹک دیا اور پلٹ کر بالکونی سے اتر آئی تھی، معاود پر آتی عمکیہ اس سے ٹکرا گئی، وہ شاید ان کی اوپچی آوازوں کو سن کر بوکھلائی ہوئی اوپر آرہی تھی، عشیہ کو لال بھبھوکا دیکھ کر سہم گئی، اسے پتا لگ چکا تھا، عروفہ اور اس کی تکرار ہوئی ہے، عشیہ کا موڈ خراب تھا اور عروفہ کا اس سے بھی زیادہ خراب تھا۔

وہ جس انداز میں دھڑ دھڑ کرتی نیچے آئی تھی، پھر اسی تنفر کے ساتھ مورے کے کمرے میں گھس گئی تھی، عمکیہ کو پورا یقین ہو چلا تھا کہ یہ ضرور مورے کو عشیہ کے خلاف بھڑکا دے گی اور مورے بس عروفہ کی بات پہ یقین کر لی تھیں، عشیہ کو پوچھنا یا وضاحت لینا بہت دور کی بات تھی، یہ مورے کی سب سے بڑی کمزوری تھی، جس کا فائدہ سب سے زیادہ عروفہ اٹھاتی تھی، اب مورے کے کان بھرنے کے نتیجے میں جو گھمسان کا رن پڑنے والا تھا، عمکیہ ابھی سے ہی آنے والے حالات پہ شدید بے چین اور بیزار تھی۔

☆☆☆

نیل بر سردار بٹو اپنی ہٹ اور ضد کی پکی تھی۔

جو کہہ دیا سو کہہ دیا، جو کر دیا سو کر دیا، پری کو نیل بر کی ضد پہ حامی بھرنی پڑی تھی، وہ سارے پھیلاؤ کو ویسے ہی چھوڑ کر اپنے بابا سے ملنے کے لئے تیار ہو گئی۔

جب وہ دونوں جیب پہ سوار ہو رہی تھی تبھی سبا خانہ بھی بالکونی میں لٹک کر ان دونوں کو جیب میں بیٹھتا دیکھ رہی تھی جیسے ہی نیل بر نے جیب کو اشارت کیا اسی پل سبا خانہ بھی چیل کی سی تیزی کے ساتھ بالکونی سے اتر کر ڈرائیوے پہ بھاگتی ہوئی ان تک پہنچ گئی۔

نیل بر نے اسے اپنی طرف آتا دیکھ کر گہرا سانس سچ لیا، پری بھی بیزار ہو چلی تھی اور نیل بر کی طرح ہی بے نیاز ہو گئی۔

”بھوری بلی نے رستہ کاٹ لیا ہے۔“ پری بھی دل ہی دل میں تملاتی تھی، جیسے نیل بر تملتا رہی تھی، کیونکہ سبا خانہ کی تفتیش کا آغاز ہو گیا تھا، وہ انہیں باہر نکلتا دیکھ کر رہ نہیں پائی تھی۔

”مجھے بھی صدر بازار تک لے جاؤ، کچھ نئے پرنٹ دیکھنے ہیں۔“ وہ یہی اندازہ لگا سکی تھی کہ نیل بر صدر تک جا رہی ہے، نیل بر نے اس کے غلط اندازے پہ دل ہی دل میں شکر ادا کیا۔

”جانا تو صدر تک ہے، لیکن میں کپڑے کی دوکانوں پہ نہیں جا رہی۔“ نیل بر نے بڑی شائستگی کا مظاہرہ کیا تھا، سبا خانہ سے ٹکڑ لینا آسان تو نہیں تھا، اسے اچھے انداز میں ہی جواب دینا پڑتا تھا۔

”اچھا.....“ سبا خانہ کا منہ اتر گیا۔

”ٹھیک ہے جاؤ تم۔“

”میں تمہیں کل لے جاؤں گی۔“ نیل بر نے اس کا اترامندہ دیکھ کر آفر کی تو سبا خانہ بے ساختہ خوش ہو گئی تھی، نیل بر نے گہرا سانس کھینچ کر جان جلدی چھوٹ جانے یہ خدا کا شکر ادا کیا تھا اور جیب اشارت کر کے زن سے نکل گئی، جبکہ ڈرائیوے پر کھڑی سبا خانہ کی مسکراہٹ اچانک سمٹ گئی تھی، اس کی آنکھوں میں ایک تیز کوندلیک آئی اور ہونٹ سیٹی کے انداز میں سکڑ گئے تھے۔

”ہوں..... تو تم کہاں جا رہی ہو نیل بر؟“ اپنی کپٹی کو ٹھکورتی سبا خانہ بہت پرسوج انداز میں زیر لب بڑبڑا رہی تھی۔

”آخر کہاں؟“ اس کا انداز ہنوز وہی تھا، پرسوج اور سنجیدہ، چہرے پہ شدید تجسس کی پرچھائیاں تھیں۔

”پری کے ساتھ تم آخر کہاں جا سکتی ہو؟“ وہ اپنی سوچ کے گھوڑوں کو سرپٹ دوڑا رہی تھی، بالآخر ایک واضح اور ٹھوس نکتے پر سبا خانہ کی سوچ ایک دم فریز ہو گئی تھی۔

”یعنی سرکاری بنگلے پہ؟ پری کو اس کے باپ سے ملوانے؟ جبکہ صندیر خان نے منع بھی کیا تھا پری سرکاری بنگلے پہ نہیں جائے گی، کیونکہ وہاں سرکار کا کوئی اکھڑ آفیسران دنوں تعینات تھا، تو یوں ہوا کہ آج نیل بر، پری کو وہاں لے گئی، صندیر خان کے منع کرنے کے باوجود، یعنی اس کے حکم کو کسی خاطر میں نہ لاتے ہوئے، ہوں تو نیل بر اب صندیر خان سے بھی ٹکر لے گی؟ تو بات یہاں تک آ پہنچی، لیکن سوچنے کا معاملہ تو یہ ہے، نیل بر اٹنی خداترس کہاں سے ہو گئی؟ آج سے پہلے تو پری پہ ایسا رحم کبھی نہیں آیا؟ تو آج کچھ نئی بات تھی کیا؟“ وہ سوچتی رہی الجھتی رہی اور پھر ایک ٹھوس نکتے پہ منجمد ہو گئی۔

”ارے..... یہ تو سوچا ہی نہیں، سرکار کے بنگلے پہ ایک آفسر بھی تو موجود ہے؟ اور کہیں پری کے بہانے پہ نیل بر اس آفسر سے تو نہیں ملنے لگی؟ اومارا، میں نے یہ پہلے کیوں نہیں سوچا، سو فیصد یہی معاملہ ہوگا، یہی بات ہوگی، ایسا ہی ہوگا، ہر صورت ایسا ہی ہوگا، ورنہ نیل بر اور ایسی مہربانیاں کرے؟ قطعاً نہیں، ہرگز نہیں، کسی صورت نہیں۔“ سبا خانہ کا شاطر دماغ بہت دور کی کوڑی اٹھا لایا تھا، وہ اپنی سوچ کے ٹھیک طور پر سچ ہونے پہ پہلے سے ہی پر یقین تھا اور اب اسے کیا کرنا چاہیے تھا؟ بی جاناں کو بتانا چاہیے تھا؟ ان کی لاڈلی پوتی کے کرتوت؟ یا اپنے ماموں کو؟ یا پھر صندیر خان کو؟ وہ ہر بندے کو سوچ کے دائرے میں لاتے ہوئے خود بخود رتبہ ٹھیک کرتی گئی تھی۔

اسے جہاندار کو بتانا تھا، بالکل جہاندار کو، اس سوچ کے آتے ہی سبا خانہ کے وجود میں پھریری اتر گئی تھی، اس نے لمحے کے ہزارویں حصے میں اپنی سوچ پہ عمل کرنے کی ٹھان لی تھی، دوسرے ہی بل وہ تیز قدموں سے چلتی ہوئی اس حصے کی طرف بڑھنے لگی جہاں پہ جہاندار کی پریشانی رہائش گاہ تھی، بنو محل سے کچھ الگ تھلگ، بارہ دری کے اس پار، پھولوں کی دیوار سے کچھ آگے۔

سبا خانہ کے وجود میں سنسنی خیز لہریں اتر رہی تھیں، وہ قریب قریب بھاگتی ہوئی جہاندار کے رہائشی حصے تک پہنچ گئی، سوئے اتفاق جہاندار برآمدے میں اپنی اسٹین گن کو صاف کرنا نظر آ گیا تھا،

جیسے ہی اس کی سہا خانہ پہ نظر پڑی، وہ اپنی جگہ سے اچھل کر کھڑا ہو گیا۔
 ”تم..... یہاں؟“ مارے حیرت اور بے یقینی کے جہاندار غصہ کرنا بھی بھول گیا تھا اور
 سہا خانہ جیسے اس کے غصہ نہ کرنے پہ نہال ہو گئی تھی۔
 ”کیوں میں یہاں نہیں آ سکتی؟“ سہا خانہ نے اتر کر پوچھا تھا، جہاندار نے نفی میں سر ہلایا
 اور اپنی بے یقینی پر قابو پاتے ہوئے لب بھینچ کر بولا۔
 ”ہرگز نہیں۔“

”کیوں؟“ سہا خانہ کی اترا ہٹ کچھ کم ہوئی تھی، اس کا منہ بھی اتر گیا، ایک تو جہاندار کو مرونا
 بھی دل رکھنا نہیں آتا تھا، ایسے منہ پھاڑ کر جواب دے دیتا تھا، چاہے کسی کا دل ٹوٹ کر چکنا چور ہی
 کیوں نہ ہو جاتا۔

”کبھی تو دل رکھ لیا کرو۔“ سہا خانہ نے شکوہ کیا، لہجے میں آرزوگی بھر گئی تھی، جہاندار کے
 ماتھے پہ بل آئے۔

”میں نے دل رکھنے کے لئے کرائے پہ مکان نہیں لے رکھا، اپنے دل کو پاس ہی رکھو اور
 جلدی سے یہاں، اس جگہ اور اس احاطے سے دور نظر آؤ۔“ اس کا لہجہ دو ٹوک قسم کا تھا، سخت اور
 انتہائی کھردرا، سہا خانہ کا دل بھر آیا، مجال تھی جو کبھی نرمی سے بات کر لیتا، ہر وقت سات پتھر اٹھائے
 رکھتا تھا۔

”جاتی ہوں، میری بات تو سن لو۔“ سہا خانہ بھی مزید بے عزتی کر دانے سے باز آتی جلدی
 جلدی مطلب کی بات پہ آگئی تھی، جہاندار نے کوئی دلچسپی نہ لیتے ہوئے کہا۔
 ”وہاں آتا ہوں تو سن لوں گا تمہاری بات۔“ وہ شدید بیزار تھا، سہا خانہ کے دل کو دھکا سا لگا،
 دو منٹ بھی اسے برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

”ابھی سن لو، تمہارے مطلب کی بات ہے۔“ سہا خانہ پہ بھی ضد آگئی تھی، ایسے تو ایسے ہی
 سہی، وہ بات سنا کر ہی جائے گی، چاہے کچھ بھی ہو جائے۔

جہاندار صاف صاف انداز میں سخت زچ ہوا تھا، اس کے چہرے پہ بیزاری بھی پھیلی تھی، موڈ
 بھی آف ہوا، پھر کچھ سوچ کر اس نے سہا خانہ سے کہا۔

”ایک منٹ ہے تمہارے پاس، جلدی بولو۔“ وہ گھڑی پہ نگاہ جما کر کھڑا تھا، سہا خانہ کو اس کی
 عجلت پہ غصہ تو بڑا آیا تھا مگر پی گئی تھی۔

”کچھ نیل بر کا پتہ ہے، اس کے پاڈی گاڑ تو بنے پھرتے ہو۔“ سہا خانہ کو اپنے ہی انداز
 میں جہ کے لگانے کی عادت تھی، اس کی توقع کے عین مطابق وہ چونک گیا تھا۔

”ابھی تو گھر میں موجود تھی۔“ جہاندار کا انداز پر سوچ ہو گیا، اس کے چہرے پہ اضطراب بھی
 لہرایا تھا۔

”کچھ دیر پہلے نا، اب تو وہ چلی گئی۔“ سہا خانہ کو اسے مضطرب دیکھ کر بڑا مزہ آیا تھا۔
 ”کہاں گئی؟“ اس نے لمحوں میں اسٹین گن سنبھالی، چابیاں اٹھا میں اور عجلت میں بولا۔

”یہ تو تمہیں پتا ہونا چاہیے۔“ سہا خانہ اور بھی زیادہ لطف اندوز ہو رہی تھی، اس کی فطرت تھی

دوسروں کی پریشانی سے لطف اٹھاتا۔

”تو میں پتالگوں گا۔“ وہ آگے بڑھ رہا تھا، سبا خانہ اسے جانا دیکھ کر لپکتی ہوئی پیچھے آگئی۔
”اور اگر میں بتا دوں تو؟“ اچانک سبا خانہ کا اس کے سامنے آ جانا جہاندار کو رکھنے پہ مجبور کر گیا تھا، وہ بادل نخواستہ رک گیا تھا، لیکن اس کے چہرے پہ شدید جھنجھلاہٹ اور غصہ تھا، نیل بر کے بغیر بتائے جانے کا غصہ تھا یا سبا خانہ کے زچ کرنے پہ؟ وہ سمجھ نہیں پاسکی تھی، تاہم جہاندار کے رکھنے پہ خوش ضرور ہوئی تھی۔

”بولو۔“ وہ زبان سے نہیں آنکھوں سے استفسار کر رہا تھا، سبا خانہ کچھ دیر تک چپ کھڑی رہی، پھر بڑے دلکش انداز میں بتانے لگی۔

”وہ پری کو لے کر گئی ہے۔“ اسے قسطوں میں بتا کر وہ اور بھی لطف اندوز ہو رہی تھی، جہاندار کو تپانے کا بھی اپنا ہی مزہ تھا۔

”کہاں؟“ جہاندار نے تلملا کر پوچھا، وہ جانتا تھا، سبا خانہ کو پتا ہے اور جان بوجھ کر اسے زچ کر رہی ہے۔

”دم تو لو بتاتی ہوں۔“ سبا خانہ نے مسکرا کر کہا تھا، جہاندار کے ضبط کی انتہا ہو گئی تھی۔

”بولتی ہو یا میں چلا جاؤں؟“ جہاندار کی دھمکی بڑی کارگر تھی، سبا خانہ فوراً پٹری پہ آگئی۔

”وہ پری کو لے کر اس کے بابا خان سے ملوانے گئی ہے۔“ سبا خانہ نے بالآخر راز اگل دیا تھا، جہاندار کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔

”لیکن خان تو نہیں ہے، وہ تو اپنے سر کی عیادت کے لئے گیا ہے۔“ جہاندار کے بتانے پر سبا خانہ کے یقین پہ اور ہی مہر لگ گئی تھی۔

”ہوں تو گویا میرا اندازہ ٹھیک تھا۔“ سبا خانہ اپنے اندازے کی سچائی پہ کھل اٹھی تھی، اس کا چہرہ بھی روشن ہو گیا تھا، جہاندار اسے ابھی نظروں سے دیکھتا رہا۔

”کون سا انداز؟“ جہاندار کے پوچھنے پر وہ بے ساختہ چونک گئی تھی۔

”یہی کہ پری کو لے کر وہ کسی اور کام کا ارادہ کر کے گئی ہے۔“ اس کی ابھی بات نے جہاندار کو بھی الجھا دیا تھا، لیکن وہ بلا کا زیرک تھا، اس کی ہر بات کو سمجھ رہا تھا، پھر بھی تصدیق کے لئے پوچھنا ضروری تھا۔

”کون سا کام؟“

”کیا تم یقین کر دے گے؟“ سبا خانہ کے پوچھنے پر وہ زچ ہوا اٹھا تھا۔

”ہاں۔“ وہ جان چھڑوانے والے انداز میں بولا۔

”کیا واقعی؟“ سبا خانہ ایک مرتبہ پھر کھل اٹھی تھی۔

”میں جاؤں کیا؟“ جہاندار نے صرف دھمکی نہیں دی تھی، وہ تیز قدموں سے چل بھی پڑا تھا، سبا خانہ اسے جانا دیکھتی رہی تھی، اس دفعہ وہ سامنے بھاگ کر نہیں آئی تھی، بلکہ اونچی آواز میں اسے رکھنے پر مجبور کر دیا تھا۔

”وہ جنگلے کے آفسر سے ملنے گئی ہے، مجھ سے لکھوا لو۔“ سبا خانہ کے الفاظ جہاندار کا دماغ

بھک سے اڑا گئے تھے، وہ نہ صرف رکا تھا بلکہ ایک بھٹکے کے ساتھ پلٹ بھی آیا۔

☆☆☆

جیب پتھر لیے رستوں پہ دوڑ رہی تھی۔

اور ایک طرف شفاف پانی کی ندی بہہ رہی تھی، یہ ندی عام دیسی مچھلی کی بہتاات سے دور دور تک مشہور تھی، اپنے ذوق کی تسفی کے لئے آنے والوں کا ایک ہجوم ندی کے کنارے دکھائی دیتا تھا، دیگرندیوں کے برعکس اس کے قرب و جوار میں آبادی خال خال ہی نظر آتی تھی، اس کے باوجود دور دراز سے آئے لوگوں کا ایک ہجوم بکراں دکھائی دیتا تھا۔

وہ بڑی مشتاقی سے ڈرائیونگ کر رہی تھی اور پری اس کے پیچھے بیٹھی آنکھیں میچے بلند آواز میں کلمہ طیبہ کا ورد کر رہی تھی، ہر چھوٹی کھائی اور گڑھے میں گھس کر جیب کا ہچکولے کھانا پری کو مسلسل خوفزدہ کر رہا تھا، لیکن وہ نیل برہے اپنا خوف ظاہر کرنا نہیں چاہتی تھی، نیل برگا ہے بگا ہے بیک مرر میں اس نے نظر ڈالتی اور مسکرا کر پوچھتی۔

”تمہیں تو ڈر نہیں لگ رہا؟“

”نہیں بی بی! ام کو ڈر نہیں لگ رہا۔“ پری نے تیسری مرتبہ کپکپاتی آواز پہ قابو پا کر بتایا تھا، اپنے الفاظ کے برعکس وہ شکل سے بہت گھبرائی لگ رہی تھی۔

”لگنا بھی نہیں چاہیے، تم ام کے ساتھ ہے۔“ نیل بر نے اس کے لہجے کی نقل اتاری تھی، پری نے اپنا ورد روکنے کی کوشش نہیں کی تھی، وہ مسلسل بے آواز ورد کرتی رہی۔

”اللہ جی! ام کو ابھی جینا ہے، ام کو مرنا نہیں۔“ وہ زیر لب بڑبڑا رہی تھی جب نیل بر نے ذرا گردن گھما کر اسے دیکھا۔

”تم کیا بولتا ہے پری گل۔“ اس کے لبوں پہ شرارتی مسکراہٹ تھی، پری گل ذرا گھبرا گئی، فوراً نفی میں سر ہلایا تھا۔

”کچھ نہیں، ام کیا بھولے گا؟ بس یہی سوچتا ہے کہ تم گاڑی بہت اچھا چلاتا ہے۔“ اس نے بمشکل ہی اڑاتا ہے کہنے سے خود کو روکا تھا۔

”اچھا۔“ نیل بر نے ساختہ خوش ہو گئی تھی، پھر اس نے ایکسلیٹر پہ پاؤں رکھا اور اسپید کچھ اور بڑھادی تھی، یوں کہ پری گل کی رنگت ہلدی کی مانند زرد ہو گئی، اس کے حواس جاتے رہے تھے۔

”تم کو پتا نہیں پری گل، میں وہاں یورپ میں کیسے گاڑی اڑاتی تھی، میرے جیسی ڈرائیونگ تو کوئی بھی کر نہیں سکتا۔“ نیل بر نے مصنوعی کالرا کڑائے تو پری گل نے گھگھائی آواز میں کہا۔

”بی بی! تم اب بھی کم گاڑی نہیں اڑا رہا، ام کو اپنی جان کے لالے پڑ رہے ہیں۔“

”کون سے لالے؟ صندریا خاناں اور شاہوار؟“ نیل بر کو ٹھیک سے سمجھ نہیں آتی تھی۔

”کچھ نہیں جی، تم سامنے دیکھو، گنے گار پہاڑی کا پل آ رہا ہے۔“ پری نے اس کی توجہ سامنے مبذول کروائی تو نیل بر بھی چونک گئی تھی۔

”اس گنے گار پہاڑی کے پیچھے قبرستان ہے نا؟“ نیل بر کا انداز سوچتا ہوا تھا، پری نے فوراً اثبات میں سر ہلایا۔

”ہاں جی، حمت بی بی کے اجداد کا۔“ پری کے پاس اس حوالے سے کافی معلومات تھیں، نیل
بر سمجھ کر ہنکارا بھرا تھا اور اچانک اسے خیال آیا۔
”ویسے ایک بات کی سمجھ نہیں آتی۔“ نیل بر نے ایک مشکل موڑ کاٹ کر پری کی طرف دیکھا
تو وہ دہلتے ہوئے بمشکل بول پائی تھی۔

”کس بات کی؟“ اس دفعہ پری نے محض سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا تھا۔
”یہی کہ حمت کی ماں کو بابا نے اپنے قبرستان میں دفن کیوں نہیں ہونے دیا؟ وہ اس کے
ننھیالی قبرستان میں کیوں دفن ہیں؟“ نیل بر کے اتنے گہرے سوال پر کچھ پل کے لئے پری اپنا
سارا خوف بھول بھال گئی تھی۔

یہ سوال حمت نے بھی کتنی مرتبہ کیا تھا، تب بھی پری پہلے حیران ہوتی تھی پھر چونک جاتی، پھر
ایک دن پری نے اپنے نانا سے پوچھ ہی لیا تھا تب نانا نے اسے جو بات بتائی تھی وہ آج تک پری
کے دل میں دفن تھی، نانا نے اسے سختی کے ساتھ منع کیا تھا کہ اس بات کا ذکر کسی سے نہیں کرنا اور
پری اتنی نا سمجھ نہیں تھی جو اس بات کو سمجھتی ہی نہ تھی۔

”پری گل! تم بتا سکتی ہو کیا؟“ نیل بر نے اچانک اسے مخاطب کیا تو وہ بے ساختہ چونک کر
گھبرا گئی تھی۔

”ام کو کیا پتا بی بی! ام تو تب پالنے میں بھی نہیں ہو گا۔“ پری نے اپنے کپکپاتے لہجے پہ بمشکل
قابو پایا۔

”میں حمت سے پوچھوں گی۔“ پری کا جواب سن کر نیل بر نے اپنا ارادہ ظاہر کیا تھا، پری
بر جستہ ہی بول پڑی تھی۔

”حمت بی بی کو تو خود بھی نہیں پتا۔“

”تو پھر کس کو پتا ہے؟“ نیل بر نے اسے گھور کر پوچھا تھا، پری فوراً ہکلائی تھی۔

”ام کو کیا پتا۔“ وہ صاف انجان بن گئی تھی۔

”کیا بی جانوں کو خبر ہو گی؟ یا بابا کو۔“ نیل بر کا انداز خود کلامی سا تھا۔

”میں ان سے پوچھوں گی۔“ اس نے جیسے ارادہ باندھ لیا تھا، پری کھڑکی سے باہر ایسے
جھانکنے لگی تھی جیسے اس کام سے بہتر کوئی اور کام نہ ہو، پھر اس نے اچانک نیل بر کو احساس دلایا۔
”وہ سامنے سرکار کا بنگلہ۔“ پری کے چیخ کر بتانے پہ نیل بر بھی سوچوں کے اثر دھام سے باہر
نکل آئی تھی۔

پھر جیپ ایک ہی جھٹکے کے ساتھ بنگلے کی حدود میں داخل ہو کر رک گئی تھی، خان اپنے کیبن
سے آواز سن کر افتاں خیزاں باہر نکل آیا تھا، سامنے خانزادوں کی جیپ دیکھ کر اس کی جان نکل گئی
تھی، خانزادوں کی جیپ کا سرکاری بنگلے میں کیا کام تھا؟

وہ گھبراتا ہوا قریب آیا تو جیپ کے دروازے کھول کر نیل بر اور پری باہر نکلتی دکھائی دی تھیں،
خان پری کو دیکھ کر اتنا خوش نہیں ہوا تھا جس قدر نیل بر کو دیکھ کر متحیر رہ گیا۔

”ایک مرتبہ پھر؟“ اس کا ذہن پیچھے کی طرف پھیرا لگا بمشکل حال میں پلٹا تھا، نیل بر کیوں

بار بار یہاں آرہی تھی؟ خیریت تو تھی نا؟

خان گھبراتا، گھبراتا ان کے قریب پہنچا تو پری بے ساختہ اپنے باپ سے لپٹ گئی تھی، خان بیٹی سے مل کر خاندانی کی طرف متوجہ ہوا۔

”بی بی!..... تم یہاں؟“ خان خاصا بوکھلایا ہوا نظر آ رہا تھا، نیل برادر گرد کے ماحول پہ بے نیازی کے ساتھ نگاہ ڈالتی خان کی طرف متوجہ ہوئی، پھر اس نے پری کی طرف اشارہ کیا۔

”اس کو ملوانے لائی ہوں، بہت اداس ہو رہی تھی۔“ اس کا انداز لا پرواہ سا تھا، وہ مسلسل ارد گرد کے ماحول کو جانچ رہی تھی، اس کی نظروں کا نوکس بنگلے کار ہاشی حصہ تھا، اس کی آنکھوں میں کسی کی تلاش صاف نظر آ رہی تھی، اس کے چہرے پہ ہلکا ہلکا نامعلوم اضطراب بھی نظر آتا تھا، پری بھی بار بار نیل بر کی بے قراری کو ملاحظہ کر رہی تھی، کچھ دیر تک تینوں کے درمیان خاموشی چھائی رہی، جسے خان کی آواز نے توڑا تھا۔

”بی بی! ام تمہاری کیا خدمت کرے؟ آپ اندر بیٹھک میں چلو۔“ خان بوکھلاہٹ میں بمشکل بول سکا تھا، نیل بر کچھ دیر تک سوچتی رہی، پھر اس نے کندھے اچکا دیئے تھے، یعنی اس نے بیٹھنے کا ارادہ ظاہر کر دیا تھا۔

”امارا صاحب تو ابھی نہیں آیا۔“ خان نے ایسے ہی برائے بات کہی تھی، نیل بر ایک پوری جان سے چونک گئی تھی، اس کے خان کی تقلید میں بڑھتے قدم ایک دم رک گئے تھے، اسے لمحہ بھر کے لئے یہ لگا تھا جیسے ساری تپسیا بیکار چلی گئی ہے، اس کی امیدوں پہ اوس گر گئی تھی، دل کی کلیاں یکے بعد دیگرے مرجھاتی چلی گئی تھیں۔

”کیوں؟“ نیل بر کہتے کہتے رک گئی تھی، اس کا چہرہ ایک دم بجھ گیا، پری نے بہت چونک کر نیل بر کے تاثرات دیکھے تھے، اس کا جوش و خروش ماند پڑتا نظر آ رہا تھا، پھر وہ لمحہ بھر بھی رکے بغیر بمشکل خود یہ بشارت طاری کرتے ہوئے بولی۔

”پری مکمل! تمہیں شام کو ڈرائیور لے آئے گا، میں اب چلتی ہوں۔“ اس نے دو لفظوں میں بات مکمل کی اور بے مرادی تیز تیز قدموں کے ساتھ اپنی جیب کی طرف چلتی چلی گئی تھی جبکہ پری ہکا بکا سی اسے دیکھ رہی تھی، نیل بر کا رویہ اس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔

☆☆☆

پھر پھپھو فرح کے جانے کا دن بھی قریب آ گیا اور فرح پھپھو اکیلی نہیں جا رہی تھیں بلکہ اس دفعہ ولید بھی ان کے ساتھ جا رہا تھا اور نشرہ کا دل تب سے ہی ایک دبیز اداسی کی لپیٹ میں تھا، جی چاہتا تھا منہ سر لپیٹ کر کسی تنہا گوشے میں پڑ کر لمبی تان کے سو جائے، کبھی نہ اٹھنے کے لئے۔

اسے خبر تھی، فرح پھپھو اور ولید کے جاتے ہی اس کا کیا حشر ہونے والا تھا، وہ جو ایک نامعلوم ڈھال تھی یوں لگتا تھا ٹوٹنے کے قریب تھی، ولید کے جاتے ہی بے سرد سامانی کا احساس ہو جاتا، یوں لگتا، وہ اتنے اجنبیوں کے ہجوم میں بالکل اکیلی رہ گئی ہے۔

اس وقت بھی وہ طوطوں کو باجرہ ڈالتی گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹ کر افسردہ سی بیٹھی سوچ رہی تھی جب اچانک کوئی دبے قدموں سے چلتا ہوا اس کے قریب آ گیا تھا، نشرہ اپنی سوچوں میں اس قدر

گم تھی کہ چونک بھی نہیں سکی، آنے والے کو خود ہی گلا کھٹکھار کر احساس دلانا پڑا۔
 ”سوچوں کے کس جزیرے میں ڈبکیاں لگا رہی ہو؟ ارد گرد کا کچھ ہوش نہیں۔“ وہ اس کے قریب بیٹھتے ہوئے نرمی سے بولا تو نشرہ ایک دم چونک کر اچھل پڑی تھی، پھر اس پہ نظر پڑی تو جیسے جان میں جان آئی۔
 ”اسامہ بھائی! آپ نے ڈرا دیا مجھے۔“ اس نے بمشکل اپنے ہکلائے لہجے پہ قابو پا کر کہا تھا۔

”اب تو ڈرنا چھوڑ دو نشرہ! یہاں ڈرنے والوں کا گزارہ نہیں۔“ اسامہ نے گہرا سانس کھینچ کر جتلیا تو نشرہ کا چہرہ اتر گیا۔

”آپ ٹھیک کہتے ہیں، مگر ہر کوئی آپ کی طرح بہادر تو نہیں ہے۔“
 ”بہادر بننا پڑتا ہے نشرہ ڈیر! ورنہ تو لوگ ہمیں ڈرا ڈرا کر مار دیں۔“ اسامہ کا انداز نا صحانہ تھا، وہ باجرے کی کٹوری سے منٹھی بھر باجرہ ہتھیلی میں لے کر پھونک سے اڑانے کا شغل کر رہا تھا۔
 ”تو ایسے کوئی اسم مجھے بھی سیکھا دیں۔“ نشرہ یا سیت سے بولی۔

”خود کو اسٹرنگ کر دو نشرہ! اب تو تمہارے ساتھ ایک مضبوط حوالہ بھی ہے۔“ اسامہ اسے نئے رشتے کا احساس دلارہا تھا، ولید اور نشرہ کا تعلق، ایک نیا اور مضبوط رشتہ۔

”پتا نہیں کیوں؟ میرا دل بہت ڈرتا ہے اسامہ بھائی، جیسے کوئی خوشی مجھے راس نہیں آئے گی۔“ وہ اپنے اندر پینتے خدشات اور وہموں کو اسامہ سے چھپا نہیں پائی تھی، ایک اسامہ ہی تو تھا جس سے نشرہ اپنے دل کا حال کہہ کر بوجھ سے خود کو آزاد کر لیتی تھی، یہ اور بات تھی کہ اسامہ مہینوں بعد اس عقوبت خانے میں آتا تھا اور یہ بہت ہی اچھا تھا، یہاں پہ کون سا اس کے بہت منتظر محبت کرنے والے لوگ آنکھیں بچھا کر بیٹھے تھے۔

پھر وہ بہت دیر تک باتیں کرتے رہے، اسامہ اسے چھوٹی چھوٹی باتیں سمجھا رہا تھا، زندگی کے اتار چڑھاؤ نشیب و فراز، وہ پہلے بھی اسے سمجھایا کرتا تھا، امید دلانا تھا، دلاسہ دیتا تھا، اسامہ جب بھی اس گھر میں لوٹ کر آتا کلم از کم نشرہ کو امید کا کوئی نہ کوئی سرا تھا جاتا تھا، اس کی باتوں میں زندگی دھڑکتی تھی اس کی باتوں سے زندگی پھلتی تھی۔

☆☆☆

گاڑی ڈسٹرکٹ دیامر کی حدود میں داخل ہو گئی تھی۔

اور راستہ انتہائی پر پیچ تھا، جس کے دونوں جانب پتھروں سے تین تین فٹ اونچی دیوار چنی گئی تھی، گاڑی کے برابر ایک ٹھنڈے پانی کی ندی رواں تھی، بلکہ یوں کہنا مناسب تھا، پتھروں کے پیچ میں پانی رواں دواں تھا، پتا نہیں آب رواں نے از خود یہاں گزر گاہ بنالی تھی یا لوگوں نے گزر گاہ آب کو اپنا رستہ بنالیا تھا، دو کلو میٹر رستہ انتہائی صبر آزما تھا، پانی میں پڑے بے ترتیب پتھروں پہ ہچکولے کھاتی گاڑی رینگ رینگ کر آگے بڑھ رہی تھی۔

اس سے آگے بھی رستہ ہموار نہیں تھا، تاہم ڈرائیور خاصی مہارت سے گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا، اناج پر پیچ رستے کی تمام تر ہولناکی سے بے نیاز عجیب و غریب سوچوں میں الجھ رہا تھا، آج جب

سے سفر کے دوران وہ گھر سے نکلا تھا، مسلسل اپنے گھر والوں کو یاد کر رہا تھا، خاص طور پر شانزے کو، اس کے رویے کو، اس کی اکھڑی ہوئی باتوں کو۔

اسے شانزے کے بدلتے رویے کا محرک سمجھ نہیں آ رہا تھا، وہ اس سے اتنی بد دل کیوں تھی، بیزار کیوں تھی، گو کہ شانزے کے بدلتے رویے نے اسے کوئی خاص دکھ نہیں دیا تھا تاہم پھر بھی وہ اپنی سوچوں کو روک نہیں پا رہا تھا۔

پھر یہاں آنے کے بعد امام خود بھی یا تو ان بر فیلے پہاڑوں کی طرح ہر احساس سے بے نیاز ہو کر سرد ہو گیا تھا یا پھر کام کے لوڈ نے اسے ہر ایک چیز سے بے نیاز کر دیا تھا، یوں کہ شانزے کی بے نیازی بھی اسے تکلیف نہیں دے رہی تھی، یا پھر ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی تھی ان دونوں کے درمیان موجود بچپن کا وہ تعلق جو ایک بے نام خیال کی طرح تھا، آہستہ آہستہ ختم ہوتا جا رہا تھا، اپنی حیثیت کھوتا جا رہا تھا۔

رات کو امام شانزے سے کھانے پہ نہ آنے کی معذرت کرنے گیا تھا، لیکن اسے وہاں جا کر خاصا دھچکا لگا، مامی نے اسے بتایا شانزے خاصی مصروف ہے، کالج کی کچھ فائلوں پہ کام کر رہی ہے، پھر اسے لیکچر تیار کرنا ہے، وہ یہاں نہیں آ سکتی، مطلب نیچے آ کر امام کی بات نہیں سن سکتی، امام کے لئے یہ بات انتہائی شاکد کر دینے والی تھی، یعنی شانزے ایک لمحے کے لئے بھی نیچے آنے کا وقت نہیں نکال سکتی تھی، وہ جتنا حیران ہوتا کم تھا۔

لیکن اب یہاں آنے کے بعد یہ حیرانگی بھی آہستہ آہستہ کم ہو رہی تھی اور کچھ ہی دیر بعد وہ اسلام آباد کی ہر چیز کو بھول کر موجودہ ماحول میں رچ بس گیا تھا، ارد گرد خطرناک مناظر کو دیکھتا وہ اچانک سردار بٹو کی فیملی کے بارے میں سوچنے لگا تھا۔

اسے اندازہ تھا جو تحریری منظور شدہ اجازت نامہ وہ ہیڈ آفس سے لے کر آیا تھا، اس کے بعد جیسے ہی اس نے سرویئر والے علاقے پہ تعمیراتی کام کا شیڈول پاس کروانا تھا، سردار بٹو کی طرف سے شدید رد عمل کی اسے ابھی سے ہی توقع تھی۔

وہ اسے کسی بھی حد تک جا کر نارچہ کر سکتے تھے، امام ہر قسم کی توقع رکھتا تھا اور خود کو ہر طرح کے حالات سے نمٹنے کے لئے تیار کر چکا تھا، اسے بے خوف و خطر اپنا کام شروع کروانا تھا اور اس کے ارادے بہت مضبوط اور پختہ تھے۔

ابھی وہ موجودہ آفیسر کو فون کال کے ذریعے اپنے آنے کی اطلاع دینا ہی چاہتا تھا جب اچانک گاڑی کا ایک ٹائر کسی گڑھے میں پھنس گیا، گاڑی کو زوردار جھٹکا لگا تھا اور امام کی سوچوں کو بھی بریک لگ گئے تھے، ویسے تو اب تک کا سفر بغیر کسی دشواری کے طے پا رہا تھا، لیکن اس گڑھے سے نکلنے کے بعد اچانک دور سے خوشنما نظر آنے والے گلشیر نے بڑی مصیبت کھڑی کر دی تھی، گو کہ گلشیر کو کاٹ کر گاڑیوں کے گزرنے کا رستہ بنا دیا گیا تھا مگر برف پکھلنے سے اس قدر پھسلن ہو چکی تھی کہ بظاہر وہاں سے گزرنا انتہائی مشکل نظر آتا تھا، اگر اس تنگ رستے پر جیپ کاریں ٹرک ذرا سا بھی ڈھلوان کی طرف پھسل جاتے تو کسی کے بچ نکلنے کی امید نہیں تھی۔

گو کہ ڈرائیور بہت مشتاقی سے ڈرائیو کر رہا تھا، لیکن قدرت کی طرف سے ہونی کو کون ٹال

سکتا تھا، اچانک گاڑی کے پیسے برف پر اس انداز میں پھسلے کہ محض لمحہ ہی لگا تھا اور گاڑی ڈھلوان کی طرف کسی گولی کی مانند تیزی کے ساتھ گرنے لگی، یوں کہ امام نے آنکھیں میچ کر کلمہ طیبہ کا ورد کرنا شروع کر دیا۔

”تو کیا وقت آخر آ گیا تھا؟“ اس کی آخری سوچ نے بس یہیں تک پرواز کی تھی۔

☆ ☆ ☆
وادی میں مینہ برس رہا تھا اور وہ اس بورڈ کے سامنے کھڑی تھی جس کے اوپر مٹے مٹے لفظوں میں ”مقامی صحت و مرکز“ لکھا تھا، اس کے سر پہ پاپرا اور منگورہ کے پہاڑ جھکے ہوئے تھے اور ان میں دور کہیں بہال ہوگا، جو بہت پیچھے رہ گیا تھا۔

سامنے منگورہ کا صدر مقام تھا اور وہ گردن ذرا فنی کی طرح اٹھا کے سامنے موجود عمارت کو دیکھ رہی تھی، اسی عمارت کے اندر پری گل کے نانا پچھلے ایک ہفتے سے ایڈمٹ تھے۔
بخار بگڑ کر خطرناک صورت اختیار کر گیا تھا، یوں پری گل کے نانا کو ہسپتال داخل ہونا پڑا، پری گل نانا کے پاس جانا چاہتی تھی، جب اس نے حمت سے روتے ہوئے درخواست کی تو حمت سے رہا نہیں گیا تھا۔

جہاندار کسی کام کے سلسلے میں علاقے سے دور تھا، شاہوار بہت کم یہاں آتا تھا، زیادہ تر اپنے ہٹ میں قیام کرتا تھا، یا پھر اسلام آباد چلا جاتا تھا
جہاندار نہ ہوتا تو یوں لگتا تھا جیسے سارے کام رک گئے ہیں، سردار بنو کے محل کا سارا انتظام جہاندار کے دم سے چلتا تھا، وہ نہ ہوتا تو جیسے کچھ نظر ہی نہ آتا۔

اب یہ بھی نہیں تھا کہ جہاندار صدیوں سے بنو محل میں رہتا آ رہا تھا، پچھلے صرف چند سال میں اس نے پورے بنو محل کو اپنے کنٹرول میں لے لیا تھا، وہ کہاں سے آیا تھا؟ کیوں آیا تھا؟ کسی مجبوری کے تحت آیا تھا؟ کوئی نہیں جانتا تھا، اپنی وضع قطع، شخصیت اور بول چال سے وہ اس علاقے کا نہیں لگتا تھا۔

وہ تعلیم یافتہ تھا، خوش لباس، خوش گفتار، وہ کسی بھی بڑے شہر میں اچھی نوکری کر سکتا تھا، پھر اسے بنو محل میں آنے کی کیا ضرورت تھی؟

کوئی اور سوچتا یا نہ سوچتا، حمت ضرور سوچتی تھی، کیونکہ وہی اس گھر میں سب سے زیادہ فارغ رہنے والی ہستی تھی جس کے پاس کرنے کے لئے کچھ بھی نہیں تھا، پھر وہ سوچتی کیوں نا اور سوچوں پہ تو کوئی پہرے بیٹھا نہیں سکتا نا، سوچیں تو لپک لپک کر اس آ کر کیا لوجسٹک بھی جاتی تھیں، جو بنے کہاں چلا گیا تھا؟ شاید ہمیشہ کے لئے؟ اپنا کام ادھورا چھوڑ کر، دل اتنا بے چین ہوتا کہ وہ محل کی راہداری میں چل چل کے تھکنے لگتی تھی۔

کیا اس کا دل اس اسامہ جہانگیر نامی اجنبی کا ”اسیر“ ہو رہا تھا؟ کیا یہ سچ تھا؟ کیا ایسا ٹھیک تھا؟ ہر سوالیہ نشان کے سامنے ایک خاموشی کا سائن بورڈ چمک رہا تھا، نہ ہاں میں جواب آتا، نہ ہی ناں میں، کیا اسے اپنے دل کو اس اجنبی کے لئے بے قابو کرنا تھا؟ نہیں، ہرگز نہیں۔

اسے ہلکتی ہوئی خواہشوں، منہ زور تمناؤں کو روکنا تھا، اسی مقام پہ، اسی موڑ پہ، وہ خود کو روک
کیوں لگا لیتی؟ خود کو آزیانوں اور امتحان میں کیوں ڈالتی۔

حمت کی ذرا سی بیوقوفی کسی کی جان نکال سکتی تھی، ہمیشہ کی نیند سلا سکتی تھی۔

جیسے جیسے وہ سردار بٹو کے بارے میں سوچ رہی تھی، اس کا دل ڈوبتا جا رہا تھا، دل میں پھوٹی نئی نئی تمناؤں کی کونپلیں خود بخود سوکھتی جا رہی تھیں، یہاں تک کہ حمت کا دل پہلے کی طرح ہی سپاٹ بے رنگ اور اجاڑ رستہ بن گیا تھا، جس پر سے کسی اجنبی کا گزر ہی نہ ہوا ہو۔

آخر وہ کیوں بھول گئی تھی، وہ پر بت کی ایک قیدی شہزادی تھی، اس قید سے نکلنے کا تصور کرنا بھی گناہ تھا، پھر وہ گنہ گار کیوں ہوئی؟ اس نے لمحائی طور پر ہی سہی، کیوں اس قید سے نکلنے کے بارے میں سوچا تھا؟ وہ بھی اسامہ جہانگیر کو پل بنا کر، کیا وہ خود غرض تھی؟ نہیں، ایسا ہرگز نہیں تھا۔

وہ اپنی نوپلی سوچوں سے تنگ آ چکی تھی، دل گھٹن سے بھرا تھا، جس ہی جس، دھول ہی دھول تھی، شاید وہ اونچی آواز میں رونا شروع کر دیتی، اپنی بھڑاس آنسوؤں کے ذریعے نکال لیتی، لیکن تب ہی پری گل روتی دھوتی پہنچ گئی تھی۔

”ام کو تاتا سے ملنے جانا ہے، ابھی کے ابھی۔“ پری گل کا مدعا جان کر حمت ساری سوچوں کو جھٹک کے جہاندار کو ڈھونڈتی ہوئی باہر آئی تو پتا چلا کہ جہاندار تو ہے نہیں، وہ کچھ پریشان ہو گئی تھی، اب کیا کرے؟ پھر اسے صندیر خان آتا دکھائی دیا تھا، کیا اسے صندیر خان سے کہنا چاہیے تھا؟ ابھی وہ اسی تانے بانے میں الجھی تھی جب صندیر خان اس کے قریب سے گزرتا ہوا رک گیا تھا، آج تو بڑا ہی مبارک دن تھا، صندیر خان حمت کے قریب سے گزرا اور رک گیا، بڑی حیرت کا مقام تھا۔

”کوئی مسئلہ ہے؟“ صندیر خان گو کہ زبان سے نہیں بولا تھا تاہم اس کی آنکھوں میں یہی سوال لکھا نظر آ رہا تھا، حمت کو غش آتے آتے رہ گیا۔

”ہاں..... نہیں۔“ وہ ذرا گھبرا گئی تھی۔

”ہاں یا نہیں؟“ صندیر خان نے ایک بھوں اچکا کر پوچھا۔

”ہاں۔“ وہ گہرا سانس کھینچ کر غیر ارادہ بولی، صندیر خان چونک گیا۔

”کیا؟“

”پری گل کے تاتا بیمار ہیں، ہسپتال تک جانا ہے۔“ بالآخر حمت نے کہہ ہی دیا، کیونکہ صندیر خان خاصی فرصت میں کھڑا پوچھ رہا تھا، اتنا تو وہ کبھی بھی مہربان نہیں رہا تھا، پھر نجانے کیا بات تھی، ایسی مہربانی کی توقع کم از کم صندیر خان سے کرنا عبث ہی تھا۔

”تو پھر؟“ وہ جیسے وجہ جاننا چاہتا تھا، آیا حمت کیا چاہتی ہے۔

”جہاندار نہیں ہے تو۔“ حمت کچھ بولتے بولتے رگ سی گئی تھی، صندیر خان گہرا سانس کھینچتا

جیسے سمجھ گیا۔

”پری گل کو لے آؤ، میں تم لوگوں کو ہسپتال لے جاتا ہوں۔“ وہ اپنے صاف دو ٹوک اور

گہرے لہجے میں جواب دیتا بارہ دری کی طرف بڑھ گیا تھا، حمت پہ جیسے شادی مرگ کی کیفیت

طاری تھی، وہ تیزی سے اندر کی طرف آئی، پری گل کو ساتھ لیا اور پھر صندیر خان کے ہمراہ مقامی ہسپتال آگئی۔

پری گل کے نانا کی صحت انتہائی خراب تھی، حمت کافی دیر روتی ہوئی پری گل کو دلاسہ دیتی رہی، جب وہ کچھ سنبھل کر نارمل ہوئی تو حمت ہوا خوری کے لئے باہر آگئی۔

صندیر خان کچھ دیر کے لئے انہیں ہسپتال چھوڑ گیا تھا، حمت ٹہلتے ٹہلتے کوریڈور کی طرف آئی تو ایک کھلے کمرے میں بینڈیج کرواتے نو جوان کو دیکھ کر ٹھنک گئی۔

گوکہ نو جوان کو معمولی چوٹیں لگی تھیں لیکن دو تین میڈیکل اسٹاف کے لوگ اور ایک ڈاکٹر بڑے محتاط انداز میں اس کا معائنہ کر رہے تھے جبکہ وہ بار بار کہہ رہا تھا۔

”میں بالکل ٹھیک ہوں، مجھے کچھ نہیں ہوا، اب مجھے جانے دیں۔“

”آپ کو خاموشی سے بیٹھنا ہوگا امام فریدے صاحب، ورنہ آپ کی شکایت اوپر لگا دی جائے گی۔“ ڈاکٹر نے خاصی شائستگی کے ساتھ اسے ڈانٹا تھا، امام فریدے کی طرح حمت بھی اوپر شکایت لگانے والی بات پہ چونک گئی تھی، ایسے ہی غیر ارادہ ان کی باتیں سننے کے لئے رک گئی۔

”اوپر یعنی؟“ امام نے بہت سنجیدگی سے الجھے الجھے لہجے میں دریافت کیا تھا، ڈاکٹر اپنے مصروف انداز میں کچھ بلند آواز میں بولا۔

”شاہوار بٹو کو۔“ جہاں امام شاہوار بٹو کے نام پہ ٹھنک گیا تھا وہیں حمت بھی پوری جان سے زخمی اجنبی کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔

”میں سمجھا نہیں۔“ امام نے چونک کر پوچھا، حمت بھی بے چینی سے کھڑی تھی کہ ڈاکٹر جانے اب کیا جواب دے؟

”ارے کمال ہے، آپ کو وہی تو لائے ہیں یہاں، زخمی حالت میں، گوکہ آپ کو اتنی چوٹیں نہیں لگی تھیں، لیکن سر پہ کوئی ٹنکر یا نوکیلی چیز کے لگنے سے بے ہوش ہو گئے تھے، آپ کو شاہوار بٹو یہاں ایڈمٹ کروا کے گئے ہیں اور انہوں نے کہا ہے جب تک آپ صحت یاب نہیں ہو جاتے،

ہمارے تسلط میں رہیں گے۔“ ڈاکٹر کا انداز آخر میں کچھ مزاحیہ سا ہو گیا تھا، امام جیسے سمجھ گیا اور اجنبی مسیحا کے لئے اس کے جذبات نرم ہو گئے تھے۔

”اچھا..... تو شاہوار بٹو صاحب مجھے یہاں پھینک کر دوبارہ نہیں آئے۔“ امام نے مسکرا کر پوچھا تھا اور اس کی مسکراہٹ اتنی معصومانہ شفاف اور دل کھینچ لینے والی تھی کہ حمت لمحہ بھر کے لئے سراسر بے بغیر نہیں رہ سکی تھی، وہ اسے دیکھنے میں اتنی محو تھی کہ امام نے بے اختیار گردن موڑ کر کھلے دروازے سے باہر دیکھا تھا، شاید کسی کی نگاہوں کے ارتکاز نے امام کو چونکا یا تھا، حمت نے جیسے ہی

امام کو خود کی طرف متوجہ دیکھا تو گڑبڑا کر آگے بڑھ گئی تھی، لیکن اب کہ چونکنے کی باری امام کی تھی، وہ نہ صرف چونکا تھا بلکہ ٹھنک بھی گیا تھا، اس کے تاثرات چونکنے اور ٹھنکنے سے بھی کچھ آگے کے تھے، وہ حیران نہیں تھا، وہ تو اچھا خاصا شاگرد لگ رہا تھا اور یہ کیفیت اس قدر حادی تھی کہ وہ ڈاکٹر کی چیخ و پکار کو نظر انداز کرتے ہوئے کرسی گھسیٹتا اٹھا اور تیزی سے کوریڈور کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

حمت نے جیسے ہی کرسی سے اٹھتے زخمی اجنبی کو دیکھا وہ پہلے تو حیران ہوئی تھی پھر اسے اپنے

پیچھے آتا دیکھ کر بری طرح خوفزدہ ہوئی اور اندھا دھند بھاگتی ہوئی کوریڈور کا موڑ مڑ کر ایک کمرے میں گھس گئی، وہ اجنبی اسے کیوں ڈھونڈ رہا تھا؟ وہ اجنبی اس کا پیچھا کیوں کر رہا تھا؟
کمرے کا دروازہ بند کرتی حمت خوف سے نیلی پڑتی تیز تنفس کے ساتھ مسلسل سوچ رہی تھی اور اسے یوں لگ رہا تھا دروازے کے پار اس اجنبی کو تجسس حیران اور عجیب سے تاثرات میں ڈھلی آنکھیں اسے دیکھ رہی ہیں، ان آنکھوں میں کیا تھا آخر؟ ان آنکھوں میں کیا بجلی کی طرح لپک رہا تھا؟ حمت آنکھیں بند کرتی خوف سے کپکپاتی تھر تھر کانپتی مسلسل سوچ رہی تھی اور اس کا تنفس جیسے بگڑتا جا رہا تھا۔

☆☆☆

گھر ڈھونڈنے میں ہیام کو قطعاً دشواری کا سامنا کرنا نہیں پڑا تھا۔
اسی گلی کی آخری نکر میں تھا گھر، جس کا گیٹ روم ڈاکٹر ہیام کا منتظر تھا، اسے امید تھی، گھر کی طرح اس کے لئے مخصوص کیا گیا کمرہ بھی اچھا ہی ہوگا۔
صبح اٹھتے ہی بیا کی کال سن کر ہیام نے بغیر ناشتہ کیے اپنی تیاری کر لی تھی، بیگ میں ٹھونس ٹھونس کر کپڑے گھسائے تھے اور دھونے والے کپڑوں کی الگ پیک کیے تھے، سوچا تھا وہیں جا کر دھوئے گا، صاف گھر اور صاف ماحول میں، یہاں تو سرکاری پانی نہانے کے لئے بھی نہیں ملتا تھا کپڑے دھونا تو دور کی بات تھی، اپنے سڑے ہوئے مالک مکان کے منہ پر چابی مار کر بڑے کروفر سے احسان منزل کے گیٹ پہ کھڑا تھا اور گھنٹی پہ ہاتھ رکھ کے ہٹانا بھول گیا تھا۔
لیکن اس گھر کے مکین جیسے کانوں سے بہرے تھے یا اتنے بے حس کے سن کر بھی باہر آنے کے روادار نہیں تھے، ہیام کو گھنٹی پہ ہاتھ رکھنے کے باوجود ہول اٹھنے لگے، نہ تو گھنٹی خراب تھی نہ لائٹ ندرد تھی پھر یہ لوگ دروازے تک آنے کی زحمت گوارا کیوں نہیں کر رہے تھے؟
ہیام تو کھڑے کھڑے ناک تک عاجز آ گیا اور یہاں تک کہ وہ اس گھر کے مکینوں پہ لعنت ڈالتا واپسی کے رستوں کا شمار کرنے لگا کہ اچانک قسمت مہربان ہو گئی اور دروازہ کھٹاک کی آواز کے ساتھ کھل گیا تھا۔

اور آنے والی ہستی دنیا سے بیزار، خونخوار، انتہائی بد مزاج، ہیام گہرا سانس کھینچتا جیسے صبر کے گھونٹ بھر کے رہ گیا تھا۔

”کیا ہے؟ صبح سویرے مانگنے کے لئے آ جاتے ہو، منہ اٹھا کر۔“ آنکھیں مسلتا، جمائیاں لیتا وہ جوان ہیام کو سرتا پا جلا کر راکھ کر گیا تھا، اس کی آنکھیں کھل گئیں، تیور بگڑ گئے، ایک تو انتظار کی کوفت اوپر سے آنے والے جوان کی بکواس، اس کے تو سر پہ لگی تھی۔

”میں تمہیں فقیر دکھائی دیتا ہوں؟“ ہیام کا دل چاہا تھا آگے بڑھ کے اس کے سارے حواس ایک ہی بیچ کے ساتھ جگا ڈالے، جوان نے بمی سی جمائی لے کر اسے سرتا پا دیکھا اور پھر تھوڑا سنبھل کر بولا۔

”اچھا..... اچھا تو دھوبی ہو، یا کیا صبح سویرے متھے آگے، دیے اس گھر میں کوئی رواج نہیں کپڑے دھلوانے کا باہر سے، تم چلتے پھرتے نظر آؤ، کسی اور کا دروازہ بجاؤ، کہیں سے کام مل جائے

گا۔“ وہ میلے کپڑوں کی ابل ابل کر باہر نکلتی گھنڑی کو دیکھ کر کہہ رہا تھا، ہیام کو ایک مرتبہ پھر خون کے گھونٹ بھرتا پڑے تھے، نمل کا دامن کھینچنا پڑا تھا، صبر کا جام پینا پڑا تھا، ورنہ دل تو چاہ رہا تھا، اس سوئی صورت کے سارے حواس ایک ہی جھانپڑ میں جگا ڈالے۔

”میں تمہیں دھوبی دکھائی دیتا ہوں؟“ وہ زہر خند سا بمشکل بھینچی آواز میں چیخا، وہ اس کے چیخنے پہ اب کہ تھوڑا آنکھیں کھول کر باریک بینی سے جائزہ لیتا ٹھنک گیا۔

گورا چٹا، خوبصورت انگریزوں سا جوان، نہ تو فقیر لگ رہا تھا، نہ دھوبی نہ کوئی چورا چکا، تو پھر یہ کون تھا؟ کپڑوں سے لدا پھندا؟ اس کی آنکھیں بڑھکی گئی تھیں۔

”تو پھر کون ہو تم؟“ اب کہ خاصا انسانوں والا سوال کیا گیا تھا، ہیام نے گہرا سانس کھینچ کر بولا۔

”کرائے دار۔“

”او..... ہوا اچھا اچھا، تو تم پہنچ گے، جس کاشدت سے انتظار تھا، ہماری والدہ ماجدہ کو، ظاہر ہے، کمرہ کرائے پہ چڑھا کر تین ہزار ماہوار کمیٹی بھی تو ڈالنی تھی، ہماری والدہ بہت آگے کا سوچتی ہیں، تو تم ہو ڈاکٹر ہیام، مجھ سے ملو، میں اس گھر کا اکلوتا لائق فائق چشم و چراغ، نامی گرامی آرکیالوجسٹ، تاریخ کا دل دادہ، منکر منکر کا باسی، گھر میں میری اوقات چوکیدار جتنی بھی نہیں، مجھے اسامہ جہانگیر کہتے ہیں، والدہ حضور کی سب سے ناپسندیدہ ترین ہستی، مجھ سے مل کر یقیناً تمہیں خوشی محسوس ہوئی ہوگی، اپنا تعارف میں نے اس لئے کرادیا کیونکہ میری والدہ نے اگلے دو دن تک تمہیں میری ساری ہسٹری بمعہ مثالوں کے ساتھ سنا دینی تھی، اس لئے بہتر جانا کہ تمہیں خود سے بتا دوں، اندر آؤ۔“ وہ انتہا کا باتونی آرکیالوجسٹ ہیام سے بھی باتوں میں چار ہاتھ آگے لگتا تھا، اس کے آگے آگے لپک جھپک بیرونی سیڑھیاں چڑھتا اوپر والے حصے کی طرف آگیا تھا۔

یہ ایک بڑا سفر نشد روم تھا، گداز کار پٹ، خوبصورت فرنیچر، ایچ باتھ روم، ایک دروازہ اندر کی طرف کھلتا تھا، جس کی سیڑھیاں نیچے لاؤنج میں تائی کے حصے میں اترتی تھیں۔

اسی کمرے کی ایک کھڑکی اس حصے میں کھلتی تھی جو چاچی کا اوپر لاؤنج کہلاتا تھا، یعنی اس کمرے کا مکین دونوں گھروں کا سانجا ہمسایہ کہلا سکتا تھا۔

کمرہ دیکھ کر ہیام کی ساری کوفت جھنجھلا ہٹ اور غصہ جاتا رہا تھا، اتنے مہینوں کی تپسیا جیسے کام آگئی تھی، وہ اندر تک پرسکون اور سرشار سا ہو گیا، یوں لگ رہا تھا جیسے ساری تھکاوٹ اتر گئی ہے۔

”شکر کرو، ولید کی منگنی ہوئی اور وہ یہاں سے گیا، ورنہ تمہارے نصیب میں یہ ٹھاٹھاٹ کہاں آنے تھے؟ یہ کمرہ ولید کے تسلط میں تھا، آہ تم ولید کو کہاں جانتے ہو گے، اپنی فرح پھپھو کا بیٹا ہے، نشرہ کا منگیتر، بننا تو اس نے عینی کا تھا، کیونکہ کوششیں ادھر سے جاری تھیں، قسمت نشرہ کی کھل گئی، ایسے کیا دیکھ رہے ہو، نشرہ بہن ہے میری، چچا کی بیٹی، یتیم، مظلوم اور بس کیا بتاؤں، رہو گے تو پتا چل جائے گا، نہ بھی چلا تو ہماری والدہ خود سارے کچے چٹھے کھول کھول کر بتائیں گی، انہیں کرائے داروں کے سامنے مظلوم بننے کا ازل سے جنون ہے، آؤ یہاں بیٹھو، آج تو مہمان ہو، اوپر سے فاقہ زرگان بھی لگتے ہو، میں تمہارے لئے نشرہ سے کہہ کر ناشتہ بنوالاتا ہوں، پھر اپنا انتظام کر

لینا، ہماری والدہ سے توقع مت رکھنا، وہ ایک دن کے مہمان کو برداشت کرتی ہیں، یا اس مہمان کو بھیل سکتی ہیں جس سے انہیں فائدہ ملنے والا ہو، اپنی دے تم ذرا فریش ہو لو، میں نیچے سے ہو کر ابھی آیا۔“ مسکراتا ہوا اسامہ اس کا بیگ ٹھکانے لگا کر نیچے کیا گیا پیام نے کھل کر سانس لی اور بے ساختہ کمرے کے خوشگوار ماحول کو دیکھ کر ہر کانعرہ لگایا، طبیعت اتنی سرشار تھی کہ فریش ہونے کی ضرورت ہی نہیں تھی، پھر بھی اس نے اسامہ کی بات مان کر ہاتھ روم کا رخ کر لیا تھا، اتنے صاف ستھرے ہاتھ روم میں نہانے کا مزہ بھی الگ تھا، جب وہ اسامہ کی باتوں پہ غور و غوض کرتا باہر نکلا تو اسامہ کو ایک مرتبہ پھر کمرے میں موجود پایا، اب کی دفعہ وہ خاصا مسکراتا ہوا اسامہ کے قریب آیا۔

”مجھے ایسے ہی رہائشی کمرے کی تلاش تھی، میں اب بہت پرسکون فیل کر رہا ہوں، تھینک یو سو مچ۔“ پیام کے مارے جذبات کے الفاظ ہی ختم ہو چکے تھے، اسامہ بے ساختہ معنی خیزی سے ہنستا رہا۔

”آں، ہاں مکان تو پسند آ گیا، دعا کرو مکیں بھی پسند آ جائیں۔“ اس کی معنی خیزی کو پیام سمجھ گیا، آخر پورا استاد تھا، اسامہ کا ہم پلہ۔

”میری زندگی کے دو ہی اصول ہیں، یا کسی کے بن جاؤ، یا کسی کو اپنا بنا لو۔“ اس نے اسامہ کی بات کا جواب اسی کے انداز میں دیا تھا، اسامہ معنی خیزی سے مسکراتا ہوا بے ساختہ ہنس پڑا۔

”واہ، تم نے تو مجھے متاثر کر لیا۔“

”زرہ نوازی ہے جناب کی۔“ پیام نے عاجزی کا مظاہرہ کیا، کچھ ہی دیر میں وہ دونوں ایسے گفتگو کر رہے تھے جیسے ایک دوسرے کو برسوں سے جانتے ہوں، صدیوں سے ایک دوسرے کے شناسا ہوں اور ہمیشہ سے لمبی لمبی ہانکتے اور چھوڑتے آرہے ہوں۔

جیسے اس وقت اسامہ انگریز کے وقتوں میں اپنے نادیدہ مربعوں کے قہے سنا کر پیام کو مرعوب کرنا چاہ رہا تھا۔

”میرے ابا کے ابا انگریز کے ٹاؤٹ تھے، پورے چنغل خور، لگائی بجھائی میں ماہر، بس ان کی اسی خوبی کی بنا پر انگریز میرے ابا کے ابا کو کئی مربع ایکٹرز مین دے گیا، لیکن ہوا کچھ یوں کہ ابا کے ابا کو زمینداری سے کوئی شغف نہیں تھا، انہوں نے کئی مربع ایکٹرز مین اونے پونے بیچ باج کر اپنی پرانی سیٹ سنبھال لی، چنغل خوری کی۔“ اسامہ ٹانگ پہ ٹانگ رکھے اب وہ چھوڑ رہا تھا، کہ اگر ابا سن لیتے تو جوتا اٹھا کر اس کی دھلائی کر دیتے۔

”اور میرے ابا کے ابا؟ کچھ نہ پوچھو، ہندوستان کے مہاراجہ تھے، بڑے بڑے اصبطل، سینکڑوں گھوڑے اور بگھیاں، کنیریں آگے پیچھے، لونڈیاں ہاتھ باندھے، دولت ایسی کے سمیٹی ہی نہ جاتی تھی۔“ پیام نے بھی اسامہ کے اسٹائل میں اپنی کہانی بنی کے اسامہ اس سے اچھا بھلا متاثر ہوتا دکھائی دیا تھا۔

”اتنے گھوڑے اور کنیریں؟“ اسامہ کے منہ میں پانی بھر آیا۔

”ایک آدھ کنیر میرے لئے بھی لے آتے۔“

”ابا کے ابا کی تھیں، میری نہیں، میرے پاس تو کنیر کی روح بھی نہیں، جس کے سامنے ہاتھ

جوز کر کپڑے ہی دسلو الینا۔“ ہیام نے چڑ کر بتایا۔

”اور میرا خیال ہے ہمیں اب حقیقت کی دنیا میں آ جانا چاہیے، کیونکہ دروازہ بچ رہا ہے۔“
ہیام کے اشارہ کرنے پر اسامہ تیزی سے اٹھا تھا پھر لپک کر دروازہ کھولا تو ایک ہاتھ اندر کی طرف آیا، ہاتھ میں ٹرے تھی اور ساتھ ہلکی سی غم غم آواز بھی۔

”انڈے ختم تھے، آلیٹ نہیں بنا، سالن اور کباب ہیں، ساتھ دہی اور اچار، چائے کچھ دیر تک لاتی ہوں۔“ آواز میں بلا کا بوجھل پن تھا، اسامہ ٹرے پکڑ کر عادتاً وہیں کھڑے کھڑے تقریر کرنے لگا تھا۔

”ابھی تک غم زدہ ہو، حد ہے نشو، ولید کوئی ہمیشہ کے لئے تھوڑی گیا ہے آتا جاتا رہے گا، اب میں تمہیں غمگین نہ دیکھوں۔“ اسامہ کی محبت بھری جھاڑ پہ نشو نامی لڑکی کی آواز تھوڑی اونچی ہوئی تھی۔

”ولید کے جانے کا دکھ اپنی جگہ اسامہ بھائی، میں تو پیاز کاٹتے ہوئے رو رہی تھی، آلیٹ بنانا تھا نا۔“ نشرہ نے وضاحت کی تو اسامہ فوراً چونک اٹھا۔
”مگر انڈے تو نہیں ہیں۔“ وہ بھی تو اسامہ تھا، کیسے چونک جاتا۔

”آپ کے اور اس مہمان کے لئے نہیں ہیں، باقیوں کے لئے تو ہیں نا۔“ نشرہ کی معصومیت کا کوئی انت نہیں تھا اور اسامہ جیسے کھڑے کھڑے کباب ہو گیا تھا، جلتا کسلتا ٹرے سمیت مڑا، ٹانگ سے دروازہ بند کیا اور غصے میں بھناتا ہیام تک آیا۔

”دیکھ لی تم نے ان سب کی کمینگی، یہ مجھ پر دیسی کے ساتھ ایسا سلوک کرتے ہیں، ایک انڈہ تک نہیں دیتے اور میں بھی نجانے کیوں ہر آٹھ مہینے بعد اس گھر پہ تھوکنے کے لئے آ جاتا ہوں۔“
اب وہ مارے غصے کے ہیام کو پوری ہسٹری سنارہا تھا، وہ نہ بھی سناتا تو یہ کام نیچے والوں نے کر دینا تھا، خود کو مظلوم بنا بنا کر، ہیام بمشکل ہنسی چھپاتا اس کی داستان امیر حمزہ سن رہا تھا۔

”میں تو انڈہ نہیں کھاتا، تم بھی صبر کرو یہ اتنا کچھ تو ہے نا۔“ ہیام نے جیسے اسے تسلی دی تھی، ویسے بھی صبح سو کھے تو س کھانے والے ہیام کے لئے یہ ٹرے من دسلوئی سے کم نہیں تھی۔

”چلو یہی غنیمت سہی، ویسے بھی صابر شا کر ہوں، میں تو تمہارے لئے کہہ رہا تھا۔“ اسامہ نے اور برائیوں کا سلسلہ ختم کر کے ناشتے کی طرف توجہ کی تو اسے اچانک یاد آ گیا۔

”اب میں تو چلا جاؤں گا، جانے نشرہ کا یہاں کیا حال ہو، ولید بھی نہیں۔“ اس کی سرگوشی کو کہ ہیام نے سن لی تھی، پھر بھی کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

”یعنی کچھ کہے نہ کہے، میری والدہ ماجدہ سے کچھ امید نہیں، پھپھو کے قیام تک صبر سے بیٹھی تھیں اس خاموشی کے پیچھے ایک طوفان چھپا ہے۔“ اسامہ کے تبصرے مسلسل جاری تھے۔

”طوفان؟“ ہیام ناشتہ کرتے کرتے اچانک چونکا، اوف طوفانوں سے اسے بڑا خوف آتا

تھا۔

(جاری ہے)

”اچھا تو تم اپنے ساتھ ہونے والی اس زبردستی کا بدلہ اپنے معصوم بیٹے سے لے رہی ہو اسے ہر حال میں اسکول بھیج کر۔“ سرمد نے نمرہ کی بات سن کر ہنس کر کہا۔

”جی نہیں، میں تو بچوں کی نفسیات کی بات کر رہی ہوں کہ اسکول نہ جانے کے بہانے ہوتے ہیں بچوں کے پیٹ میں درد، سر میں درد، ٹانگوں میں درد وغیرہ وغیرہ، جانتے ہیں نہ کہ اور کون سا نظر آتا ہے جو والدین دیکھ کر فیصلہ کریں گے کہ ہے یا نہیں ہے۔“

”یعنی مجھے آج بھی اسکول جانا پڑے گا؟“ نمرہ نے ماں باپ کی باتیں سن کر نتیجہ اخذ کرتے ہوئے کہا۔

”جی میری جان! آپ کو آج بھی اسکول جانا ہوگا اور چند روز میں آپ کے اسکول میں دسمبر کی چھٹیاں ہو جائیں گی نا پھر آپ مزے سے گھر پہ رہنا۔“ نمرہ نے بہت پیار سے نمرہ کو فرائی انڈہ کھلاتے ہوئے کہا۔

”میں چھٹیوں میں بھی گھر پہ رہوں گا؟“

”تو اور کہاں؟“ سرمد نے پوچھا۔

”چھٹیوں میں تو میں کہیں دور سیر کے لئے جاؤں گا پاپا! میرے سب فرینڈز اپنے کزنز کے گھر جاتے ہیں۔“ نمرہ نے سرمد کو دیکھتے ہوئے بتایا تو وہ دونوں ہنس پڑے۔

”تو بیٹا جانی! ہم بھی اس بار سردیوں کی چھٹیاں گزارنے کراچی جائیں گے، آپ کے ناٹا ماموں اور کزنز کے گھر ٹھیک ہے؟“ نمرہ نے نمرہ

”مما! میں آج اسکول نہیں جاؤں گا۔“ سات سالہ حمزہ نے ناشتے کی میز پر منہ بنا کر کہا۔ ”کیوں نہیں جاؤ گے؟“ نمرہ نے اس کو پیار سے دیکھا۔

”میرے پیٹ میں درد ہے ممما؟“ حمزہ نے مسکین سی صورت بناتے ہوئے جواب دیا۔ ”کوئی درد نہیں، آپ اپنا ناشتہ فٹش کریں اسکول سے دیر ہو جائے گی۔“

”رہنے دو نا، بچے کے پیٹ میں درد ہے چھٹی کر لینے دو آج۔“ سرمد نے بیٹے کی حمایت کی۔

”یہ پیٹ کا درد ہمیشہ ہمارے بیٹے کو صبح اسکول جاتے وقت ہی کیوں ہوتا ہے؟“ نمرہ نے مسکراتے ہوئے شوہر کی آنکھوں میں دیکھ کر سوال کیا۔

”بھئی وہ تو ہمیں بھی اس عمر میں ہوا کرتا تھا تمہارے پیٹ میں بھی درد ہوتا ہوگا عین اسکول جانے کے وقت۔“ سرمد نے مسکراتے ہوئے پراٹھا ختم کیا۔

”اب ایسا بھی نہیں تھا ہمارے امی ابو ہمیں چھٹی نہیں کرنے دیتے تھے اسکول سے چاہے ہم کتنے ہی درد کا شور مچاتے، منہ بناتے حتیٰ کہ آنسو بھی نکال کر دکھا دیتے تھے تب بھی اسکول سے غیر حاضری نہیں ہونے دیتے تھے ہماری، چھٹی تو بس کلینڈر کے حساب سے یا وہی سردی گرمی کی مخصوص چھٹیاں ہوتی تھیں تو ہی اسکول سے جان چھٹی تھی ہماری۔“

کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا تو وہ دودھ پئے لگا۔
خوش ہو کر بولا۔
”نچی۔“

”نچی مچی، ماما کی جان، چلیں اب آپ
جلدی سے ناشتہ فنش کریں ورنہ اسکول سے دیر
ہو جائے گی۔“

”او کے ماما۔“ وہ دودھ کا گلاس اٹھا کر



میں پڑ رہی تھی وہ ڈائینگ ٹیبل صاف کرتے ہوئے وہیں سے بولی تھی۔

”سرمد! کتنی بار کہا ہے آپ سے صبح صبح یہ نیوز چینلوں میں لگایا کریں ہر وقت تو ان پر بریکنگ نیوز چلتی رہتی ہیں کچھ بریک ہونہ ہو نیوز کاسٹرز کے انداز لب و لہجے ایسے ہوتے ہیں جیسے کچھ بریک کرا کے ہی دم لیں گے صبح صبح بریکنگ نیوز ہارٹ اٹیک کرانے کے لئے کافی ہوتی ہیں۔“

”ہاں تمہاری بات صحیح ہے مگر کبھی کبھی واقعی کو بڑی بری اور بریکنگ نیوز بھی ہوتی ہے۔“

سرمد نے جواباً کہا۔

”ہاں وہ تو اب ہر روز ہی ہوتی ہیں اللہ ہمارے ملک پر عوام پر رحم فرمائے آمین۔“

”آمین۔“ سرمد بولا۔

اچانک نیوز چینلوں پر ایک یہ خبر گردش کرنے لگی تھی ”آرمی اسکول پشاور“ پر دہشت گردوں کے حملے کی خبر جسے سنتے ہی سرمد کے اوسان خطا ہو گئے اخبار ہاتھوں سے گر گیا، اس کے حمزہ کا اسکول تھا یہ تو۔

”اومائی گاڈ!“ سرمد کے منہ سے نکلا۔

”کیا ہوا؟ پھر کوئی بریکنگ نیوز آئی ہے؟“

نمرہ نے کچن میں جا کر سینک پر ہاتھ دھوتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں بہت بڑی بری اور بریکنگ نیوز ہے نمرہ۔“

”تو آپ ٹی وی بند کر دیں ناں، دل ہولائے دیتی ہیں یہ بریکنگ نیوز۔“

”نمرہ! جلدی سے یہاں آؤ دیکھو کیسی المناک خبر چل رہی ہے۔“ سرمد چلایا۔

”کیا ہوا سرمد؟“ نمرہ دوڑنی چلی آئی۔

”یہ دیکھو ہمارے حمزہ کے اسکول پر دہشت گردوں نے حملہ کیا ہے اب تک بیس بچوں کی

ہوئے کہا تو وہ ہنس کر بولی۔

”اور آپ جمہوریت کے علمبردار بن جاتے ہیں جناب! چند روز بعد دسمبر کی تعطیلات شروع ہونے والی ہیں اس لئے میں چھٹی نہیں کرنے دے رہی حمزہ کو۔“ نمرہ نے وضاحت کی۔

”کہہ تو تم بھی ٹھیک رہی ہو۔“

”ناشتہ ہو گیا بیٹا! اسکول چھوڑ آؤں؟“

سرمد اپنا ناشتہ ختم کر کے اٹھتے ہوئے بولا آج اس کا دیر سے آفس جانے کا موڑ تھا۔

”جی پاپا!“ حمزہ بھی کرسی چھوڑتے ہوئے بولا، نمرہ نے نشو سے حمزہ کا منہ صاف کیا اس کا ماتھا چوم کر اس کے ہاتھ چومے، سرمد ہر صبح یہ منظر دیکھتا تھا اور مسکرائے جاتا تھا۔

”اللہ حافظ ماما!“ حمزہ نے مسکراتے ہوئے سرمد کی انگلی پکڑی اور باہر گاڑی کی طرف جاتے ہوئے اسے الوداع کہا۔

”اللہ حافظ ماما کی جان!“ نمرہ نے اسے ممتا بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بہت محبت سے جواب دیا اور تب تک باہر کھڑی رہی جب تک سرمد گاڑی پورچ سے نکال کر باہر نہیں لے گیا تھا، ان کے جاتے ہی اس نے اندر آ کر ضروری چیزیں کمیشن اپنی چائے ختم کی اور ناشتے کے برتن کچن میں بنے سینک میں رکھ کر دھونے لگی، سردی اور دھند کافی تھی، اس نے سرمد کے پہننے کے لئے گرم سوٹ نکالا تھا، اسی دوران سرمد، حمزہ کو اسکول چھوڑ آیا تھا اور آتے ہی شاور لینے چلا گیا پھر نہا کر تیار ہو کر ٹی وی لاونج میں ٹی وی آن کر کے بیٹھ گیا اور ساتھ ساتھ اخبار پر بھی نظریں دوڑانے لگا۔

”آج کی تازہ خبر سب سے پہلے سب سے آگے دیکھئے“ ”ارٹ“ نیوز پر ایک کلسیو مناظر کے آپ کا اپنا چینل۔“ ٹی وی کی آواز نمرہ کے کانوں

شہادت کی خبر آچکی ہے اور دہشت گرد ابھی تک اسکول کے اندر موجود ہیں۔“ سرد نے بے چینی، بے قراری اور اضطراب کی سی کیفیت میں نمرہ کو بریکنگ نیوز سنائی تو جیسے نمرہ کی ریڑھ کی ہڈی میں کرنٹ سا دوڑ گیا۔

”حمزہ! میرا حمزہ!“ نمرہ کی ٹانگوں میں تو جیسے جان ہی نہیں رہی تھی وہ ایک دم سے صوفے پر ڈھکے گئی، سرد نے اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لئے نظریں ٹی وی پر مرکوز تھیں۔

”یا اللہ رحم، یا اللہ رحم، یا اللہ رحم۔“ نمرہ زارو قطار روتے ہوئے دعا مانگ رہی تھی، آنکھوں کے سامنے حمزہ کا خوبصورت معصوم چہرہ گھوم رہا تھا۔

”یا اللہ! ہمارے بچوں کی حفاظت فرماتا، یا اللہ میرے حمزہ کی حفاظت کرنا، یا اللہ خیر کرنا ہمارے سارے بچوں پر رحم کرنا سب ماؤں کی گودیں بھری رکھنا، ماں باپ کی آنکھوں کی ٹھنڈک سلامت رکھنا۔“ سرد بھی پریم لہجے میں دعا کر رہا تھا، یکا یک نمرہ نے سرد کا بازو پکڑ کر اسے جھنجھوڑا۔

”سرد! میرا بیٹا ہے وہاں مجھے..... میرا بیٹا لا کر دیں..... حمزہ کو واپس لے کر آئیں..... وہ ڈر رہا ہوگا، رورہا ہوگا..... میرا بیٹا..... میرا حمزہ..... مجھے لا کر دیں سرد۔“

”چلو ہم حمزہ کے اسکول جاتے ہیں اپنے بیٹے کو گھر لے کر آتے ہیں بس تم خود کو سنبھالو، حوصلہ رکھو، دعا مانگو انشاء اللہ ہمارے بچوں کو کچھ نہیں ہوگا، پولیس اور آرمی ہے نا وہاں وہ سب سنبھال لے گی۔“ سرد نے ٹی وی آف کر دیا، گاڑی کی چابی اٹھائی اور نمرہ کو سمجھاتا، تسلی دیتا، سنبھالتا ہوا باہر لے آیا، گاڑی میں بیٹھتے وہ حمزہ کے اسکول کی جانب روانہ ہو گئے۔

جوں جوں ”آرمی پبلک اسکول پشاور“ میں حملے کی خبر پھیل رہی تھی ملک بھر بھی بے چینی اور دکھ کی فضا بنتی جا رہی تھی، اسکول میں اس وقت دو ہزار افراد موجود تھے، خبروں میں بتایا جا رہا تھا کہ دہشت گرد ایف سی کے کپڑوں میں ملبوس ہیں، ہر گزرتے لمحے کے ساتھ معصوم بچوں کی شہادتوں میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا، آرمی پولیس اور دیگر سیکورٹی فورسز اہم سرکاری عمارتوں چوراہوں اور ہسپتالوں کے باہر تعینات کر دی گئیں تھیں، آرمی پبلک اسکول کے باہر لوگوں کی بہت بڑی تعداد جمع ہو چکی تھی، وہ والدین جن کے بچے اسکول میں پڑھنے گئے وہ باہر کھڑے تھے بے بسی اور خوف سے رورہے تھے اپنے بچوں کی سلامتی سے واپسی کی دعائیں مانگ رہے تھے۔

نمرہ اور سرد بھی پاگلوں کی طرح اپنے حمزہ کی آمد کے منتظر تھے، جس قیامت کا ذکر سنتے بڑھتے آئے تھے یوں لگ رہا تھا آج وہ قیامت آگئی ہے، ماں باپ اپنے جگر گوشوں کو ڈھونڈتے پھر رہے تھے بے یار و مددگار، بے بس، روتے تڑپتے ایک کرب، اذیت اور عذاب سے گزر رہے تھے وہ، بے بسی سی بے بسی تھی۔

بنتے مسکراتے بچے جو صبح گھر سے پڑھنے کے لئے اسکول گئے تھے اب ان کے معصوم چہروں پر موت کی سفاکی ڈیرا ڈالے بیٹھی تھی، سینکڑوں ماؤں کی گودیں آن کی آن میں اجڑ گئیں تھیں، والدین کے لئے اپنے بچوں کو شناخت کرنا مشکل ہو رہا تھا، خون میں لت پت ان معصوموں کے یونیفارم تھے، کتنوں کے چہرے مسخ تھے، ایک ایک بچے کو کئی کئی گولیاں ماری گئیں تھیں، مائیں صدے سے غش کھا رہی تھیں، باپ دکھ سے سینہ کو بی کرتے نظر آ رہے تھے، ایسے میں نمرہ اور سرد کو اپنے سات سالہ

بیٹے حمزہ کا لہو میں بھیگا وجود اسٹریچر پر دکھائی دیا
حمزہ کے معصوم چہرے پر لہو کے چھینٹے تھے، سیاہ
چمکدار آنکھیں حیرت سے کھلی تھیں، جیسے اپنے
ساتھ ہونے والی اس ظلم کا سبب پوچھ رہی ہوں،
ہر طرف چیخ و پکار آہ و بکایا ہا ہکار پچی تھی، قیامت
کے اس دردناک شور میں نمرہ کی دل روز چیخ بھی
شامل ہو گئی۔

”حمزہ..... حمزہ میرا بچہ..... مار دیا ظالموں
نے میرے معصوم بچے کو مار دیا..... حمزہ اٹھو بیٹا!
آؤ گھر چلیں..... مم..... میں تمہیں کبھی اسکول
نہیں بھیجوں گی..... بس..... ایک بار..... ایک
..... بار..... مجھے ماما بولو..... آؤ میرے ساتھ
اپنے..... گھر چلو..... اٹھو نا بیٹا۔“ نمرہ دیوانہ وار
بولتی حمزہ کے ساکت چہرے کو اپنے ہاتھوں میں
لئے سننے والوں کا دل چیر رہی تھی، سرمد تو خود
اپنے آپ پر قابو نہیں رکھ پایا تھا ہر طرف لہو میں
لتھڑے معصوم بچوں کے جسد خاکی دیکھ دیکھ وہ
دھیرے دھیرے ٹوٹ رہا تھا مگر جونہی اس کی نظر
اپنے بیٹے کے لہو لہیان بے جان جسم پر پڑی وہ
چناخ سے ٹوٹ کر بکھرا تھا، ڈاکٹر بتا رہا تھا اس
نہضے وجود میں اٹھارہ گولیاں ماری گئیں تھیں، یہ سن
کر تو سرمد اور نمرہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔

جو بچے زندہ بچ کر اسکول سے باہر آئے
تھے ان کی مائیں ان کے باپ انہیں اپنے سے
لپٹائے چومے جارہے تھے، اللہ کا شکر ادا کر رہے
تھے کہ ان کے بچے زندہ سلامت واپس آ گئے۔

”میرے خدایا! میری زمیں پر یہ قہر سا
کیوں بپا ہوا ہے؟ ہر آنکھ نم ہے، ہر دل دریدہ، ہر
گھر میں ماتم کا سماں ہے۔“

ایک سو بیالیس بچوں کی شہادت ہو چکی تھی
زخمی بھی کم نہ تھے، یہ ایسا کاری وار کیا تھا دشمن نے
پورے وطن کا دل چیر کے رکھ دیا تھا، سفاک سے

سفاک انسان بھی بچوں کے ساتھ ہونے والے
اس ظلم پر دکھی اور اشکبار تھا۔

وہ معصوم بچے نویں اور دسویں جماعت کے
ذہین اور پر عزم بچے اپنی الوداعی تقریب میں
شریک تھے کے ان دہشت گردوں نے خوشی کی
تقریب کو موت کی داستاں بنا دیا، خود کش جیکٹ
پہنے ایک حملہ آور نے اچانک خود کو دھماکے سے
اڑا دیا، جس کی وجہ سے بچوں کی کثیر تعداد نے
جام شہادت نوش کیا، بچوں کے کلاس روم ان کے
وجود کے ٹکڑوں اور خون سے رنگین ہو گئے تھے،
ان کی ٹیچر کو پیٹرول چھڑک کر ان کے سامنے
آگ لگا دی گئی، معصوموں کے چہرے گولیوں
سے ختم کر دیئے گئے، پہچان کو چہرے نہ رہے،
زندگی کو سانس نہیں نہ رہیں کتنے ہی معصوم تھے کہ جن
کے گلوں پر چھریاں چلا کر انہیں ذبح کر دیا گیا،
عربی بولنے والے لمبی لمبی داڑھیاں رکھ کر، اللہ کا
نعرہ لگا کر خود کو مسلمان ظاہر کرنے والے نہ تو
مسلمان تھے نہ ہی انسان تھے، جو وہ کر گئے وہ تو
درندے بھی نہ کریں یہ سوچ کر دیکھ کر دکھ اور شرم
سے منہ چھپائے پھرتے ہیں درندے بھی، بچوں
کے سروں اور چہروں میں گولیاں ماری گئیں، جس
بچے کے زندہ ہونے کا شک گزرتا اس کے قریب
جا کر اس کے سروں اور سینوں میں درجنوں
گولیاں اتار دی گئیں، ظلم کا ہر حربہ عمل میں لایا
گیا، اسکول کے معصوم بچوں کو ختم کرنے کے لئے
پرنسپل اور ٹیچرز کو بھی سفاکی سے مار دیا گیا، تقریباً
ساڑھے چھ گھنٹے تک سیکورٹی فورسز اور دہشت
گردوں کے درمیان فائرنگ کا تبادلہ ہوتا رہا،
زخمیوں کو، شہید ہونے والوں کو اور زندہ بچ جانے
والوں کو اسکول سے باہر نکال لیا گیا تھا، اسکول
میں ہر طرف خون بکھرا تھا، بچوں کے اسکول کے
بستے، کاپیاں، پنسلیں، ڈرائنگ بک زمین پر لہو

میں رنگی پڑی تھیں، پھولوں کا شہر پھولوں کے جنازے اٹھانے کی تیاری کر رہا تھا، پتھر کا سینہ بھی پھٹ پڑا تھا اس قیامت صغراں کا منظر دیکھ کر، کیا قیامت کی گھڑی رہی ہوگی، جب ایک نوخیز اپنے لہو کا کفن اوڑھے تڑپتا ہوگا اور سفاک جلا دقہقہے لگاتا ہوگا؟

حمزہ نے تو چھٹیوں میں اپنے نانا ماموں کے گھر جانا تھا مگر وہ تو مکمل اور پکی چھٹی پہ چلا گیا تھا اور اس کے نانا ماموں اس کے گھر آئے تھے اسے آخری بار دیکھنے، الوداع کہنے، سپرد خاک کرنے کے لئے، وہ اب کبھی نانا، ماموں کے گھر نہیں جاسکتا تھا، وہ تو اپنے اللہ کے گھر چلا گیا تھا۔

”سرمد! میں نے..... حمزہ کو زبردستی..... اسکول بھیجا تھا نا؟ جی وہ مجھ سے روٹھ کر دور چلا گیا ہے..... کاش..... میں اسے اسکول نہ بھیجتی تو آج..... آج وہ اس طرح اتنی کم سنی میں..... اتنی بے بسی اور بے چارگی میں مارا نہیں جاتا..... ساری..... میری غلطی ہے..... میں نے..... اپنے بچے کی..... بات..... نہیں مانی اور..... اپنے بچے کو ہمیشہ کے لئے کھو دیا۔“ نمرہ تڑپ تڑپ کر روتے ہوئے بول رہی تھی، سرمد کے لئے خود کو سنبھالنے سے زیادہ نمرہ کو سنبھالنا بہت مشکل اور تکلیف دہ تھا۔

”نمرہ! پلیز تم خود کو الزام مت دو، بہت سی ماؤں نے اپنے لخت جگر کھوئے ہیں اس سانحے میں، ہمارا اور ان سب کا دکھ ایک ہے ہمیں ایک دوسرے کا حوصلہ بننا ہے، ایک دوجے کی ہمت بندھانی ہے، تسلی، دلاسا دینا ہے سب کو، دہشت گردوں نے سینکڑوں نہیں، ہزاروں گھروں میں صف ماتم بچھائی ہے، اللہ ہم سب کو صبر دے۔“

بھگتے لہجے میں اسے سمجھانا چاہا۔

”صبر۔“ نمرہ نے سرمد کو یوں دیکھا جیسے اس نے کوئی انہونی یا انوکھی بات کہہ دی۔

”ہاں صبر بلکہ صبر جمیل۔“ سرمد نے اسی بھگتے درد بھرے لہجے میں کہا۔

”اے تو میرے بغیر نیند بھی نہیں آتی تھی سرمد! پھر..... پھر وہ میرے بغیر کیسے سو گیا آج؟“ نمرہ نے درد سے دل چیرتے لہجے میں کہا تو سرمد بھی اسے اپنے ساتھ لگا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

☆☆☆

یہ ایک دل تھا جسے اب تک سنبھال رکھا تھا اسے بھی توڑ گیا یہ سانحہ پشاور کا ”جی ہاں، آرمی پبلک اسکول پشاور ہماری ملکی تاریخ کا تاریک، سنگین اور بدترین باب آج رقم کر دیا گیا، سینکڑوں معصوم بچے حصول علم کے دوران شہید کر دیئے گئے، صبح سے رات ہونے والی ہے مگر آج سولہ دسمبر سقوط ڈھاکہ کی تاریک، تاریخ کے دن ہمارے دشمن نے ہمارے دامن پر ایک اور داغ ایک اور زخم لگایا ہے جو شاید کبھی نہیں بھر پائے گا 16 دسمبر 1971ء میں ہمارا ملک دو لخت ہوا تھا اور آج سولہ دسمبر 2014ء کو ہماری ماؤں کے لخت جگر، لخت لخت ہوئے ہیں اور ہماری ماؤں کے کلیجے پھٹ گئے ہیں ان کے دل نوچ لئے گئے ہیں۔“

یا خدا! رحم میری دھرتی پر دہشت گردی ہے پھر بپا ہوئی سقوط ڈھاکہ کا ہی زخم تازہ تھا اک قیامت کی اور انتہا ہوئی نیوز رپورٹر اور اینکر پرسن علینا عباسی مائیک ہاتھ میں لئے پشاور کے لیڈی ریڈنگ اسپتال کے باہر کھڑی اپنے کیمرا مین اور ایس کے ساتھ براہ راست ٹی وی پر رپورٹ کر رہی تھی اس کے

پہرے پر پھیلا کرب، آنکھوں سے بہتے آنسو، لہجے میں نژب اور آنسوؤں کی جھنکار واضح دیکھی اور محسوس کی جاسکتی تھی، اسپتال کے اندر اور باہر لوگوں کا اک ہجوم تھا زخمی اور شہید ہونے والے والدین کی آہ و بکا جاری تھی، کہیں درد سے کراہتے بچوں کی دل شکن آلود آوازیں ہر ایک کو رلا رہی تھیں، نرسیں جو بچوں کی مرہم پٹی میں لگی تھیں وہ بھی رو رہی تھیں اور بچوں کی زندگی کی دعائیں مانگ رہی تھیں۔

”ناظرین! آج کے دن شاید ہی کوئی آنکھ ہو جو اس سانحے پہ غم نہ ہو وہ ننھے معصوم بچے جنہیں مرتے وقت نہ اپنی ماؤں کی گود میں سر آئی نہ باپ کا دست شفقت و تسلی ہی مل سکا، خود کو انسان اور مسلمان کہلانے والے وہ سفاک دہشت گرد تو درندوں کو بھی مات دے گئے، درندے بھی ان دہشت گردوں سے لاکھ درجے بہتر ہیں، جنہوں نے ہماری سینکڑوں ماؤں کی زندگی میں سیاہ رات شیت کر دی ہے، آج سولہ دسمبر کی سرد خنک صبح جتنی غمناک، دردناک اور سفاک رہی، رات اس سے کہیں زیادہ بے رحم اور سراپا غم گزرے گی، وہ مائیں بسترؤں میں، گودوں میں اپنے ان بچوں کو ڈھونڈیں گی، جنہیں لوری سنا کر، سینے سے لگا کر تو کبھی کہانی سنا کر سلایا کرتی تھیں، آج نہ وہ مائیں سو سکیں گی نہ اس دیس کا کوئی بھی حساس دل انسان آج سو پائے گا، آج دکھ بھی اس دکھ پہ دل کھول کر روئے گا جو ہماری دھرتی کی ماؤں کو ملا ہے۔“

دکھ بھی گر یہ کناں ہے آج کی رات ایسا ماتم بپا ہے آج کی رات ننھے بچوں کی جان ہوئی قرباں حشر کا اک سماں ہے آج کی رات کتنی ماؤں کی گودیں ہیں خالی ہوئیں

آرش بھی رو رہا ہے آج کی رات ہم بے چارے غم کے وہ مارے ہیں گل جن کا رونا لکھا ہے آج کی رات علینا چلتے چلتے آنسوؤں کی زبان بولنے لگی تھی، نیوز روم میں ٹی وی چینل کے اونر، نیوز پروڈیوسر اور نیوز کاسٹر سمیع الدین بھی موجود تھے اور علینا کا پروگرام بہت توجہ سے دیکھ رہے تھے، یکا یک نیوز کاسٹر سمیع الدین کہنے لگا۔

”سر! آپ نے اتنے اہم پروگرام کے لئے علینا کو بھیج دیا وہاں اب دیکھیں کیسے روئے جا رہی ہے رپورٹنگ کیا کرے گی علینا، وہ تو رو رو کر وقت ضائع کر رہی ہے، ایسے حادثات کی رپورٹنگ کے لئے کسی میل اینکر کو بھیجنا چاہیے، خاتون کو بھیجنا سراسر نادانی ہے۔“

”آئی تھنک علینا بہت عمدہ پروگرام کر رہی ہے اس کا انداز بیان، اس کی آنکھوں سے بہتے آنسو، لہجے کا دکھ اور کرب ہر ناظر کی نگاہ سے دل میں منتقل ہو گا اور اس حادثے پر بھلا کون ہے جو غمگین نہیں ہے ٹی وی اینکر پرسن، نیوز رپورٹرز بھی تو انسان ہیں جائے حادثہ پر پہنچ کر تو اپنے آپ آنسو نکل آتے ہیں۔“

”وہ تو ٹھیک ہے سر لیکن؟“

سمیع الدین خود وہاں جانا چاہتا تھا اس لئے علینا پر اعتراض کر رہا تھا، پروڈیوسر ضیغم عباس کو اس نے مزید کچھ کہنا چاہا تو چینل کے اونر شبیر ہمدانی بول پڑے۔

”لیکن تم یہ دیکھو کہ علینا کی اس طرح کی رپورٹنگ سے بے شک وہ دل سے، دکھ سے کر رہی ہے لیکن اس سے ہمارے چینل کی ریٹنگ میں کتنا اضافہ ہو گا، علینا کا یہ آنسو بہانا، دکھ بھرا انداز ہمارے ناظرین کو ٹی وی کے سامنے سے اٹھنے نہیں دے گا۔“

”اتنا بڑا سانحہ رونما ہو گیا ہے سر! اور آپ کو اپنے چینل کی ریننگ کی پڑی ہے بڑے افسوس کی بات ہے سر!“

”مسٹر نیوز کاسٹر، آج کے دور میں ہر انسان اپنا بزنس چکانا اور آگے بڑھانا چاہتا ہے اور اب تو ہر چیز بکتی ہے، دکھ ہو، آنسو ہوں، درد ہو موت ہو مجبوری ہو یا بے بسی ہو آج کے دور میں سب بکتا ہے، ہنسی اتنا دیر پا تاثر نہیں چھوڑتی نہ ہی توجہ اپنی جانب مبذول کرواتی ہے جتنی جلدی اور جتنی شدت سے آنسو اپنی طرف کھینچتے ہیں، متوجہ کرتے ہیں اور آنسو اگر عورت کے ہوں تو اثر اور بھی تیزی سے کرتے ہیں، کیا سمجھے؟“ شبیر ہمدانی نے بے بسی سے مسکراتے ہوئے کہا تو سمیع الدین کو اس سے نفرت محسوس ہونے لگی جو اپنے فائدے کی سوچ رہا تھا، جسے ان والدین کا احساس تک نہیں تھا جو آج اپنی اولاد کو بیٹھے تھے وہ بھی ایک ظالمانہ اور المناک حادثے کے سبب۔

”میں جا رہا ہوں سر!“ سمیع الدین اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور شبیر ہمدانی کو دیکھتے ہوئے بولا۔

”آپ یہاں بیٹھ کر اپنے ہم وطنوں کے دکھ اور آنسو گیش کرائیں، ان کی بے بسی اور غم بچیں اور اپنے چینل کی ریننگ بڑھائیں، میں مزید یہاں کام نہیں کر سکتا، میرا استعفیٰ آپ کو آج ہی مل جائے گا، خدا حافظ۔“ سمیع چلا گیا، ضیغم عباس نے شبیر ہمدانی کی طرف فکر مندی سے دیکھا۔

”سر! روکیے اسے، سمیع بہت ذہین اور قابل نیوز کاسٹر اور رپورٹر ہے۔“

”انہیں کیا ہوا؟“ نیوز ایڈیٹر نے سمیع کی جانب اشارہ کیا تھا جو گلاس ڈور سے باہر اپنے

کیبن سے اپنی چیزیں سمیٹ رہا تھا۔
”کچھ نہیں، بس ان کا وقت پورا ہو گیا ہے یہاں۔“ شبیر ہمدانی لا پرواہی سے بولے۔
”مطلب؟“

”مطلب یہ کہ اب یہ موصوف کسی اور چینل پر اپنے لفظوں کی پٹاری کھولیں گے اور خوب پیسہ تمییش گے۔“ شبیر ہمدانی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”وہ تو ہے سر! سمیع کو تو آل ریڈی بہت سی آفرز تھیں بڑے نیوز چینلز سے جہاں بھی جائیں گے ہاتھوں ہاتھ لئے جائیں گے۔“ نیوز ایڈیٹر نے کہا تو نیوز پروڈیوسر نے اسے گھورا۔

”آہم۔“ نیوز پروڈیوسر نے گلا کھنکارا۔
”بڑے نیوز چینلز سے، تمہارے خیال میں میرا نیوز چینل چھوٹا ہے۔“ شبیر ہمدانی غصے میں آتے ہوئے بولے، تو نیوز ایڈیٹر نے اپنی زبان دانتوں تلے دالی تھی اب انہیں اپنی غلطی کا احساس ہو رہا تھا کہ سچ کے چکر میں کیا بول گئے، وہ تو بھلا ہوا کہ شبیر ہمدانی کے موبائل کی بیپ بجنے لگی اور نیوز ایڈیٹر صاحب کی نوکری جاتے جاتے رہ گئی۔

”ہیلو عباد کیسے ہو؟“ شبیر ہمدانی نے موبائل آن کرتے ہوئے کہا۔

”کیا؟ کیا کہہ رہے ہو؟ او مائی گاڈ!“ جانے دوسری جانب انہیں ایسا کیا کہا گیا تھا کہ شبیر ہمدانی کا لہجہ، انداز اور چہرے کا تاثر تک یکسر تبدیل ہو گیا تھا، نیوز ایڈیٹر اور پروڈیوسر حیرانگی سے انہیں دیکھ رہے تھے، وہ اتنے شاکڈ کیوں تھے؟ دونوں کے ذہنوں میں یہ سوال تھا۔

”حرام زادے، درندے، شیطان کے چیلے، میرے ملک کے بچوں کو مار رہے ہیں، میرے حماد کو بھی مار ڈالا ان ظالموں نے۔“ شبیر

ہمدانی سوبائل میز پر بیٹھتے ہوئے غصے سے بولے۔

”آپ کا حماد..... سر؟“ وہ دونوں یک زبان ہو کر بولے تو صدے اور غصے سے شبیر ہمدانی نے کہا۔

”ہاں حماد میرا بھانجا حماد میرا لاڈلا اور ذہین بچہ مار دیا ظالموں نے، آٹھ گولیاں لگی ہیں اسے اس کے سر اور سینے میں، آٹھ گولیاں ماری ہیں ان شیطانوں نے۔“

”اوہ..... اللہ..... اللہ صبر دے سر آپ کو، سارے والدین کو اللہ صبر جمیل عطا کرے جن کے پھول مسل دیئے گئے۔“ ضیغم عباس نے دکھ بھری آہ کے ساتھ کہا۔

”انا للہ وانا الیہ راجعون۔“ نیوز ایڈیٹر نے دکھ اور تاسف سے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”یہ عمران بچوں کی اس دنیا سے جانے کی نہیں تھی یہ ظلم ان شیطانوں کو بہت مہنگا پڑے گا، جہنم میں جلیں گے وہ دہشت گرد، میرے بچوں کے ساتھ یہ ظلم کرانے والے میرے ہاتھ آ جائیں تو اس طرح تل تل کے ماروں گا کمینوں کو، یہ کیا اگر پکڑ گئے تو پھانسی پہ لٹکا دیا اور کھیل ختم، ہم سے اڑا دیا تو چند لمحوں میں سب کچرا، ان شیطانوں کو تو چورا ہے یہ لٹکا دینا چاہیے اور عوام انہیں سزا دیں، پتھر ماریں، یا زندہ جلا دیں، تاکہ یہ لوگ بھی اس تکلیف سے تڑپیں جو یہ ہمارے ہم وطنوں کو ہمارے بچوں کو دیتے آرہے ہیں، ہم نے اگر ایسا نہ کیا تو یہ اسی طرح ہم پہ حاوی ہوتے رہیں گے ہمیں ختم کرتے رہیں گے۔“

”ٹھیک کہہ رہے ہیں سر آپ۔“ وہ دونوں ایک ساتھ بولے۔

”سمیع کو بلاؤ اس سے کہو پشاور پہنچے فوراً اس واقعے کی پوری طرح کور کرے، جب تک

اسکول دوبارہ نہیں کھل جاتا اسے وہاں کی پل پل کی رپورٹنگ کرنی ہے۔“ شبیر ہمدانی غصے، صدے اور جوش سے بھرپور لہجے میں بول رہے تھے۔

”جس تن لاگے وہ تن جانے۔“

”جب انسان کے اپنے دل پر چوٹ پڑتی ہے تب ہی اسے دوسرے کے درد اور تکلیف کا احساس ہوتا ہے، شبیر صاحب کو بھی اپنی لاڈلی بہن کے دکھ نے احساس دلایا ہے کہ دوسرے والدین کی دکھ بھری قیامت سے گزر رہے ہیں۔“ نیوز ایڈیٹر نے مدھم آواز میں کہا تو ضیغم عباس ان کے ساتھ چلتے ہوئے نیوز روم کی طرف چلتے ہوئے بولے۔

”صحیح کہا آپ نے اور یہ دکھ تو پوری قوم کا دکھ ہے، بچے تو سب کے سانچے ہوتے ہیں، شہید ہونے والے بچے ہم سب کے بچے تھے، پوری قوم کے بچے تھے۔“

”ہوں چلیں سمیع بھی آرہا ہے ایس ایم ایس کر دیا ہے میں نے اسے کہ بگ باس کے دل میں درد کا احساس جاگ گیا ہے اور وہ اسے بلا رہے ہیں لوٹ آئے اور اپنی ڈیوٹی سنبھالے۔“

”بالکل یہ وقت ویسے اختلافات میں پڑنے کا نہیں ہے بلکہ ایک ہو اس سانچے پر متحد ہونے اور دشمن کو بتانے کا وقت ہے کہ ہم ایک ہیں اور ہمیں کسی دشمن کی گھناؤنی چال کبھی ٹوٹنے بکھرنے نہیں دے گی۔“

”انشاء اللہ۔“ نیوز ایڈیٹر نے دل سے کہا اور دونوں اپنی اپنی سیٹ پر چلے گئے۔

☆☆☆

سترہ دسمبر سانچے کا دوسرا دن تھا اور ایک سو بیالیس پھولوں کو زمین کے سپرد کر دیا گیا تھا، جن پھولوں کے ہونے سے ان کے والدین کے

آنگن مہکتے رہتے تھے، جہاں ان کی ہنسی، شرارتیں اور معصوم آوازیں گونجا کرتی تھیں، آج ان گھروں، آنگنوں میں صرف روتے بلکتے ماں باپ اور دیگر عزیز واقارب تڑپتے بلکتے دکھائی دے رہے تھے کسی میں تاب نہ تھی اس سانحے کو بیان کرنے کی ماؤں کے بین دیکھے جاتے تھے، نہ ان کی آپس اور سسکیاں سنی جاسکتی تھیں، پتھر بھی یہ مناظر دیکھنے سے قاصر تھے۔

کسی نے کہا وہ بدلہ لینے آئے تھے، کیا بدلہ؟ اور معصوم بچوں اور عورتوں سے بھلا کون بدلہ لیا کرتا ہے یہ تو پختون روایات کے بھی خلاف ہے اور انسانیت کے بھی منافی ہے، وہ خود کو مسلمان بھی کہلاتے تھے اور نعرہ تکبیر لگا کر بچوں کو مارتے جاتے تھے، کوئی ذی ہوش ایسے شیطانوں کو انسان اور مسلمان کہہ سکتا ہے، بدلہ اور انتقام ایک مسلمان کی خونیں ہے، بچوں کی جانیں لے کر وہ اپنے کون سے جذبے کی تسکین کرتے رہے؟ سکون کا ایسا کون سا مرحلہ تھا جو انہوں نے یہ ستم ڈھا کے طے کیا ہے؟ وہ یہ سمجھتے تھے کہ صرف وہ مسلمان ہیں، زمین پہ ان کا ماتھا ٹیکنا ان کے مسلمان ہونے کی دلیل ہے ان کا سجدہ سجدہ کہلایا باقی سب مار دیئے جانے کے لائق ہیں، وہ صرف انسان اور اسلام دشمن تھے، پاکستان کے دشمن تھے، جو اس پاک سرزمین پر امن و آسوش کی فضا دیکھنا نہیں چاہتے اور ہمارے آپس کے جھگڑوں، اختلافات اور سیاسی چپقلش کا فائدہ ہمارے دشمن اٹھا رہے ہیں، ہم اندر سے کمزور ہوتے جا رہے ہیں اسی لئے ہمارا دشمن طاقتور اور مزید شاطر اور گھناؤنا ہوتا جا رہا ہے، یاد رکھیں قومی حادثے، سانحے بھلا دینے کے لئے نہیں ہوتے سبق سیکھنے اور بہتر حکمت عملی اپنانے کے لئے ہوتے ہیں، صوبائی، گروہی لسانی

تعلقات فرقہ واریت نے ہمارے ملک کو تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کیا ہے، ہماری برداشت ختم ہو گئی ہے ہمارا ظرف اتنا چھوٹا ہو گیا ہے کہ ہم اپنے سوا ہر کسی کو چھوٹا کھوٹا برا اور جھوٹا سمجھنے لگے ہیں، ہماری نظر میں صرف ہم اچھے اور سچے مسلمان ہیں باقی سب کافر ہیں، کتنے افسوس اور شرم کی بات ہے نا کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو کافر سمجھتا اور کہتا ہے جبکہ یہ کافر اور غیر مسلم ہی ہیں جو ہمیں مسلمان کہتے ہیں۔

ذرا سوچئے کہیں ہم ایک دوسرے کو اپنے ایمان کا امتحان دیتے دیتے اس ملک کو اس کے بچوں کو مزید کسی سولہ دسمبر کی طرف تو نہیں دھکیل رہے؟ قائد اعظم کے فرمائے ہوئے بہترین اصول۔

تنظیم، اتحاد، ایمان، ہم نے کب کہاں کس راستے پر چلتے ہوئے کھودئے، پتال گائیے اس سے پہلے کہ ہم راستہ ہی بھول جائیں، منزل سے بھٹک جائیں، اس سے پہلے کہ بہت دیر ہو جائے اس سے پہلے کہ ہمارا دشمن ایک اور گھناؤنی سازش تیار کرے، دشمن کو منہ توڑ جواب دینے کے لئے ہمیں اپنے ہاتھ مضبوط کرنا ہو گا، خدا را خود کو پہچانیئے، اپنے دشمن کو پہچانیئے جو ہمارے بیچ فرقہ پرستی، ملک، زبان، مذہب و صوبے کی بنیاد پر نفاق پیدا کر رہا ہے، ہماری جڑوں میں نفرت کے بیج بو رہا ہے، نفرت کے یہ بیج اپنی جڑوں سے نکال پھینکیں اس سے پہلے کہ بہت دیر ہو جائے اور یہ بیج تناور درخت بن کر ہمیں ہماری آنے والی نسلوں کو نفرت کی آگ میں جھلسا کر رکھ دیں۔

کیمبرہ مین اسد بخاری کے ساتھ نیوز اینکر سمیع الدین بیج لی وی کراچی۔

کیمبرہ کلوز ہو گیا اور سمیع نے آرمی پبلک اسکول کی جانب گہری اور دکھ بھری نظروں سے

دیکھا اور طویل سانس لبوں سے خارج کیا۔

☆☆☆

سرم نے پونہی بے خیالی میں ٹی وی کا ریموٹ اٹھایا اور ٹی وی آن کر دیا۔
ٹی وی پر مخصوص نیوز ٹیون بجنے لگی، بڑی سی فلیش کے ساتھ اسکرین پر لکھا ہوا آیا۔
”بریکنگ نیوز۔“

”نمرہ! بریکنگ نیوز آرہی ہے۔“ سرم نے تڑپتے دل کے ساتھ نمرہ کو آواز دے کر کہا۔
”کتنی بار منع کیا ہے آپ کو کہ صبح صبح نیوز مت لگایا کریں یہ لوگ بریکنگ نیوز سنا کر ہمارا ہارٹ فیل کرادیں گے، ان کے پاس صرف ہارٹ بریکنگ نیوز ہی ہوتی ہیں۔“ نمرہ اجاڑ صورت، میلے، شکن آلود کپڑوں اور الجھے بالوں میں بیٹے کی جدائی میں نڈھال بے حال اور کمزور دکھائی دے رہی تھی، سرم کے اس آکر کہنے لگی تو وہ لب بھینچے اپنے آنسو ضبط کرتا ٹی وی پر آنے والی اس بریکنگ نیوز کی جانب متوجہ ہوا۔

”آرمی سیلک اسکول پشاور“ سولہ دسمبر کے المناک اور دل شکن سانحے کے صرف چھ روز بعد پھر سے کھول دیا گیا ہے اسکول کی ائمبلی میں چیف آف آرمی اسٹاف نے بھی شرکت کی اور اسکول کے طلباء بڑی تعداد میں حصول علم کے لئے حاضر ہوئے، معصوم بچوں کے چہرے اس سانحے میں اپنے ساتھیوں کی شہادت اور انہیں ہمیشہ کے لئے کھودینے کے باوجود پر عزم اور ان کے حوصلے جوان تھے، شہید ہونے والے بچوں کے والدین نے بھی بڑی تعداد میں ائمبلی میں شرکت، دکھ، درد، آنسوؤں اور عزم کے ساتھ اسکول میں تعلیم کا دوبارہ آغاز کیا گیا۔

نیوز کا شر بہت جوشلے انداز میں خبر پڑھ رہی تھی، نمرہ حواس باختہ سی ٹی وی کے بالکل

سامنے آکھڑی ہوئی اور اسکرین پر نظر آنے والے بچوں پر ہاتھ پھیرنے لگی، آنسو اس کے رخساروں پر بہہ رہے تھے۔

”نمرہ!“ سرم اٹھ کر اس کے پاس آیا۔
”حمزہ!..... ہم حمزہ کا اسکول کھل گیا ہے سرم، حمزہ بھی اسکول گیا ہے نا، وہ چھٹی ہونے پر گھر آئے گا نا، میرا بیٹا اسکول گیا ہے نا، وہ یہاں کھڑا ہے، دیکھو یہ حمزہ، یہ بھی حمزہ ہے، یہ سب بچے حمزہ ہیں، چھٹی ہونے پر سب بچے اپنے گھروں کو جائیں گے، ہمارا بیٹا ہمارا انتظار کر رہا ہو گا نا، چلیں ہم حمزہ کو اسکول سے لے کر آتے ہیں۔“ نمرہ دیوانوں کی طرح روتے ہوئے ٹی وی اسکرین پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہہ رہی تھی، سرم کا کلیجہ پھٹا جا رہا تھا اس نے نمرہ کو سنبھالتے ہوئے اپنے سینے سے لگالیا اور خود بھی رونے لگا۔
”ہمارا بیٹا تو جنت میں ہے نمرہ، وہ اب کبھی واپس نہیں آئے گا۔“

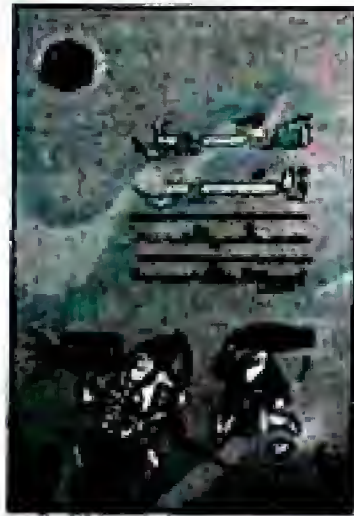
”خدا کا قہر نازل ہوا ان بد بختوں پر جنہوں نے ہمارے معصوم بچوں کو بے دردی سے مار ڈالا ہے۔“ حمزہ کے نانا نے بیٹی اور داماد کی ابتر حالت دیکھ کر روتے ہوئے دعا کی۔

یہ تو وہ دکھ تھا جو آخری سانس تک ساتھ رہنا تھا، دسمبر کا سرد مہینہ اسے نام کی طرح سرمہر ثابت ہوا تھا، زندگی معمول پر آرہی تھی مگر ان کی نہیں جن کے بچے چھن گئے تھے، ان والدین کے لئے تو زندگی وہیں رک گئی تھی جہاں ان کے بچے ان سے جدا ہو گئے، وہ سب بظاہر سانس لے رہے تو تھے مگر جی نہیں پا رہے تھے، ان کی آنکھوں میں اپنے بچوں کی صورت آنسو بن بن کر مگر ان کے دل باقی سب بچوں کی سلامتی کی دعائیں بھی مانگتے تھے، ماؤں کے دل ٹوٹے تھے، حوصلے نہیں، انہیں ہر بچے میں اپنا ہی بچہ نظر آتا

شگفتہ شگفتہ رواں دواں



ابن انشا کے سفر نامے



ابن انشا کی تمام کتابیں

لاہور اکیڈمی

پبلی منزل محمد علی امین میڈیسن مارکیٹ 207 سرکلر روڈ اردو بازار لاہور
فون: 042-37310797, 042-37321690

تھا۔
مجھے یقین ہے
میرے وطن کی
تمام ماؤں کے دل دکھی ہیں
مگر وہ پھر بھی
یہ چاہتی ہیں کہ
ان کی ملت کے سارے بچے اسکول جائیں
پڑھیں، لکھیں اور
وطن میں اونچا مقام پائیں
میرے وطن کی تمام ماؤں
بہت محبت سے سوچتی ہیں
کہ سب ہی بچے
ہیں ان کے بچے
وہ بھی

جو ملک عدم سدھارے
وہ بھی

جو ہیں زندہ اور ماؤں کے پیارے
وہ سارے بچے انہیں کے ہیں اور
وہ ان کے دم سے رہیں گی زندہ
حوصلے سے یہ دکھ سہیں گی
وہ دعائیں کرتی ہی رہیں گی
سدا سلامت رہیں وہ بچے
جو اپنے ماں باپ کی خوشی ہیں
جو اپنے ماں باپ کی
زندگی ہیں

کیمرہ مین ظفر محمود کے ساتھ علینا بخاری سچ
نیوز، ٹی وی کیمرہ بند ہو گیا تھا مگر علینا کی آنکھوں
سے آنسو پھر بھی بہنا شروع ہو گئے تھے، اس
سانچے کا دکھ درد سا نبھاتا تھا اور دشمن کے لئے سب
سے بڑی بریلنگ نیوز یہ تھی کہ اس سانچے نے
پوری قوم کو ایک بار پھر متحد کر دیا تھا یہی دشمن کی
سب سے بڑی ناکامی تھی۔

☆☆☆

زندگی خوبصورت ہے

میشہ دانا:

دو من ظاہر کر رہے تھے، شو فر ریج نے اسے گاڑی کی طرف بڑھتا دیکھ کر تیزی سے پچھلا دروازہ وا کیا اور اس کے بیٹھنے کے بعد دروازہ بند کر کے وہ تیزی سے ڈرائیونگ سیٹ کی طرف آیا تھا، قائد اعظم ایئر پورٹ کا پارکنگ لاٹ دور کہیں پیچھے رہ گیا تھا، گاڑی اب ایئر پورٹ کے راستوں پہ دوڑ رہی تھی، شو فر ریج نے حیرت سے بیک ویو مرر سے پچھلی سٹ کی پشت سے ٹیک

قائد اعظم ایئر پورٹ کے لاؤنج میں اس نے متلاشی نگاہوں سے پارکنگ میں کھڑی سیاہ لینڈ کروزر کو دیکھا اور اس کی طرف بڑھ گئی، سیاہ چار جٹ کی ساڑھی جس کے بلاؤز کی آستین تک قل تھیں، آنکھوں پہ لگے سن گلاسز، سر پہ سیاہ عربی اسٹائل میں اسکارف پہنے نیچرل میک اپ کے ساتھ ڈائمنڈ رنگ اور گلے میں جھولتا ڈائمنڈ کا لاکٹ اسے دور سے ہی ویل اسٹیمپلش بزنس

ناولٹ

لگائے آنکھیں بند کئے بیٹھی ماکن کو دیکھا اس نے بہت کم اس کو فارغ دیکھا تھا، اسے کبھی کبھی حیرت ہوتی تھی، وہ اتنی خاموش اور اپنے کام میں مگن رہتی تھی ریج کو اسے مخاطب کرنے سے پہلے دس بار سوچنا پڑتا تھا مگر آج نہ اس نے اپنا لپ ٹاپ کھولا تھا اور نہ اپنے بڑے سے ہینڈ بیگ میں سے کوئی فائل نکالی تھی، ایئر پورٹ روڈ ختم ہوتے ہی اس نے اسے مخاطب کیا۔
”میم کہاں چلنا ہے؟“

”جسٹ لانگ ڈرائیو۔“ اس نے آنکھیں کھول کے پہلے حیرت سے اسے دیکھا اور یک لفظ ہی جواب دے کر دوبارہ آنکھیں موند لیں کیونکہ۔

یادیں وہ نہیں جوتھائی میں
آئی ہیں
یادیں وہ نہیں جوتھائی میں





آتی ہیں

یادیں تو وہ ہیں جو
بھینر میں بھی

تہا کر جاتی ہیں

اور اس وقت شہر کی مصروف سڑک اور اس
پر ہوتے بے ہنگم شور میں بھی سامعہ حیدر کو اپنا
آپ تہا لگ رہا تھا کیونکہ۔

گاڑی جانے انجانے راستوں پہ دوڑ رہی
تھی جی جی اس نے سیٹ کی پشت سے سر اٹھایا اور
کلائی یہ بندھی نازک سی ڈائمنڈ کے ڈائل والی
رسٹ وایچ میں ٹائم دیکھا پھر ربیع کی طرف دیکھ
کر ”بولی آفس چلو“ اور دوبارہ سیٹ کی پشت سے
ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں، ربیع نے گاڑی
تیزی سے آفس جانے والے راستے پہ گاڑی
ڈال دی تھی۔

وہ جس وقت آفس میں داخل ہوئی تو
سامنے ہی رائیل احسن سے نہ جانے کس بات پر
بحث کر رہی تھی وہ ان دونوں کی نظر انداز کرتی
سیدھی اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی تھی ان
دونوں نے اپنی بحث روک کر بغور اس کو دیکھا تھا
وہ آج ان سے سلام دعا کرنا تو درکنار ان کی
طرف نگاہ اٹھائے بغیر ہی اپنے کمرے میں چلی
گئی تھی حالانکہ یہ سامعہ حیدر کی سرشت میں شامل
نہیں تھا وہ جتنی بھی سہمی ہوئی ہوتی کسی بھی فارن
ڈیلیکشن سے ملاقات کے بعد یا شہر سے واپس
آنے کے بعد نہ صرف خوشدلی سے سلام کرتی
بلکہ سب کا احوال بھی دریافت کرتی تھی لیکن آج
یا تو اسے اپنے ڈیلیکشن میں ناکامی ہوئی تھی یا پھر
وہ کسی اور بات پر شدید ٹینشن کا شکار تھی، وہ
دونوں اپنی بحث کو بھول کر حیرت زدہ انداز میں
ایک ہی بات سوچ رہے تھے، سامعہ نے بھی اپنی
پشت پر ان کی گہری نظروں کو بہت دیر تک محسوس

کیا تھا جی جی اپنے آپ کو کمپوز کرتے ہوئے اس
نے ناب گھما کر دروازہ کھولا، سیٹ پہ بیٹھنے کے
بعد اس نے سامنے ٹیبل پہ رکھے جگ میں سے
پانی بھر کر نکالا اور اسے گھونٹ گھونٹ پی کر اپنے
آپ کو کمپوز کیا اور انٹرکام پہ اس نے رائیل اور
احسن کو اندر آنے کا کہا اور خود سامنے رکھی فائل کو
کھول لیا وہ اپنی کوئی بھی کمزوری ان پہ عیاں نہیں
کرنا چاہتی تھی، یہی وجہ تھی کہ جب رائیل اور
احسن کمرے میں داخل ہوئے تو وہ وہی خول
اپنے اوپر چڑھا چکی تھی جسے دیکھنے کے وہ لوگ
عادی تھے، وہ دونوں خاموشی سے آکر بیٹھ گئے۔

”راہی! پرچے کا کام کہاں تک پہنچا، اگر
پرچے کا تمام فائل ورک کمپلیٹ ہو گیا تو مجھے ابھی
دکھا دو کیونکہ پھر ہو سکتا ہے، اگلے دو دن میں بہت
بڑی ہو جاؤں احمد انڈسٹریز والوں کے ساتھ
میٹنگ بھی اریج کرنی ہے اور نہ جانے کیا کیا
ہے۔“ اس نے سائیڈ درازوں کو بے وجہ کھول کر
بند کیا اور اپنے آپ کو مصروف ظاہر کرنے لگی۔

”سامی! آپ رہنے دیں یہ رائیل کبھی کچھ
نہیں کر سکتی مجھے پتا ہے اس نے فائل پوری نہیں
کی آپ نے خواہ مخواہ اس کو آفس میں رکھا ہوا ہے
ابھی بھی یہ صرف میرا دماغ اس لئے کھا رہی تھی
کہ میں اسے زنگ لاکر دوں۔“ احسن نے رائیل
کے جواب دینے سے پہلے ہی بے وجہ ہانکتی
شروع کر دی وہ سمجھ گیا تھا سامعہ اس وقت ذہنی
طور پر ڈسٹرب ہے اور اپنی ڈسٹرمنس کو چھپانے
کے لئے وہ اپنے آپ کو مصروف ظاہر کر رہی ہے،
جب اس نے اسے اپنے اوپر پردہ ڈالا ہوا تھا تو احسن
نے بھی اس پردہ کو اٹھانا مناسب نہیں سمجھا اور
ادھر ادھر کی بلاوجہ ہانکتی شروع کر دی اور رائیل جو
اس کی مزاج آشنا تھی وہ بھی بھرپور تیاری سے
میدان میں اتر آئی۔

اچھی کتابیں پڑھنے کی عادت ڈالیں

ابن انشاء

135/- اردو کی آخری کتاب

200/- خمار گندم

225/- دنیا گول ہے

200/- آوارہ گرد کی ڈائری

200/- ابن بطوطہ کے تعاقب میں

230/- چلتے ہو تو چین کو چلئے

175/- نگر نگر پھر مسافر

200/- خط انشائی کے

165/- بستی کے اک کوچے میں

165/- چاند نگر

165/- دل وحشی

250/- آپ سے کیا پردہ

ڈاکٹر مولوی عبدالحق

200/- قواعد اردو

60/- انتخاب کلام میر

ڈاکٹر سید عبداللہ

160/- طیف نثر

120/- طیف غزل

120/- طیف اقبال

لاہور اکیڈمی، چوک اردو بازار، لاہور

فون نمبرز: 7321690-7310797

”سامی یہ جھوٹ بول رہا ہے، میں فائل پوری تیار کر چکی ہوں یہ صرف مجھے اس آفس سے نکالنا چاہتا ہے اس لئے آپ سے جھوٹ بول رہا ہے تاکہ آپ کی غیر موجودگی کا فائدہ اٹھا کر لڑکیوں سے نوں پر باتیں کر سکے اسی نے مجھ سے کہا تھا رالی آج سامی کو اپنا فائل ورک مت دکھانا میں تمہیں زنگر کھلاؤں گا۔“ رابی نے منہ بسورتے ہوئے کہا۔

”واللہ آپ کو ہمارے بارے میں کیا الہام ہوتے ہیں یا جیسی۔“ احسن نے مسخرہ پن سے عزلی اشائل اپناتے ہوئے اسے چھیڑا تو وہ حسب توقع تپ گئی۔

”سامی اس سے پوچھیں آج یہ چاہتا کیا ہے؟“ رائیل نے ایک ہاتھ سے فائل سامعہ کے آگے رکھ کر دوسرے ہاتھ سے احسن کے شانے پہ گھونسا دے مارا جسے سامعہ نے دیکھنے کے باوجود نظر انداز کر دیا۔

”تمہیں چاہتا ہوں میری باری ڈول یہ بھی نہیں جانتی تم۔“ احسن نے اس کی طرف جھکتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا جسے سامعہ نے بھی سن لیا لیکن ایک بار پھر نظر انداز کر دیا۔

(رائیل جسے سب پیار سے رابی کہتے تھے احسن کے باری کہنے پر یکدم سرخ پڑ گئی اور ڈھیلی ہو کر وہیں کرسی پہ گر گئی)۔

”احسن تم سدھر جاؤ۔“ سامعہ نے اسے گھر کا تو احسن نے معنی خیز انداز میں رائیل کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”پہلے دنیا والے تو سدھر جائیں۔“
”دنیا والے تو سدھر ہی جائیں گے مگر تم قیامت تک نہ سدھرنا۔“ سامعہ نے زنج ہوتے ہوئے اسے بال پوائنٹ اٹھا کر مارا جو سیدھا احسن کے کاندھے پر لگا۔

”ہا! ہائے اللہ! امی جان میں امریکہ اور اسرائیل کے بیچ پھنس گیا ہوں مجھے ان کے ڈرون حملوں سے بچا لیجئے، ورنہ آپ کے بیٹے نے آج شہید ہو جانا ہے۔“ احسن نے مصنوعی دہائیاں دینی شروع کیں تو سامعہ بے اختیار ہنستی چلی گئی احسن نے بند آنکھوں کے پیچھے سے ہلکا سا جھانک کر اسے دیکھا، جہاں ہنستے ہنستے اس کی آنکھوں میں آنسو آنے لگے تھے جسے اس نے سرعت سے صاف کر لیا تھا۔

”ویسے سامی آپس کی بات ہے آپ کا دل نہیں چاہتا کہ آپ کے بھائی کے سہرے کے پھول کھلیں۔“

”ہاں کیوں نہیں۔“ سامعہ نے نا سمجھی سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

”تو پھر مادام یہ میرے برابر بیٹھی حسینہ کے تمام حقوق مجھے دلوا دیجئے، یقین کریں ساری زندگی دعائیں دوں گا اللہ آپ کو چاند سا دولہا دے، ننھے منے ستاروں کی طرح چمکتے ہوئے ڈھیر سارے بچے دے اور.....“ احسن کی مظلومیت کے ساتھ اس کی بڑی بوڑھی عورتوں کے انداز میں دعائیں شروع ہو چکی تھیں اور اس کے اس طرح بے باکی اور نان اسٹاپ بولنے پر جہاں سامعہ ایک بار پھر ہنستی چلی گئی وہیں رائیل کا رنگ سرخ پڑ گیا، احسن کی باتوں سے جہاں اس کا ڈپریشن دور ہو گیا تھا وہیں اس نے احسن کی منتوں سے ہار کر آخر کار اس کی والدہ ریحانہ آنٹی سے بات کرنے کی ہامی بھری تھی۔

☆☆☆

شام کی سنہری دھوپ یکدم سیاہ بادلوں میں چھپ گئی تھی، دھوپ اور بادلوں کی آنکھ مچولی نے شام کے منظر کو حسین تر بنا دیا تھا، وہ گلاس ونڈو کے پاس کھڑی بادل اور دھوپ کی آنکھ مچولی دیکھ

رہی تھی جب ہی موبائل کی رنگ ٹون نے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کروالی اس نے موبائل اٹھا کے دیکھا احسن کی کال تھی اس نے لیس کا بٹن دبایا تو احسن نان اسٹاپ شروع ہو چکا تھا۔

”سامی یار! آپ نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ آپ مماسے ضرور بات کریں گی آج تو مماسے کا موڈ بھی بہت اچھا ہے مجھ پر واری صدقے جا رہی ہیں اس سے پہلے کہ مماسے طالبان سمجھ کر خود امریکہ بن جائیں، مجھ غریب پر رحم کریں یار آجائیں آواری میں لچ کر آؤں گا۔“ احسن نے اسے لالچ دیا تو وہ بے اختیار مسکرا دی اور اپنے آنے کی رضامندی دے کر کال ڈس کنکٹ کر دی، وہ جس وقت احسن ولا پینچی پورے گھر میں لیڈی گاگا کی آواز گونج رہی تھی، لان میں لگے آم کے درخت پر بیٹھی کوئل کوک رہی تھی جبکہ سامنے ہی لگے بادام کے درخت پر بیٹھی چڑیا چوں چوں کر رہی تھیں، شاہ خاور سیاہ ہوتے بادلوں کے پیچھے اپنی چھب دکھا کر غائب ہو جاتا، سامنے ہی ریحانہ آنٹی بیٹھی ہوئی تھیں، سلام کے بعد وہ ان کے پاس ہی بیٹھ گئی۔

”کیسی طبیعت ہے آنٹی آپ کی آج احسن بھی بتا رہا تھا کہ برسوں آپ کی شوگر ڈاؤن ہو گئی تھی آپ اپنا بالکل بھی خیال نہیں رکھتی ناں۔“ سامعہ نے انہیں خفگی سے دیکھا۔

”نہیں بیٹا، بس یہ احسن تو کچھ زیادہ ہی ہاتھ پیر چھوڑ بیٹھتا ہے۔“ انہوں نے اسے ٹالا۔

”تم سناؤ تمہارا ماہنامہ اور مارکیٹنگ کا کام کیسا چل رہا ہے خوش ہو تم۔“ انہوں نے سامعہ سے پوچھا۔

”جی آنٹی بہت خوش ہوں۔“

”لیکن کتنی کمزور ہو گئی ہو بیٹا اپنا خیال رکھا کرو۔“ ان کے لہجے میں ماؤں کی سی فکر تھی ان

کے انداز پہ سامعہ کی آنکھوں کے فرش گیلے ہونے لگے تھے جسے اس نے سرعت سے سمیٹ لیا تھا۔
”ارے نہیں آنٹی ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ جیسی اسے سامنے سے رائیل اور احسن آتے دکھائی دیئے احسن ٹرائی گھسیٹ کر لا رہا تھا۔

”ہائے سامی!“ رائیل نے اس سے ہیلو ہائے کرتے ہوئے گرم جوشی سے اس کا گال چوما تو احسن اور آنٹی کے سامنے محبت کے اس مظاہرے پر وہ جھینپ کر رہ گئی، رائیل نیچے گھاس پر بیٹھ گئی جبکہ احسن ریحانہ بیگم کے برابر والی کرسی پر بیٹھ چکا تھا، رائیل اب گھاس پر بیٹھی ان لوگوں کو چیزیں سرو کر رہی تھی جیسی احسن کے بے تالی سے اشارہ کرنے پر سامعہ نے مسکراہٹ چھپائی پھر ریحانہ بیگم سے سنے لگی۔

”آنٹی اب تو آپ احسن کی شادی کر ہی دیں اب تو ان دونوں کی منگنی کو بھی کافی ٹائم ہو چکا ہے تھوڑا رونق ہو جائے گی گھر میں پھر آفس میں احسن کو بھی بے فکری ہو جائے گی ورنہ آفس میں بھی اس کا ذہن آپ میں ہی انکار رہتا ہے۔“ سامعہ نے کچھ جھوٹ سچ کی آمیزش کرتے ہوئے انہیں راغب کرنا چاہا۔

”ہاں میں بھی سوچ رہی ہوں اگلے ماہ کی ڈیٹ رکھ لوں کیونکہ آفاق بھی بتا رہا تھا کہ اس کے سمسٹر ختم ہو جائیں تو پھر شاید وہ بھی چکر لگائے اور پھر اس کے فرض سے فارغ ہو کر میں اپنی بیٹی کے لئے بھی اچھا سادہ لہا ڈھونڈ ونگی بیٹی ماں کو کچھ نہیں سمجھتی تو کیا ہوا ماں تو اسے بیٹی ہی سمجھتی ہے ہاں۔“ ریحانہ بیگم نے تفصیلی جواب دیتے ہوئے خفگی کے ساتھ اس کے متعلق اپنے ارادے اور خیالات سے آگاہ کیا تو وہ جو مطمئن ہو کر احسن کے لئے راہ ہموار کر رہی تھی اپنے بارے میں ان

کے منہ سے خیالات سن کر اس کے لب خاموش وہ گئے وہ ان کی محبت پر شک نہیں کر سکتی تھی لیکن ان کو رضامندی دینے میں بھی تاہل کا شکار تھی احسن نے رائیل کے ساتھ سامعہ کو بھی اٹھنے کا اشارہ کیا جسے اس نے سرعت سے نظر انداز کر دیا، سامعہ ریحانہ بیگم سے جان بوجھ کر مارکیٹنگ پہ باتیں کرنے لگی تھی اور اس کو جان بوجھ کر موضوع بدلتے دیکھ کر احسن پیر پختا ہوا وہاں سے چلا گیا، ریحانہ بیگم نے اس کے پیر پختے کو حیرت سے دیکھا تھا، لیکن سامعہ جانتی تھی کہ یہ صرف وقتی دکھاوا ہے ورنہ اندر تو وہ بھنگڑے ڈال رہا ہوگا۔

☆☆☆

ریحانہ سکندر ایک مشہور ماہنامہ کی چیف ایڈیٹر تھیں، ان کے شریک حیات احسن کی پیدائش پر وفات پا چکے تھے، ان کی دو اولادیں تھیں بڑا آفاق سکندر جو اس وقت اسپیشلائزن کے لئے لندن گیا ہوا تھا اور دوسرا احسن سکندر جو آج کل ان کا ماہنامہ میں بیک وقت کئی کام سر انجام دے رہا تھا، رائیل ان کی بہن کی بیٹی تھی جس کو وہ اپنی بہن کی وفات اور بہنوئی کے دوسری شادی کر لینے کے بعد اپنے گھر لے آئی تھیں، سامعہ حیدر ان کے ماہنامہ میں سب ایڈیٹر کی پوسٹ پر کام کر رہی تھی لیکن وہ ان کی صرف ایک ایمپلائی نہیں تھی بلکہ وہ اسے بیٹیوں کی طرح ہی چاہتی تھیں یہی وجہ تھی کہ سامعہ حیدر بھی ان کو ماں کا درجہ دیتی تھی، احسن اس سے بھائیوں والے لاڈ اٹھواتا تو اس کے بہنوں والے نخرے بھی برداشت کرتا تھا یہی وجہ تھی کہ جب احسن کی آنکھوں میں رائیل کی محبت کے جگنو جمنے لگے اور رائیل کی پلکیں احسن کے نام پر جھکنے لگیں تو یہ سامعہ حیدر ہی تھی جس نے ریحانہ بیگم کو راضی کر کے ان دونوں کو ایک بندھن میں بندھوا دیا

تھا، لیکن وہ خود کو بھی ایک بے نام بندھن میں بندھا محسوس کرنے لگی تھی اور وہ بندھن تھا آفاق سکندر کے نام کا لیکن شاید وہ انجان تھا یا پھر وہ انجان تھی کہ آفاق سکندر اس کی محبت سے انجان ہے جبکہ حقیقت تو یہ تھی کہ آشنائی رکھنے کے باوجود دونوں انجان بنے ہوئے تھے لیکن وہ دونوں ہی یہ بات نہیں جانتے تھے کہ اس جاننے نہ جاننے کے چکر میں ایک تیسرا فریق بھی ہے جو اس بھید سے کچھ کچھ آگاہ ہونے لگا ہے۔

☆☆☆

احسن کی شادی کا ہنگامہ سرد پڑ چکا تھا وہ جس وقت آفس آئی کاموں کا ایک انبار جمع ہو چکا تھا، رائیل آفس چھوڑ چکی تھی اس کی سیٹ کے لئے کوئی ایمپلائمنٹ نہیں مل رہا تھا، احسن کی سرگرمیاں بھی آج کل پراسرار ہو گئی تھیں وہ اس سے پوچھتی لیکن وہ ٹال دیتا ایک آدھ مرتبہ پوچھنے پر جب اس نے تسلی بخش جواب نہیں دیا تو سامعہ کو گریدنا بھی اچھا نہیں لگا، اس دن بھی وہ احسن کو بتا کر میٹنگ اور لنچ کا کہہ کر نکلی تھی اس نے احسن کو بھی ساتھ چلنے کی آفر کی لیکن اس نے انکار کر دیا وہ جس وقت باہر نکلی اسے یاد آیا موبائل تو وہ اپنی ٹیبل پر ہی بھول آئی اس نے بیگ اتار کر احسن کی ٹیبل پر رکھا اور اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر چلی گئی اس کے جانے کے بعد احسن نے اس کے بیگ کی پاکٹ میں ہاتھ ڈالا تو چابیوں کا ایک گھچا اس کے ہاتھ میں آ گیا اس نے تیزی سے اسے جینز کی پاکٹ میں منتقل کر دیا سامعہ کچھ دیر بعد باہر نکلی تو احسن سامنے رکھی فائل پہ جھک گیا۔

”احسن تم آفس وغیرہ لاک کر کے نکلنا کیونکہ ہو سکتا ہے مجھے در ہو جائے اور اگر دیر ہو گئی تو پھر میں وہیں سے گھر چلی جاؤں گی ٹھیک

ہے۔“

”جی ٹھیک ہے۔“ احسن نے اسے بغور دیکھا تو وہ اس کے اس طرح دیکھنے پر چونک گئی،

”احسن کیا ہوا! تم ایسے کیوں دیکھ رہے ہو کیا رابی سے لڑائی ہوئی ہے۔“ اس نے احسن کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر فکر مندی سے کہا تو احسن نے بغور دیکھا اس کے لہجے اور انداز میں وہی مخصوص بہنوں والی محبت تھی جو بھائیوں کی ہلکی سی تکلیف پر بھی جان قربان کر دیتی ہیں۔

”نہیں سامی ایسی کوئی بات نہیں۔“ اس نے اسے ٹالنا چاہا تو سامعہ دوبارہ بول پڑی اور جب وہ دوبارہ بولی تو اس کے لہجے میں آنسوؤں کی نمی تھی۔

”تم بہت بدل گئے ہو احسن میں تو تمہیں ہمیشہ اپنا بھائی سمجھتی تھی لیکن تم شاید مجھے اپنی بہن نہیں سمجھتے، جیسی تو مجھ سے ہر بات چھپانے لگے ہو۔“ اس نے آخر کار شکوہ کر ہی دیا۔

”نہیں سامی ایسی کوئی بات نہیں ہے آپ کل بھی میری بہن تھیں اور آج بھی میری بہن ہیں اور یہ ایک بھائی کا وعدہ ہے کہ وہ اپنی بہن کو ہر خوشی دے گا، بس آپ خوشیوں سے ڈرنا اور منہ موڑنا چھوڑ دیں۔“ احسن نے اس کے کاندھے پہ بازو پھیلا کے اسے اپنے بھائی ہونے کا مان بخشا تو سامعہ نے بھی آنکھوں کے گیلے ہوتے فرش کو سرعت سے سمیٹ لیا لیکن احسن دیکھ چکا تھا وہ تیزی سے وہاں سے نکلتی چلی گئی، اس کے جانے کے بعد احسن نے تمام فائلز سمیٹ کر لاک کر لیں اور پورے آفس میں نگاہ دوڑائی گو کہ اسٹاف بہت مختصر تھا لیکن وہ سب لوگ بھی اس وقت اپنے اپنے کاموں میں مگن تھے، لیکن احسن رسک نہیں لینا چاہتا تھا اسے آج یہ ٹاسک ہر حال

میں کھیلنا تھا سو وہ لٹچ ٹائم کا انتظار کرنے لگا جس میں تھوڑی ہی دیر باقی تھی اور لٹچ ٹائم ہونے پر اس نے پورے اشاف کو چھٹی اناؤنس کر دی، تھوڑی ہی دیر میں سب لوگ خوشی خوشی اپنے گھروں کی طرف چل دیے اس نے مین گیٹ کو لاک کیا اور خود سامعہ کے کمرے میں آ گیا ویل ڈیکورٹیڈ وہ کمرہ سامعہ حیدر کی اعلیٰ ذوقی کا منہ بولتا ثبوت تھا، احسن نے جیب سے چابیاں نکال کر تیزی سے ٹیبل کی دراز میں لگانی شروع کی تو دوسری چابی پر ہی وہ کھڑچ کی آواز سے کھل گیا، دراز کے اندر رکھی گلابی ڈائری نے اسے مسکرا کر دیکھا گویا احسن کی جاسوسی پر اسے کامیابی کی مبارکباد دے رہی ہو، احسن نے وہ گلابی ڈائری نکال کر دراز واپس لاک کی اور کرسی سے ٹیک لگا کر آرام سے بیٹھ گیا، اشاف کو وہ پہلے ہی فارغ کر چکا تھا سو اب وہ آرام سے سامعہ حیدر کو دریافت کر رہا تھا کیونکہ اتنا تو وہ جان گیا تھا کہ سامعہ حیدر وہ نہیں جو وہ نظر آتی ہے۔

☆☆☆

”18 مارچ 2010ء آج میرا جاب کا پہلا دن تھا میں بہت خوش ہوں، اپنی کمائی کا خواب جو آج پورا ہو گیا ہے، آج ہر چیز اجلی روشن اور چمکدار لگ رہی ہے میں آج خدا کے حضور جتنا بھی شکر ادا کروں کم ہے، آج امی جان کے انتقال کو بھی پورا ایک سال ہو گیا ہے اور یہ ایک سال میری زندگی کے بیس سالوں سے زیادہ لوگوں کے چہرے کو پڑھنا، نظروں کا میٹھا تیکھا پن و لہجوں کی تلخیاں اور نہ جانے کتنے بے شمار چیزوں سے آگاہی دے گیا ہے، زندگی کبھی اتنی سچ اور آزرده نہیں لگی تھی جتنی اس ایک سال میں لگنے لگی، لیکن میں آج بہت خوش ہوں اور ان سچ باتوں اور یادوں کو بالکل بھی نہیں سوچنا چاہتی

مجھے ایک ماہنامہ میں اکاؤنٹ اسٹنٹ کے طور پر اپائنٹ کر لیا گیا ہے کام نہ بہت زیادہ ہے نہ بہت کم لیکن خیر میں کام سے گھبرانے والی نہیں ہوں کیونکہ یہ جاب میرے لئے قارون کے خزانے سے کم تو نہیں ہے بس ایک ہی خواہش ہے کہ اپنی محنت اور دیانت داری سے ایک مقام پاسکوں اور مجھے کچھ نہیں چاہیے، اچھا اب رات بہت ہو گئی ہے صبح جلدی بھی اٹھنا ہوتا ہے۔“

”25 مارچ 2010ء زندگی بہت

خوبصورت ہے اس بات کا مجھے ہر پل احساس ہونے لگا ہے، آفس آنے جانے کے بعد تو یہ زندگی اور بھی خوبصورت لگنے لگی ہے، حالانکہ اتنی ٹف روٹین کے بعد کوئی مجھے شاید پاگل کہے مجھے خوبصورت زندگی کہنے پر لیکن خیر مجھے اب اس لفظ سے کوئی تکلیف نہیں، صبح فجر کی نماز کے ساتھ اٹھ کر گھر کے دیگر کام نپٹا کر میں دو گھنٹے پڑھائی کرتی ہوں کیونکہ مارکیٹنگ میری زندگی کا سب سے بڑا خواب ہے اور انشاء اللہ مارکیٹنگ کی دنیا میں نام ضرور بناؤں گی، دس بجے تک آفس روانہ ہوتی ہوں پھر اور فائلیں مجھے ہر فکر اور بوجھ سے آزاد کر دیتی ہیں میں جلد از جلد کام نپٹا کر سکون سے اپنی سوچوں کو قلم کے حوالے کر دیتی ہوں قلم سے رشتہ گو کہ پرانا ہو چکا ہے مگر شکر ہے ٹوٹا نہیں اور اب تو مجھے اپنا ناول جلد از جلد پورا کرنا ہے کیونکہ اب میرا ایک اور خواب اس کو کتابی شکل میں لے کے آنے کا بھی تو پورا ہو جائے گا، آج میں اس بات پر ایمان لائی ہوں کہ زندگی بے شک خوبصورت ہے اور اس کو خوبصورت بنانے میں ریحانہ سکندر جیسے لوگوں کا بھی ہاتھ ہے۔“

”18 مارچ 2011ء وقت کتنی جلدی گزر جاتا ہے کسی گھونسلے سے اڑتے پرندے کی طرح آج مجھے اس جاب پر پورا ایک سال ہو گیا ہے،

ڈیئر ڈائری تم بھی کہتی ہوں گی کہ سامعہ حیدر تو تمہیں بھول گئی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ سامعہ حیدر تمہیں بھولی نہیں بلکہ اپنے آپ کو منوار ہی ہے، میری زندگی کا سب سے بڑا خواب صرف اپنا آپ منوانا ہے کہ میری ذات بھی اہم ہے اور کسی اور کے لئے نہیں بلکہ صرف میرے لئے اور جب زندگی نے مجھے میری خوابوں کی تعبیر عطا کی تو وہ آسمانی چیز بھی مجھے ودیعت کر دی گئی جسے ہم محبت کہتے ہیں، ظلیل جبران کہتا ہے، محبت صنوبر کے درختوں کی طرح دل سے شاخ در شاخ پھوٹی ہے کچھ روز بعد وہاں سے ایک نئی کوئیل پھوٹی ہے سو میرے لئے محبت صنوبر کے درخت کی کہانی ہے، میری زندگی بھی صنوبر کے درخت کی طرح بدلنے لگی ہے، وہ بہت خوبصورت نہیں تھا جتنا خوبصورت اس کا کردار تھا وہ کبھی کبھی وہاں آتا تھا اور نہ جانے کیوں صرف ایک نظر دیکھ لینے کے بعد ہی میں سیراب ہو جاتی ہوں وہ سیدھا میڈیم ریحانہ سکندر کے کمرے میں بغیر کسی سے نظریں ملائے اور بات کیے چلا جاتا تھا لیکن آہستہ آہستہ ہم دونوں میں سلام دعا بڑھی اور پھر نوبت ہلکی پھلکی بات چیت تک آ گئی لیکن میں اس سے زیادہ بات نہیں کرتی کیونکہ میں اپنی حیثیت سے آگاہ ہوں کیونکہ آفاق سکندر اس ماہنامہ کے مالکان میں سے تھا اور میں ایک ادنیٰ سی ورکر تھی دل کی کھلتی خواہش اور بدلتی نظروں پر میں نے آفس چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا کیونکہ جو عزت اور محبت میں نے یہاں کمائی تھی وہ میں دل کی خواہش کو پورا کرنے کے لئے ضائع نہیں کر سکتی تھی۔“

”16 جولائی 2011ء آج میرا جاب کا آخری دن تھا اور آفاق کو جب سے پتا چلا تھا کہ میں آفس چھوڑ رہی ہوں وہ مجھ سے ناراض ہو گیا

اس کی ناراضگی سہنا بھی آسان نہیں تھا لیکن میں مجبور تھی، ریحانہ سکندر کے مجھ پر اتنے احسانات تھے وہ بھی مجھ سے آفس چھوڑنے پر ناراض ہو رہی تھیں لیکن میں نے ان کو منالیا تھا اس وعدے پر کہ میں ان کے پرچے کے لئے لکھنا نہیں چھوڑوں گی اور ساتھ ہی میں نے ان کو جب اپنے نئے مارکیٹنگ کے بزنس کا شروع ہونے کی خبر دی تو وہ بہت خوش ہوئی اور دعاؤں کے ساتھ انہوں نے مجھے رخصت کیا تھا، میرے آفس چھوڑنے کے بعد مجھے پتا چلا تھا کہ وہ لندن چلا گیا ہے اپنی اسٹڈی کاپلیٹ کرنے، ڈاکٹر بننا اس کا شوق اور اسپیشلائز اس کا جنون تھی اس کے جانے کے چھ ماہ بعد جب ریحانہ سکندر کو پہلا ہارٹ اٹیک ہوا تو اس وقت احسن صرف بیس سال کا تھا کاروبار کی سمجھ بوجھ نہ ہونے کی بنا پر میں آج چھ ماہ بعد پھر دوبارہ اسی ماہنامہ میں بطور ایڈیٹر مقرر ہو گئی ہوں اور میں ان کے حکم پر ایک لفظ بھی نہ کہہ سکی تھی وہ میری محسنہ تھیں انہوں نے مجھے اس وقت سہارا دیا جب میں کچھ نہ تھی ڈیئر ڈائری تم بھی میری دوست ہونے کے ساتھ بہت اچھی محسنہ ہو اچھا اب رات بہت ہو گئی ہے سو گڈ نائٹ۔“

”26 ستمبر 2015ء آج کا ایک طویل عرصے بعد میں نے اسے احسن کی مہندی میں دیکھا ہے اور آج پانچ سال گزر جانے کے بعد بھی اسے دیکھ کر دل کی دھڑکن نجانے کیوں رکنے لگی تھی لیکن یہ ماننا ویسا نہ تھا نہ ہی اس کی آنکھوں میں وہ رنگ تھے شاید وہ مجھے بھول گیا تھا یا پھر شاید اس کی ترجیحات بدل گئی تھیں لیکن مجھے اس کے بدلنے کا اتنا دکھ نہیں ہے جتنا احسن کے بدلنے کا ہی مجھے لگتا ہے احسن ابھی بدلنے لگا ہے پہلے وہ مجھے اپنی بہن سمجھتا تھا لیکن اب شاید بھائی

کے آجانے کے بعد اسے میری ضرورت نہیں رہی اس لئے میں نے سوچا ہے کہ اب جلد از جلد کلشن والا آفس ری نیو کروا کر اپنا بزنس وہیں سیٹ کر لوں کیونکہ اب احسن اتنا تو سمجھدار ہو ہی گیا ہے کہ وہ ماہنامہ کی ذمہ داریاں سنبھال سکے آخری بار جو ڈائری لکھی گئی تھی وہ احسن کی شادی کے دن تھی جو ایک ماہ پہلے کی تھی اس کے بعد کیا ہوا تھا وہ ڈائری لکھنا بھول گئی تھی یا اس کو اپنی رازداں سے باتیں کرنے کا موقعہ نہیں ملا تھا۔ احسن حیرت زدہ سا ساکت بیٹھا تھا یعنی سامعہ حیدر، آفاق سکندر سے محبت کرتی تھی لیکن اس بات کا اظہار تو دور کی بات وہ اس بات کو قبول کرنے میں بھی تامل کا شکار تھی احسن نے کلائی پہ بندھی گھڑی کو دیکھا رات کے آٹھ بج رہے تھے وہ ڈائری پڑھنے اور سامعہ حیدر کو جاننے میں اتنا لگن ہوا کہ اسے وقت گزرنے کا بھی پتا نہیں چلا تھا اس نے موبائل دیکھا رائیل کی چارمسڈ کالز اور ان گنت میسجز آچکے تھے، اس نے ٹیبل پر سے گاڑی کی چابیاں اٹھائیں اور باہر کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆

سیاہ کارتول سڑک پہ پھیلی چاند کی نرم کرنیں بادلوں کے پیچھے اپنی چھب دکھا کر چھپنے لگی تھیں ہوائیں جھوم جھوم کر چوں سے تالیاں بجانے لگی تھیں، سیاہ لینڈ کروں تیزی سے سڑک پہ بھاگ رہی تھی، تھوڑی دیر بعد لینڈ کروں احسن ولا میں داخل ہو گئی، احسن نے ابھی اپنی طرف کا دروازہ کھولا تھا سامنے سے رائیل آتی دکھائی دی۔

”کہاں رہ گئے تھے نہ کوئی میسج نہ کال اور نہ تم ریپلائی کر رہے تھے۔“ رائیل پریشانی سے بولتی اس کے ساتھ لاؤنج کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی، احسن نے آستین کے کف اوپر کرتے ہوئے کہا۔

”ہاں بڑی تھا میں یہ بتاؤ، بھیا جان کہاں ہیں۔“

”وہ اپنے کمرے میں ہیں طبیعت بھی کچھ ٹھیک نہیں ہے شاید۔“ وہ رائیل کو چائے کا کہہ کر خود آفاق سکندر کے کمرے کی طرف بڑھ گیا، اس نے ناب گھما کر دروازہ کھولا، کمرہ نیم تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا، وہ سینے پہ ڈائری رکھے آنکھیں بند کیے کسی گہری سوچ میں گم لگ رہے تھے احسن نے قریب جا کر دیکھا تو وہ گہری نیند کی دادیوں میں اترے ہوئے تھے، اس نے مسکرا کر انہیں دیکھا اور نفی میں سر ہلایا سینے پہ رکھی ڈائری اٹھا کر اس نے کرسی سے لنگتی شال ان کے گرد اچھی طرح پھیلا دی اور جونہی مڑا تو ہاتھ میں موجود ڈائری میں سے ایک تصویر نکل کر گر پڑی اس نے تصویر اٹھا کر دیکھا گلابی دوپٹے کے ہالے میں ستاروں کی مانند چمکتی لیکن اداس آنکھوں میں بھی وہ بہت پیاری لگ رہی تھی وہ اس تصویر والی کو اچھی طرح جانتا تھا وہ کوئی اور نہیں بلکہ سامعہ حیدر تھی، تصویر کی پشت پر لکھی خوبصورت لفظ کو پڑھ کر احسن بے ساختہ مسکرا دیا۔

چلو جذبہ دل آزما کے دیکھتے ہیں خواب اس کی آنکھوں میں سجا کے دیکھتے ہیں نہ جانے کیوں وہ ہمیں اپنا اپنا سا لگتا ہے دل کے آئین میں جب اسے سجا کے دیکھتے ہیں سنا ہے مانگیں دل سے تو مل کر رہتا ہے چلو اب معجزے اپنی دعا کے دیکھتے ہیں جب بھی لکھتا ہوں کوئی لفظ اس کے نام بھی سارے لفظ مجھے مسکرا کر دیکھتے ہیں اس نے ڈائری میں تصویر واپس رکھی اور خاموشی سے باہر آ گیا کیونکہ وہ جان گیا تھا کہ اب جو کرنا ہے اسے ہی کرنا ہے۔

☆☆☆

وہ دن بھی ایک عجیب دن سامعہ کو فون کر کے ریحانہ سکندر نے اسٹیشنل فون کر کے بلوایا تھا، گو کہ آفاق کی موجودگی میں وہ جانے سے پرہیز کرتی تھی لیکن ان کے بے حد اصرار سے بلانے پر وہ انہیں انکار نہ کر سکی، جس وقت وہ احسن و لا پہنچی گھر میں اچھی خاصی چہل پہل تھی ریحانہ سکندر بھی بہت خوش اور ہشاش بشاش نظر آ رہی تھیں۔

ریحانہ بیگم نے اس سے گلے ملتے ہوئے باقاعدہ اس کی پیشانی چومی تھی، سامعہ نے ان سے گلے ملتے ہوئے ان کے خوش اور بے ساختہ کھلتی مسکراہٹ کا راز پوچھا۔

”خیریت اتنی چہل پہل اور آپ بھی بہت خوش لگ رہی ہیں خوشی کا راز کیا ہے۔“ اس نے راز دار نہ اسٹائل میں ان کی طرف جھک کر پوچھا تو انہوں نے مسکرا کر اسے دیکھا اور اس کی پیشانی چومی۔

”کل آفاق کے آنے اور اسپیشلائز کی خوشی میں، میں نے پارٹی رکھی ہے اور آفاق کا نکاح بھی ہے۔“ انہوں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”نکاح۔“ سامعہ نے ان کے نکاح کہنے پر یکدم ساکت ہوئی لیکن اس نے اپنے آپ کو یکدم سنبھال لیا، وہ یہ راز کسی پر آشکار نہیں کرنا چاہتی تھی کہ آفاق سکندر اس کے دل پر دستک دینے والا پہلا شخص ہے۔

”بہت بہت مبارک ہو آنٹی۔“ اس نے گرم جوشی سے مبارکباد دینی چاہی لیکن اپنے لہجے کو کھوکھلے پن سے وہ خود بھی واقف تھی، یکدم نہ جانے کیوں گلے میں آنسوؤں کا پھندہ لگنے لگا تھا جی بھی وہ اپنا بھرم رکھنے کے لئے فوراً جانے کے لئے کھڑی ہو گئی۔

”اچھا آنٹی چلتی ہوں ایک سیمینار اینڈ کرنا ہے آج میں لیٹ ہو جاؤں گی، آپ کو بہت بہت مبارک ہو اور کل میں کوشش کروں گی آنے کی۔“ اس نے اپنے نہ آنے کا ہلکا سا عندیہ پیش کر دیا تھا۔

”سامی۔“ وہ جانے کے لئے مڑ چکی تھی جی بھی پلٹ کر دیکھا ریحانہ بیگم اپنی کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

”بیٹا تم کو بیٹی کہا ہی نہیں بلکہ مانا بھی ہے تم بیٹی ہو تو وہ بیٹا ہے اور مجھے یقین ہے کہ ایک بیٹی اپنی ماں کی خوشی میں ضرور شریک ہو گئی۔“

وہ سمجھ چکی تھیں کہ وہ آنا نہیں چاہتی کیونکہ اس کے دل کے راز سے واقف ہو گئی تھیں لیکن اس بات کا افسوس تھا کہ انہیں اس راز سے آگاہی اتنی دیر میں کیوں حاصل ہوئی۔

”او کے آنٹی ضرور آؤں گی۔“ اس نے جھلملاتی آنکھوں سے انہیں آنے کا عندیہ دیا اور پلکیں جھکا گئی، ریحانہ بیگم نے آگے بڑھ کر اس کی پیشانی چومی اور اسے فی امان اللہ کہہ کر رخصت کر دیا وہ اس کی آنکھوں کی جھلملاہٹ دیکھ چکی تھی لیکن اس کا بھرم بھی نہیں کھونا چاہتی تھی، اس لئے اسے جانے کی اجازت دے دی، وہ جانتی تھیں کہ آج کوئی سیمینار نہیں ہے وہ صرف جانے کا بہانہ تلاش کر رہی تھی سو انہوں نے بھی اس کے بہانے کو کامیاب کرنے میں مدد دی تھی۔

☆☆☆

رات دھیرے دھیرے بیت چکی تھی، پو پھٹنے لگی تھی اذان کی آواز پر یکدم اس کی آنکھ کھل گئی، ساری رات سوتے جاگتے گزار کر نہ جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی اس نے اٹھ کر پردے سرکائے اذان کی آواز واضح سنائی دینے

لگی تھی، اذان ختم ہوئی اس نے جا کر وضو کیا اور پھر جائے نماز بچھا کر نماز کی نیت باندھ لی، نماز ختم کر کے اس نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے تو کب کے ر کے آنسو ایک بار پھر اس کے گال پر لڑھک گئے، ہچکیوں سے روتے کچھ دیر بعد جب اس کے دل میں سکون محسوس ہوا تو وہ چہرے پہ ہاتھ پھیرتی اٹھ گئی، تیار ہو کر وہ کمرے سے باہر آئی تو پورے گھر میں سناٹا ہو رہا تھا پورا گھر سو رہا تھا اس نے گھڑی دیکھی ساڑھے سات ہو رہے تھے، آج کل گھر والوں کی کیا روٹین تھی وہ بالکل بھی بے نیاز ہو چکی تھی، وہ خاموشی سے گاڑی کی چابی اٹھا کر بیگ کندھے پر ڈالا اور باہر آ گئی اس نے ناشتہ نہیں کیا تھا سو قریبی ہوٹل کے قریب گاڑی روک کر اس نے کافی وہیں منگوالی اور پھر گاڑی کلفشن والے آفس کی طرف ڈال دی اس کا ارادہ تھا کہ وہ اگلے ماہ تک اس آفس میں شفٹ ہو جائے گی لیکن جب گاڑی آفس کے بیس منٹ تک پہنچی تو وہ ایک فیصلہ کر چکی تھی وہ آفس میں جب وقت داخل ہوئی اس کا انٹریئر تقریباً مکمل ہو چکا تھا، اس نے بیگ اتار کر ٹیبل پر رکھا اور تفصیلی نظر آفس پر ڈالی پھر انٹرکام پہ منیجر کو اپنے کمرے میں بلایا، وہ اس وقت ایک فائل اپنے آگے کھولے بیٹھی تھی لیکن درحقیقت اس کا ذہن احسن ولا میں ہی تھا جیسا دروازے کی دستک پر اس نے اندر آنے کی اجازت دی۔

”جی میڈم آپ نے بلایا تھا۔“ وہ ٹیبل کے پاس آ کر مودب انداز میں کھڑا ہو چھ رہا تھا۔

”جی وقاص صاحب یہ آفس میں نے آج سے جوائن کر لیا ہے اس لئے آپ کو بلازہ سے تمام اسٹاف آپ آج لنچ کے بعد بلوائیجئے اور لنچ کے بعد میری اسٹاف کے ساتھ میٹنگ بھی ارنج کر دے گا۔“

”جی میڈم! لیکن میڈم باہر کے سائیڈ تھوڑا سا کام رہتا ہے تو.....“ انہوں نے ابھی بات پوری بھی نہیں کی تھی سامعہ نے ان کی بات کاٹ دی۔

”لیکن ویکن کو چھوڑیں وقاص آپ یہ جو کام ادھورا ہے اسے آج ابھی ہر حال میں پورا کروائیں، اسٹاف بلوائیں میٹنگ بھی ارنج کریں فوراً۔“

”جی میڈم۔“ وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے مڑے۔

”اور ایک منٹ وقاص صاحب اس آفس کے سارے ڈیویز کلیئر کر کے آئیے گا۔“

”جی میڈم۔“ وہ بیچارے حیران سے سامعہ کو دیکھ کر اثبات میں سر ہلا رہے تھے، پچاس سے پچپن سال کی عمر کے درمیان سے وقاص صاحب آج خود حیران تھے کہ سامعہ کو آج ہو کیا گیا ہے یہ سارا کام ایک دن میں کیسے ہو گا لیکن انہیں کرنا ہی تھا کیونکہ آج سامعہ کا مزاج ٹھیک نہیں لگ رہا تھا ورنہ وہ اسٹاف پہ اتنا بوجھ ڈالنے کی عادی نہیں تھی اور وقاص صاحب کے ساتھ تو ان کی عمر کی وجہ سے بہت لحاظ کرتی تھی، وہ کمرے سے نکل رہے تھے، جیسا سامعہ کی آواز ایک بار پھر سنائی دی۔

”وقاص صاحب آپ جائیں گے کیسے؟“

”لوکل ٹرانسپورٹ سے میم۔“

”اچھا آپ ایسا کریں میری گاڑی لے جائیں لیکن سارے کام آج ہی ہونے چاہیے۔“

اس نے بیگ سے گاڑی کی چابی نکالی اور ان کی طرف بڑھا دی تھی جس کو وقاص صاحب حیرانی سے تھمتے سامعہ کو دیکھتے ہوئے باہر نکل گئے۔

لنچ ٹائم کے بعد وہ آفس اسٹاف کی میٹنگ ارنج ہو جانے کی خبر پر وہ میٹنگ روم کی طرف جا

رہی تھی جیسی اس کے موبائل کی رنگ ٹیون بننے لگی اس نے سکرین کو دیکھا تو ریحانہ آنٹی کا لنگ لکھا ہوا تھا، اس نے کال کاٹنی چاہی لیکن پھر نجانے کس احساس کے تحت اس نے کال ریسیو کر لی۔

”السلام علیکم آنٹی کیسی طبیعت ہے آپ کی؟“ اس نے سلام کے ساتھ ان کی خیریت دریافت کی۔

”وعلیکم السلام میں تو خیریت سے ہوں لیکن میری بیٹی کے ارادے خیریت سے نہیں لگ رہے۔“ انہیں شاید اس کی کلفشن آفس میں موجودگی کا پتا چل گیا تھا۔

”نہیں آنٹی اصل میں آج اسٹاف سے میٹنگ ہے اور پھر آج سے یہ آفس بھی جوائن کر لیا تو سارا دن اسی مصروفیت میں گزر گیا۔“

”کب تک پہنچ رہی ہوں گھر یہ۔“ ریحانہ سکندر نے اس کی تفصیل کو نظر انداز کر دیا، ان کے سوال پر وہ چپ ہو گئی۔

”پانچ بجے، میں تمہارا انتظار کروں گی ساری اور پانچ بجے کا مطلب پانچ بجے ہی ہونا چاہیے، سمجھ رہی ہوں میری بات۔“ ان کے لہجے میں مان و محبت کی ایسی مٹھاس تھی کہ سامعہ حیدر جو انکار کا پورا ارادہ کے بیٹھی خاموش رہ گئی اور انہوں نے اس کی خاموشی کو رضا مندی سمجھ کر فون بند کر دیا، وہ موبائل ہاتھ میں لئے کھڑی رہ گئی اپنے کمرے میں آ کر وہ خاموشی سے کرسی پر بیٹھ گئی نہ جانے اسے کتنی دیر گزر گئی تھی جیسی اسے یکدم خیال آیا تو اس نے سب سے پہلے میٹنگ کینسل کی اور بیگ اور چابیاں لے کر باہر آ گئی کیونکہ ساڑھے چار ہو چکے تھے وہ جس وقت گھر پہنچی تو گھر میں بھی خلاف توقع معمول چہل پہل تھی سب لوگ کہیں جانے کے لئے تیار ہو رہے

تھے پہلے اس نے ان لوگوں سے پوچھنا چاہا پھر کچھ سوچ کر ارادہ ترک کر دیا اور اپنے کمرے میں آ گئی شاور لے کر وہ جس وقت باہر آئی وہ لوگ تیار ہو چکے تھے اور گاڑی میں بیٹھ رہے تھے آہستہ آہستہ پورا گھر خالی ہو گیا صرف ہانیہ کی آواز آرہی تھی جیسی ہانیہ نے اس کے کمرے میں جھانکا۔

”سامعہ ہم لوگ ریحانہ آنٹی کی طرف انوائٹڈ ہیں اگر تمہارا ارادہ ہو تو تم بھی آ جانا ہم لوگ جا رہے ہیں درہو رہی ہے۔“ وہ جلدی جلدی کہہ کر تیزی سے نکل گئی اور وہ یہ بھی نہ کہہ سکی کہ میں تم لوگوں کے ساتھ چل رہی ہوں کتنی دیر وہ بیڈ پر خالی خالی ذہن بیٹھی رہی آسان تو نہ تھا اس کے لئے اپنی کسی اور کے حوالے سے ہوتا دیکھنا، وہ ایک ان دیکھی اذیت میں تھی جیسی اس کے موبائل نے بجنا شروع کر دیا، اس نے موبائل اٹھا کر دیکھا تو احسن کا لنگ لکھا ہوا تھا، اس نے لیس کاٹن دبایا۔

”سامی یار کہاں ہیں آپ چھ بج چکے ہیں مہما پریشان ہو رہی ہیں رائیل نے الگ جان کھا رکھی ہے کہ وہ آپ کے بغیر تیار نہیں ہوگی پلیز یار آ جائیں آداری میں لہجہ کرواؤں گا۔“ نان اسٹاپ بولتے ہوئے آخر میں اس نے حسب عادت اسے لہجہ دیا تو وہ بے ساختہ ہنس دی۔

”اوکے۔“ احسن نے جواب سن کر فوراً فون بند کر دیا اور پھر جس وقت وہ بے نام سوچوں کو جھٹکتی ہلکا پھلکا تیار ہو کر نکلی تو رائیل کی کال آ گئی اس نے اسے آنے کا یقین دلا کر گاڑی فوراً چوتھے گیسٹر میں ڈال دی، وہ جس وقت احسن ولا پہنچی تو آفاق سامنے ہی کھڑا تھا، بلیک ڈنر سوٹ میں اس کی وجاہت دیکھنے سے تعلق رکھ رہی تھی

ہوں۔“ اس نے سامعہ کو دھمکایا۔
 ”اور سنو تا زیہ زیادہ تنگ کریں تو منہ پہ
 نیپ چپکا دینا۔“ اس نے بیوٹیشن کو مخاطب کیا تو وہ
 ان دونوں کی محبت پر مسکرا دی ایک گھنٹے کی محنت
 کے بعد وہ پہچان میں نہیں آ رہی تھی، بیوٹیشن نے

سامعہ نے نور انظروں کا رخ پھیرا اور رائیل کے
 کمرے کی طرف بڑھ گئی، اس نے رائیل کے
 کمرے پہ دستک دے کر ساتھ ہی دروازہ بھی
 کھولا سامنے ہی رائیل بلڈ ریڈ میکسی پیسے ڈریسنگ
 ٹیبل کے اسٹول پہ بیٹھی میک اپ کو فائنل ٹچ دلوا
 رہی تھی دوپٹہ بیڈ پہ پڑا ہوا تھا، بالوں کا آبشار سا
 کمر پہ گر رہا تھا، سامعہ کی آواز پر وہ بیوٹیشن کو چھوڑ
 کر تیزی سے اس کی طرف لپکی تھی اور جھٹ سے
 آگے بڑھ کر اس نے سامعہ کے گال کو چوما،
 سامعہ اس کی محبت پہ مسکرا کر رہ گئی۔

”بہت خوبصورت لگ رہی ہو رابی آج تو
 احسن کے ہوش و حواس دونوں غائب ہو جائیں
 گے۔“ سامعہ نے اسے ہلکا سا چھیڑا اور نہ یہاں آ
 کے اس کا دل کسی طور اس کے قابو میں نہ تھا وہ
 ادھر ادھر اپنا دھیان لگانے کی کوشش کر رہی تھی
 جیسی رائیل نے بیڈ سے ایک شاپراٹھا کر اس کی
 طرف بڑھایا۔

”ماما نے آپ کے لئے اسپیشل ڈریس بنوایا
 ہے آپ جلدی سے چینج کر کے آئیں بیوٹیشن
 آپ کے انتظار میں بیٹھی ہے۔“

”مگر رابی.....“ وہ کہنا چاہتی تھی لیکن رابی
 نے اس کو بولنے کا موقعہ دیئے بغیر ڈریسنگ روم
 کی طرف دھکیل دیا، وہ رائیل کے جیسی ہی میکسی
 تھی صرف کلر کا فرق تھا رائیل کی ریڈ تھی اور اس
 کی گولڈن وہ خاموشی سے ڈریس پہن کر باہر آئی
 تو رائیل نے اس کو ڈریسنگ ٹیبل کے اسٹول پر
 بٹھا کر بیوٹیشن کو اشارہ کیا اور اس کے کچر میں
 بندھے نم بال کھول دیئے بالوں کی آبشار پھسل کر
 اس کی کمر پہ آگری تھی۔

”رائیل یہ تم کیا کر رہی ہو۔“

”میں تیار ہوں اور.....“

”چپ آج کے دن میں آپ کی باس

احمدی کتابیں پڑھنے کی عادت ڈالیں

ابن انشاء

- ☆ اور دو کی آخری کتاب.....
- ☆ خمار گندم.....
- ☆ دنیا گول ہے.....
- ☆ آوارہ گرد کی ڈائری.....
- ☆ ابن بطوطہ کے تعاقب میں.....
- ☆ چلتے ہو تو چین کو چلیئے.....
- ☆ نگرانی پھر مسافر.....
- ☆ خط انشاء جی کے.....
- ☆ اس بستی کے اک کوپے میں.....
- ☆ چاند نگر.....
- ☆ دل وحشی.....
- ☆ آپ سے کیا پروا.....

ڈاکٹر مولوی عبد الحق

- ☆ توانا اردو.....
- ☆ انتخاب کلام میر.....

ڈاکٹر سید عبداللہ

- ☆ طیف نثر.....
- ☆ طیف غزل.....
- ☆ طیف اقبال.....

لاہور اکیڈمی

چوک اور دو بازار لاہور

فون: 042-37321690, 3710797

ابھی اس کے دوپٹے پر آخری پن لگائی تھی جبھی دروازہ کھلا تو ریحانہ بیگم اندر آ رہی تھیں وہ ان کے استراام میں فوراً کھڑی ہو گئی۔

”السلام علیکم آئی یہ رائیل.....“ وہ ان سے پوچھنا چاہ رہی تھی لیکن انہوں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموشی کا اشارہ کیا اور اس کی پیشانی چوم لی۔

”آج صرف میرے بیٹے کا ہی نکاح نہیں ہے سہمی بلکہ آج میری بیٹی کی بھی شادی ہے۔“

”کیا مطلب؟“ اس نے ابھٹن بھرے انداز میں ان کی طرف دیکھا پھر رائیل کو جو دروازے میں کھڑی احسن کو نہ جانے کیا اشارہ کر رہی تھی۔

”آئیے قاضی صاحب۔“ اور قاضی صاحب کے اندر آتے ہی رائیل نے ہاتھ میں پکڑی گلابی چادر اس کے سر پہ ڈال دی۔

”سامعہ حیدر آپ کا نکاح، آپ کا نکاح آفاق سکندر سے حق مہر، مہر فاطمی کے مطابق کیا جاتا ہے آپ کو قبول ہے۔“ قاضی صاحب کے الفاظ پر اسے یکدم کرنٹ لگا تھا، اس نے نگاہ اٹھا کے ریحانہ بیگم کو دیکھا ان کے پیچھے اس کے تمام گھر والے موجود تھے گویا وہ سب اس نکاح سے باخبر تھے صرف وہ ہی ایک بے خبر تھی یا پھر اسے جان بوجھ کر بے خبر رکھا گیا تھا، اس کے باپ نے شفقت سے اس کے سر پہ ہاتھ رکھا اور ریحانہ بیگم نے اس کے شانوں کے گرد اپنا بازو پھیلا یا تو وہ انکار نہ کر سکی اور قاضی صاحب کے بتائے۔

مقامات پر سائن کرتی چلی گئی سب لوگ کمرے سے جا چکے تھے وہ جھلملاتی آنکھوں سے ریحانہ بیگم کو دیکھ رہی تھی۔

”بیٹا ماں کبھی بھی اولاد کے خوابوں اور خواہشوں سے انجان نہیں ہوتی میں نے تمہیں

بیٹی کہا ہی نہیں بیٹی سمجھا بھی ہے مگر تمہارے خواب اور خواہشوں کو جاننے میں اس ماں کو جو دیر ہوئی اور جو تکلیف تم کو اٹھانی پڑی اس پر اسے معاف کر دینا۔“ ریحانہ بیگم نے کہا تو وہ نشی میں سر ہلاتی ان سے لیٹ کر زار و قطار رو دی، ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے تھے، جبھی احسن کمرے میں داخل ہوا تو اس نے روتی ہوئی سامعہ کو ریحانہ بیگم سے الگ کیا، اس کے پیچھے آفاق کھڑا فاجسے سامعہ نہیں دیکھ سکی تھی احسن نے رائیل اور ریحانہ بیگم کو اشارہ کیا تو وہ دونوں باہر نکل گئیں احسن نے آفاق کو سامعہ کے برابر لا کھڑا کیا اور خود بیڈ کی سائیڈ ٹیبل کی دراز پہ جھک گیا، انہوں نے پہلے حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھا پھر احسن کو اس کا ہاتھ جب ان دونوں کے سامنے آیا تو دونوں کی آنکھیں کھلی رہ گئیں اس کے ہاتھ میں ان دونوں کی وہ ڈائری تھی جس میں چھپی محبت کی خوشبو کو انہوں نے اپنے آپ سے بھی چھپایا تھا لیکن احسن سکندر پھر بھی اس راز کو پا گیا، احسن نے سامعہ کی ڈائری آفاق کی اور آفاق کی ڈائری سامعہ کو دے کر خود شرٹ کے کالر فخر سے کھڑے کے اپنے اس کارنامے پر وہ ان دونوں کی طرف مسکراہٹ اچھالتا باہر نکل گیا گویا وہ ان دونوں کے راز سے نہ صرف آگاہ تھا بلکہ ان دونوں کو ملانے کا بھی ذریعہ بنا تھا، سامعہ نے حیرت سے پہلا صفحہ کھولا تو اس کی تصویر فرنٹ بیچ پہ لگی ہوئی تھی آفاق نے سامعہ کی ڈائری کھولی تو سامنے ہی آفاق سکندر کا نام جگمگا رہا تھا، دونوں نے حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھا اور دونوں ہی ہنس دیئے انہیں معلوم تھا اب زندگی کا سفر بہت سہل اور خوبصورت ہوگا۔

باصفا شہزادے

شہزادہ شوکت



مصرفیات کے بارے میں ذہن پر زور دیا۔
”کچھ کام ہے آپ کو؟“

”ہاں میں چاہ رہی ہوں تم ذرا اسے ڈاکٹر طاہرہ کے پاس لے جانا، مجھے اس کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔“ انہوں نے رانیہ کی طرف اشارہ کیا، اس نے بھی اسے دیکھا آپٹکھوں میں حیرت اتری۔

”ٹھیک تو لگ رہی ہے بالکل۔“ اس نے دل میں سوچا۔

”آپ مجھے فون کر کے یاد کروادیتے تھے گا۔“ اس نے یہ نہیں پوچھا تھا کہ کیا ہوا ہے جو ڈاکٹر کو دکھانے کی ضرورت پیش آئی تھی، دادو گہری سانس لے کر رہ گئی تھیں۔

☆☆☆

صبح ریان کی آنکھ کچھ نامانوس آوازوں سے کھلی، کچھ دیر غور کرنے کے بعد اسے یہ آوازیں واش روم سے آتی محسوس ہوئیں، وہ اٹھ بیٹھا کمبل ایک طرف پھینک کر واش روم تک آیا تو کھلے دروازے میں رانیہ واش بیسن پر جھکی ہوئی تے پر تے کر رہی تھی، اس نے آگے بڑھ کر اس کی پشت سہلائی اور کندھوں سے تھام کر باہر بیڈ پر لا کر بٹھا دیا۔

”کیا کھالیا تھا، یہ تو نوڈ پوائزن لگتا ہے؟“ اس نے جواب نہیں دیا، اتنی ٹڈھال ہو رہی تھی، ریان نے تکتے سیٹ کر کے اسے لٹا دیا۔

”اب اتنی صبح تو کوئی ڈاکٹر بھی نہیں ملے گا، دادو بھی سو رہی ہوں گی، خواہ مخواہ ڈسٹرب کرنے والی بات ہے، تم یونہی لیٹی رہو، انشاء اللہ کچھ دیر میں آرام آجائے گا۔“ اس نے ہمدردی سے رانیہ کو دیکھا، اس کی رنگت زرد ہو رہی تھی۔

اسی پل اسے پھر سے ابکائی آئی اور وہ بھاگ کر واش بیسن پر جھک گئی، اب ریان کو

آج معمول سے زیادہ کام تھا آفس میں، سوریان بہت تھکا ہوا تھا، دل چاہ رہا تھا گھر جا کر لمبی تان کر سو جائے، ساڑھے آٹھ بج رہے تھے جب وہ گھر پہنچا تھا دادو اور رانیہ لاؤنج میں ٹی وی دیکھ رہی تھیں، وہ سلام کرتا وہیں دادو کے پاس ڈھیر ہو گیا۔

”چائے لاؤں آپ کے لئے؟“ رانیہ نے پوچھا۔

”نہیں، اب چائے پیے گا تو کھانا گول کر دے گا۔“ دادو نے ٹوکا۔

”میں پہلے فریش ہو جاؤں، پھر دیکھتا ہوں کھانے کو۔“

”دیکھنا نہیں ہے، کھانا ہے سمجھے۔“ وہ مسکرا دیا۔

”او کے گرینی۔“ وہ پیار سے ان کے گال چھو کر اوپر اپنے کمرے میں آ گیا، وہ اکثر تھکاوٹ میں کھانا گول کر دیتا تھا، جس پر دادو بہت ناراض ہوتی تھیں، شاور لے کر واش روم سے باہر آیا تو رانیہ بیڈ پر بیٹھی تھی، اسے یوں منتظر پا کر اسے کوفت سی ہونے لگی۔

”کتنی دفعہ کہا ہے کہ مجھے کچھ چاہیے ہو گا تو میں کہہ دوں گا یوں اپنے آپ کو باؤنڈ کر کے کیوں بیٹھ جاتی ہو۔“

”نانو کہتی ہیں آپ کے گھر آنے کے بعد آپ کے پاس ہی رہا کروں، کیا پتا کب آپ کو کس چیز کی ضرورت پڑ جائے۔“ اس کی معصومیت سے کی گئی وضاحت نے اسے لب بلیچ لینے پر مجبور کر دیا تھا، کھانے کے دوران دادو نے اچانک اسے پکارا تھا۔

”ریان کل شام تک کوئی ٹائم نکال سکتے ہو؟“

”جی، کل شام۔“ اس نے اپنی کل شام کی

تشویش ہوئی، ایک بار پھر قے کر کے منہ دھو کر وہ دیوار پکڑ کر آنے لگی تو وہ جلدی سے آگے بڑھ کر اسے سہارا دے کر بیڈ تک لایا۔

”دادو کو جگا دوں؟“ رانیہ کے اثبات میں سر ہلانے پر وہ تیزی سے ان کے کمرے تک پہنچا، کچھ ہی دیر میں وہ اس کے پاس تھیں۔

”یہ کل سے یونہی دو میٹنگ کر رہی ہے، تبھی میں نے اسے لیڈی ڈاکٹر کو دکھانے کے لئے کہا تھا۔“ وہ اس کی کمر سہلاتے ہوئے مسکرائیں۔

”میرے خیال میں تو یہ خوشخبری ہے۔“

”خوشخبری؟“ ریان نے نا جھگی سے انہیں

دیکھا، اسے تو ان کی دماغی حالت کچھ مشکوک لگ رہی تھی، کہاں رانیہ الٹیاں کر کر کے بے حال ہو رہی تھی اور دادو تھیں کہ اسے مسکرا کر خوشخبری کی نوید دے رہی تھیں، اسے یوں دیکھتا پا کر وہ بے اختیار ہنس پڑیں۔

”میں پاگل نہیں ہوئی کہ تم مجھے یوں گھور رہے ہو، میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اس کی کنڈیشن بتا رہی ہے کہ تم دونوں پیرنٹس بننے والے ہو؟“

”Its mean? Parents“ ریان

تو چکرا گیا، رانیہ کو دیکھا جس نے اپنا سرخ ہوتا چہرہ تکیے میں چھپا لیا اور وہ پیچھے ہوتا ہوا دھت سے صوفے پر بیٹھ گیا تھا۔

☆☆☆

شام کو اسے لے کر ڈاکٹر طاہرہ کے پاس گیا تو دادو کی ہانت کی تصدیق ہو گئی، دادو بہت خوش تھیں اور ہر طرح سے اپنی خوشی کا اظہار بھی کر رہی تھیں، ساتھ ہی اسے بہت سی ہدایات بھی دے رہی تھیں جو رانیہ کا خیال رکھنے سے متعلق تھیں، وہ اس وقت تو خاموشی سے سنتا رہا مگر رانیہ کے کمرے سے جاتے ہی وہ پھٹ پڑا۔

”یہ ساری ڈائریکشن میرے بجائے اسے دیں، جو ابھی تک خود بچہ بنی رہتی ہے، سنجیدگی نام کی کوئی چیز محترمہ میں پائی نہیں جاتی اور چلیں ہیں یہ مرحلہ سر کرنے۔“

”ریان!“ انہوں نے تنبیہ کی۔

”بہت بری بات ہے، وہ کتنی بدل گئی ہے تم نے کبھی غور ہی نہیں کیا، تمہاری پسند کا کھانا بنوالی ہے، تمہاری پسند کا لباس پہنتی ہے، ہر طرح سے تمہارے بتائے ہوئے سانچے میں پورا اترنے کی ہر ممکن کوشش میں لگی رہتی ہے، اس کا یہ صلہ اگر تم دے رہے ہو تو یہ یقیناً زیادتی ہے۔“

”آپ نے پہلے میری کب سنی تھی جواب سنیں گی۔“ وہ ناراض ہوتا اٹھ گیا، وہ گہری سانس لے کر رہ گئیں۔

ان کے دو بچے تھے کیونکہ وہ درکنگ وومن تھیں تو کم بچوں پر ہی گزارہ کیا، بس اللہ تعالیٰ کی آزمائش تھی کہ دونوں بچے ان کے سامنے دنیا سے رخصت ہوئے، بیٹا آسٹریلیا گیا تھا اور وہیں شادی کر لی اور جب ریان کے بعد ان کے معاملات خراب ہونے لگے تو وہ ریان کو ماں کے سپرد کر کے اس کا فیصلہ کرنے آسٹریلیا پہنچے تو وہ اتنی بھری ہوئی تھی کہ خنجر کے پے در پے وار کر کے ارسلان کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

وہ کوئی دہلی پتلی ایشیائی عورت تو تھی نہیں، مغرب کی چھ فٹی مضبوط قد کاٹھ کی عورت تھی سو مرد پر وار کرتے ہوئے ذرا نہ جھجکتی تھی، یہ صدمہ جانکاہ برداشت کیے صرف پانچ سال ہی گزرے تھے کہ ان کی بیٹی سونیا دوسرے بچے کی پیدائش کے دوران چل بسی، بچہ بھی ساتھ ہی لے گئی، عباس (داماد) کی دوسری بیوی کا سلوک رانیہ کے ساتھ روائتی سوتیلی ماؤں جیسا تھا، وہ برداشت نہ کر پائیں اور عباس سے درخواست کی

کہ وہ رانیہ کو ان کے حوالے کر دے، وہ خود بھی معصوم بچی کے ساتھ بیوی کا سلوک دیکھ کر خون کے گھونٹ بھر رہے تھے، یہی بہتر سمجھا کہ رانیہ کو مانی کے حوالے کر دیں، کچھ عرصہ تو باقاعدگی سے ملنے آتے رہے، لیکن رفتہ رفتہ عید، شب برات پر ہی ملاقات ہو پاتی اور فون بھی اب دودھ مہینے کے وقفے سے آنے لگا تھا، صفیہ خاتون نے ان دونوں بچوں کو متاع حیات سمجھ کر پالا تھا، ریان دس سال کا تھا جب چھ سال کی رانیہ اس گھر میں لائی گئی تھی، اسے دادو کی محبت بھٹی دکھائی دی تو وہ ان سے کھنچا کھنچا رہنے لگا، وہ کیسے نہ سمجھ جاتیں، انہوں نے اسے بہت پیارا اور محبت سے سمجھایا کہ رانیہ کتنی مظلوم ہے وہ اس کا مقابلہ کرنے نہیں، صرف پیار کی تلاش میں یہاں لائی گئی ہے، ساتھ ہی انہوں نے اسے رانیہ کی سوتیلی ماں کے مظالم کے متعلق بتایا اور اس پر رانیہ کی بے بسی واضح کی۔

ریان کا دل پسج گیا، وہ رانیہ کا بہت خیال رکھنے لگا، رانیہ دادو کے بعد ریان کی توجہ پا کر لا ابالی سی ہو گئی تھی، جبکہ ریان اس کے مقابلے میں بہت سمجھ دار اور سنجیدہ بچہ تھا، جیسے جیسے وہ دونوں بڑے ہو رہے تھے ان کے دل میں یہ خواہش زور پکڑنے لگی تھی کہ ان دونوں کو آپس میں ایک بندھن میں باندھ دیا جائے، اس لئے وہ دن رات رانیہ کی ٹریننگ کرنے میں ہلکان ہوتی رہتیں، کبھی اسے کوکنگ سکھا رہی ہیں تو کبھی کپڑے پریس کرنے تو کبھی کمرہ سیٹ کرنا، فی الحال تو وہ کچھ بھی سیریس نہیں لے رہی تھی، سارا دھیان تو اپنے دوستوں میں لگا رہتا، جن کے ساتھ کرکٹ، سائیکلنگ ویڈیو گیمز، ٹینس جیسے گیمز کھیلنے میں جو مزہ آتا تھا وہ ہرگز مانو کے ان بور کر دینے والے کاموں میں نہیں آسکتا تھا پر مانو

نجانے کیوں اس کے پیچھے پڑ گئی تھیں، اسے کام سکھا رہی تھیں جن میں اسے کوئی انٹرسٹ ہی نہیں تھا، کوئی انجوائے منٹ ہی نہیں تھی، پھر یہ سخت ترین ہدایت کہ ریان کے سامنے بہت مہذب اور سنجیدہ بن کر بیٹھو، بھلا کیوں، اچھی زبردستی ہے، میری مرضی میں جیسے چاہوں رہوں، یہی خیالات مانو تک پہنچائے تو انہوں نے کھجا جانے والی نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

”اس لئے کہ میں چاہتی ہوں تم ان عادات کے ساتھ کسی اور سے کیا نباہ کر دو گی، میں ریان کو ہی راضی کر لوں تمہارے لئے اور ان کر تو توں کے ساتھ ورنہ تو وہ کبھی تم سے شادی پر راضی نہیں ہو گا۔“ انہیں تو رہ رہ کر افسوس ہوتا تھا کہ اس وقت وہ اس کا دل بہلانے کے لئے لڑکے، لڑکیوں کی تخصیص کیے بنا اسے دوست بنانے کی اجازت دیئے گئیں اور اب اس کی عادات پختہ ہو گئیں تو اسے گھریلو لڑکی بنانا ایک مصیبت ہو گئی تھی۔

”ریان سے شادی؟“ وہ گم صم ہو گئی، وہ شہزادوں جیسا کزن جو ایک گھر میں رہتے ہوئے بھی کم کم ہی نظر آتا تھا اور مخاطب تو کہیں قسمت سے ہی ہوتا تھا، اس سے شادی؟ اس کا دل بے طرح دھڑکنے لگا، گال سرخ ہو گئے، مانو نے دلچسپی سے اس کے تاثرات دیکھے اور نرمی سے اسے سمجھانے لگیں۔

☆☆☆

ریان دادو کے ساتھ گروسری شاپنگ کے لئے آیا تھا۔

”اور کچھ؟“ دادو آکر فرنٹ سیٹ پر بیٹھیں تو اس نے پوچھا، انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔

”بس اب گھر چلو، تھکاوٹ سی ہو گئی ہے، رانیہ سے کہوں گی اچھی سی چائے پلا دے۔“

جھکائے ان کی بری بھلی سن رہی تھی۔

”پلیز دادو، چھوڑیں، میں بریانی آرڈر کر دیتا ہوں۔“ ریان نے اکتا کر بات ختم کر دی، بھلا یہ کام رانیہ کے بس کے تھے جو دادو اس سے کروانا چاہ رہی تھیں۔

☆☆☆

”کیا کہہ رہی ہیں دادو، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ انہوں نے ریان سے یہ ذکر کیا تو وہ بیٹھے سے کھڑا ہو گیا۔

”جیسے سب کے ساتھ ہوتا ہے ویسے۔“ انہوں نے اطمینان سے کہا۔

”نہیں، میں نے بھی رانیہ کے لئے ایسا نہیں سوچا، مجھے ایک میچور اور سیریس لائف پارٹنر چاہیے جو میرے موڈ کو دیکھ کر میرے مسائل کو سمجھ کر میرے ساتھ چلے نہ کہ رانیہ جیسی چلبلی لڑکی جو زندگی کو صرف انجوائے منٹ سمجھے، آئی ایم سوری، میں کم از کم اپنے آپ کو اتنی مشکل میں نہیں ڈال سکتا۔“

وہ جتنی لہجے میں انکار کر کے رکا نہیں تھا لیکن صفیہ خاتون کے لئے وقت کی گردش رک گئی تھی، وہ اپنے تئیں ان کی چوڑی بنا کر خوش تھیں، ہلکا سا خدشہ تو تھا ریان کی طرف سے مگر اتنی سختی سے انکار کے بعد کہنے کو کیا رہ گیا تھا۔

”بات سنو ریان!“ انہوں نے ریان کو پکارا جو آفس سے آکر انہیں سلام کرنے کے بعد تیزی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ رہا تھا، وہ فوراً پلٹا۔

”جی دادو۔“

”یہاں آؤ، مجھے ضروری بات کرنی ہے۔“ انہوں نے قریب آکر بیٹھنے کا اشارہ کیا، وہ بیٹھ گیا۔

”عباس کا فون آیا تھا، وہ اپنے بھانجے کا

”ہاں وہ پلائے گی، آپ فکر ہی نہ کریں۔“

”نہ کیوں نہیں پلائے گی، آج تو میں اسے بریانی بنانے کا بھی کہہ کر آئی ہوں، وہ بھی بنا رکھی ہوگی اس نے۔“

”چلیں دیکھتے ہیں، اس نے کیا کیا کر لیا ہو گا۔“ استہزائیہ مسکراتے ہوئے اس نے گاڑی اشارٹ کی تھی، گاڑی گیٹ سے اندر داخل ہوئی تو وہ سامنے لان میں اپنے چھوٹے بڑے دوستوں کو جمع کیے کرکٹ کھیلنے میں مصروف تھی، اچھلتی کودتی، چپتی چلاتی، دادو کے ہونٹ پیچ گئے تھے۔

”یہ بنا نہیں گی بریانی؟“ ریان کا دھیماسا طنز یہ لہجہ ان کے کان سے ٹکرایا، وہ خاموشی سے گاڑی سے نیچے اتر آئی تھیں، انہیں دیکھتے ہی رانیہ نے سب کو فارغ کیا اور پیچھے ہی اندر آ گئی۔

”ہوگئی شاہجک؟“

”پہلے پانی پلاؤ۔“ خود پر قابو پا کر انہوں نے تحمل سے کہا، وہ سر ہلاتی ہوئی مڑی اور پانی لے آئی، پانی پلا کر ان کے پاس بیٹھنے لگی کہ انہوں نے ایک اور حکم صادر کیا۔

”اچھی سی چائے بنا کر لاؤ۔“ وہ بد مزہ سی ہو گئی، کرکٹ کھیل کر تھکن سی ہو گئی تھی، وہ تھوڑی دیر آرام کرنا چاہتی تھی مگر ناچار اٹھنا پڑا، ریان نے ٹی وی آن کر لیا تھا۔

”بریانی تیار ہے؟“ چائے پیتے ہوئے دادو نے پوچھا تو رانیہ کو اچھو لگ گیا۔

”ب.....ب.....بریانی، وہ.....وہ تو۔“

”کیا وہ تو.....؟“ ان کے تیور کڑے تھے۔

”وہ مجھے یاد ہی نہیں رہی۔“

”کیا یاد نہیں رہی بریانی؟ تمہیں بریانی بنانا

یاد نہیں رہی۔“ انہوں نے کپ ٹرے میں پیچ کر

کھینچ کر شروع ہو گئیں، وہ مجرمانہ انداز میں سر

”کیسا لگا تمہیں شہر یار؟“ انہوں نے ریان سے پوچھا۔

”آپ نے معلوم کیا ہے کہ اس رشتے میں اس کی مرضی بھی شامل ہے۔“ وہ چونک گئیں۔

”کیا مطلب؟ مرضی نہ ہوتی تو وہ آتا ہی کیوں؟“

”خیر وہ تو پرنس مجبور کر کے بھی لا سکتے ہیں؟“

”اچھا تو کوئی مجبور بھی ہو جاتا ہے، ہمارے آگے تو کوئی نہیں ہوا۔“ انہوں نے طنز کیا، وہ

چپ رہا۔ ”دیکھنے میں تو نارمل ہی تھا، لگتا تو نہیں تھا

کہ اسے اس کی مرضی کے بغیر لایا گیا ہے، باقی واللہ اعلم، تمہیں کیوں شک ہوا، کیا اسے پہلے سے جانتے ہو؟“

”ہمارے آفس میں ہی ہوتے ہیں موصوف اور باس کی بیٹی کے ساتھ زبردست افیئر چل رہا ہے ان کا اور شنید یہی ہے کہ بہت جلد شادی کرنے والے ہیں دونوں۔“

اس کے انکشاف نے تو صفیہ خاتون کو وہیں ڈھے جانے پر مجبور کر دیا تھا۔

”یا اللہ کیسا نصیب بنایا ہے میری بچی کا، ہر طرف سے ہی وہ دھتکاری جائے گی؟“ وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رو پڑی تھیں۔

”دادو پلینز، دادو فار گاڈ سیک پلینز خاموش ہو جائیں۔“ وہ انہیں چپ کروانے کی جتنی کوشش کر رہا تھا وہ اتنی ہی مزید رو رہی تھیں۔

”آئی ایم سوری دادو، مجھے شاید آپ کو نہیں بتانا چاہیے تھا۔“ اس کی بے تکلی بات پر انہوں نے سخت ملاشتہ نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

”جاؤ جا کر آرام کرو، میں اب خود اس کے لئے کوئی بہت اچھا سا لڑکا دیکھوں گی جو اس کی

رشتہ رانیہ کے ساتھ ملے کرنا چاہتے ہیں، سو اسے ملے جانا چاہتے ہیں، میں نے ان سے کہا ہے کہ وہ اپنی بہن کو کہیں کہ وہ یہیں رشتہ لے کر آ جائیں، میں بھی ان سے ملنا اور لڑکے کو دیکھنا چاہتی ہوں، کل تم پانچ بجے تک آ جانا، ان سے مل لینا اور بہتر ہوگا کہ تم بھی مجھے اپنی پسند بتا دو تو میں دونوں کی ساتھ ہی شادی کر کے فارغ ہو جاؤں۔“

”میں نے کب کہا کہ میں کسی کو پسند کرتا ہوں۔“ وہ حیرت سے بولا۔

”ایسا جتنی انکار تو تبھی کیا جاتا ہے، جب کوئی اور سامنے ہو۔“

”آپ ایسا سمجھتی ہیں تو میں کیا کہہ سکتا ہوں ورنہ ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔“ اس نے شانے اچکائے۔

”بہر حال میں نے عباس سے کہا ہے کہ میں رانیہ کو یہاں اپنے گھر سے رخصت کرنا چاہتی ہوں اور وہ مان بھی گئے ہیں، بس کل تم ٹائم سے آ جانا۔“ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

☆☆☆

جلدی جلدی کرتے بھی اسے ساڑھے پانچ ہو گئے، جب وہ گھر پہنچا، ڈرائنگ روم سے آئی آوازوں سے پتا چل رہا تھا کہ مہمانوں کی آمد ہو چکی ہے، اس نے سلام کیا اور دادو کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔

”یہ ہے شہر یار، عباس کا بھانجا۔“ فرداً فرداً تعارف کرواتے ہوئے جب وہ مطلوبہ لڑکے تک پہنچیں تو ریان نے بھی بطور خاص اسے دیکھا اور بری طرح چونک پڑا، شہر یار کے چہرے کا رنگ بھی بدل گیا تھا لیکن دونوں نے خود پر قابو پالیا تھا، رات کے کھانے کے بعد مہمان رخصت ہوئے تھے۔

عزت تو کرے، محبت نہ سہی۔“ ان کی آواز پھر سے بھرا گئی تھی، وہ کچھ دیر لب بستہ سا وہیں کھڑا رہا۔

”کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے دادو، میں ہوں نا، میں ہی شادی کر لوں گا رانیہ سے۔“

”نہیں کوئی ضرورت نہیں خود پر جبر کرنے کی۔“ وہ ناراضگی سے منہ موڑ کر بولی تھیں۔

”آپ کی خاطر یہ بھی سہی۔“ مسکراتا ہوا ان سے زبردستی لپٹ گیا، وہ بھی ہنس پڑیں تھیں۔

☆☆☆

انہوں نے عباس سے ساری بات کلیئر کر کے ریان کا رشتہ پیش کیا تھا اور وہ تو ان کی رضا میں راضی تھے، دونوں کی شادی بخیر و خوبی ہو گئی اور جیسے تیسے دونوں کی گاڑی چل ہی پڑی تھی، بس اب وہ رانیہ کو ڈھیلا نہیں چھوڑتی تھیں، ہر وقت اسے ریان کی پسندنا پسند کے متعلق بتاتی رہتیں کہ اسے اس کے سامنے کس طرح رہنا چاہیے، آگے بڑھ کر اس کا ہر کام خود کرنا چاہیے، کیا کھانا وہ پسند کرتا ہے، کیسی ڈرینگ اسے پسند ہے، رانیہ تو ان کی ہدایتوں پر عمل کر کر کے بلکان ہو جاتی تھی، اب جبکہ وہ اس کنڈیشن میں تھی کہ اس کا وہ بہت خیال تو رکھ رہی تھیں لیکن اسے سختی سے کہا تھا کہ ریان کے سامنے اپنی کسی بھی تکلیف یا کمزوری کا اظہار نہیں کرنا ورنہ وہ اسے بھی اس بچکانہ پن میں شمار کرے گا، اس دن ریان کے دوست کے ہاں ان کی دعوت تھی، وہ تیار ہو کر جیولری پہن رہی تھی کہ اسے اتنی زور کی ابکائی آئی کہ لگا آنتیں ہی الٹ کر باہر آ جائیں گی۔

”مائے گاڈ، ایسے جاؤ گی تم وہاں؟“ ریان نے غصے اور کوفت سے اسے دیکھا، وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر واش روم کی طرف بھاگی، غصہ مندی یہ کہ تو یہ آگے رکھ لیا تو کپڑوں کی بچت ہو گئی، باہر

آتے ہی اس نے اپنی دواؤں میں سے ایک گولی، دو گھونٹ پانی کے ساتھ نگل لی۔

”اس سے تھوڑی دیر میں منگی رک جائے گی۔“ اسے تسلی دی۔

”تو پہلے نہیں کھا سکتیں تھیں۔“ وہ غصے سے بڑبڑایا۔

”اب اگر ٹھیک ہو تو چلو۔“ وہ بے بسی سے اسے دیکھتی اٹھ کر پیچھے چل پڑی، سچ کہا ہے کسی سیانے بلکہ سیانی نے کہ مرد کا ایک بچہ پیدا ہوتا تو اسے لگ پتا جاتا کہ کیا تکلیفیں سہنی پڑتی ہیں، ہائے رے عورت، آفرین ہے تجھ پر۔

☆☆☆

”اُف۔“ رانیہ بہت زور سے کراہی، اسے بہت درد ہو رہا تھا، ریان کو اٹھانے کا حوصلہ نہیں ہو رہا تھا، تھوڑے تھوڑے وقفے سے درد کی وہ لہر آتی کہ وہ بے حال ہو جاتی، رات کے ساڑھے بارہ بج رہے تھے، اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیا کرے، مانو نے تو اسے سمجھایا تھا کہ اسے جب بھی بہت تیز درد محسوس ہو تو چاہے ٹائم کوئی بھی ہو وہ انہیں فوراً بتائے، اسے خود ہی مانو کو بتانا چاہیے، وہ اٹھی تو اس کا ہاتھ لگنے سے گلاس گر پڑا، سائیڈ ٹیبل کی گلاس ٹاپ پر گلاس ٹکرانے کی زور دار آواز پیدا ہوئی، جس سے ریان اٹھ گیا تھا۔

”کیا ہوا؟“ مندی مندی آنکھوں سے اسے دیکھا۔

”مجھے بہت پین ہو رہا ہے، آپ مانو کو بلا دیں۔“

”اس وقت؟“ اس نے ایک نظر وال کلاک پر اور دوسری اس پر ڈالی۔

”دماغ ٹھیک ہے، کوئی پین کلر لو اور سو جاؤ۔“ وہ ایسے جھڑک کر پھر سونے لگا تھا کہ وہ چیخ مار کر رو پڑی تھی۔

”نانو..... نانو کو بلا دیں پلیز۔“ وہ بلک
بلک کر رہی تھی، وہ غصے سے کمر پھینک کر
دادو کے کمرے تک تیزی سے آیا، خلاف توقع دو
دفعہ کی دستک پر ہی وہ اٹھ کر آگئیں۔
”کیا ہوا، خیریت؟“

”وہ آپ کی لاڈلی بلا رہی ہے آپ کو، ذرا
سی تکلیف برداشت نہیں ہو رہی اور رات کے اس
پہر رونا دھونا ڈالا ہوا ہے۔“ وہ اتنی تیزی سے اس
کے پاس سے گزریں کہ اس کی آدھی بات تو منہ
میں ہی رہ گئی تھی۔

”ریان جلدی گاڑی نکالو، اسے ابھی
ہسپتال لے کر جانا ہے۔“
”لیکن میرا ڈرائیور، یہ تو نائٹ سوٹ۔“
”ہمیں چھوڑ آؤ، پھر جو دل چاہے کرتے
رہنا۔“

دادو تو اس کے بھی ہاتھ پاؤں پھلائے
دے رہی تھیں، خود تو حد درجہ گھبراہٹ اور بوکھلائی
تھیں ہی، اس نے گاڑی اشارت کی، جب تک
وہ رانیہ کو ساتھ لئے ایک ہاتھ میں چھوٹا سا بیگ
لئے آگئیں پھر جب رانیہ کو اندر لے جایا گیا تو
نانو نے اسے گھر جا کر کپڑے تبدیل کرنے کے
لئے کہا، اب اتنا تو وہ بھی سمجھ گیا تھا کہ جس
خوشخبری کی نوید کئی ماہ سے سنی جا رہی تھی، وہ بس
آیا ہی چاہتی ہے، وہ کپڑے پہنچ کر کے واپس
ہسپتال پہنچا، دادو منتظر نگاہوں سے باہر ہی کی
سمت دیکھ رہی تھیں۔

”بہت بہت مبارک ہو، اللہ تعالیٰ نے بیٹا
عطا کیا ہے۔“ انہوں نے اس کا ماتھا چوما، چہرہ
خوشی سے گل رنگ ہو رہا تھا، وہ مسکرایا۔
”آپ کو بھی مبارک ہو۔“

کچھ ہی دیر میں بچہ ان کے پاس تھا، ریان
نے بے اختیار اپنے لب اس کے ننھے سے ماتھے

پر رکھ دیئے، ایک دم اتنی ساری محبت اس ننھے سے
وجود کے لئے اند آئی کہ وہ حیران رہ گیا، پھر جب
رانیہ کو روم میں شفٹ کیا گیا تو وہ اس کے پاس
پہنچے، دادو نے اسے بہت سا پیار کیا اور بچہ اس
کے ہاتھوں میں تھمایا، وہ مسکراتے ہوئے اسے
دیکھنے لگی، ریان نے آگے بڑھ کر اسے مبارک باد
دی۔

”آپ کو بھی بیٹا مبارک ہو۔“ وہ مسکرائی،
اتنی زرد اور نڈھال سی ہو رہی تھی مگر مسلسل مسکرا
رہی تھی، کتنی تکلیف اٹھائی لیکن بڑھ کر اسے نہیں
جگایا، حالانکہ بچے کی اتنی جلدی پیدائش ہی یہ
ثابت کرنے کے لئے کافی تھی کہ وہ کتنی تکلیف
میں تھی، وہ جو چھوٹی سی چوٹ پر چلا اٹھتی تھی، اتنی
بڑی تکلیف سے اس کو خاطر خاموشی سے بہت حد
تک صبر سے گزر گئی، کتنا بدل لیا تھا اس نے خود کو
ریان کے لئے وہ اس کی محبت میں اپنی ذات کی
مکمل نفی کرتے ہوئے اس کی پسند کے سانچے
میں ڈھلنے کی ہر ممکن کوشش کرنے کے بعد حقیقتاً
اس کا دل جیت چکی تھی، ریان کو اس پر بے حد
پیار آ رہا تھا، وہ خود سے عہد کر رہا تھا کہ آئندہ اپنی
ہر غلطی کی تلافی کرے گا، وہ مسکراتا ہوا اس کے
قریب آیا۔

”کیسا لگ رہا ہے؟“ اس کا اشارہ بچے کی
طرف تھا۔

”بہت پیارا۔“ رانیہ نے اسے سینے سے لگا
لیا۔

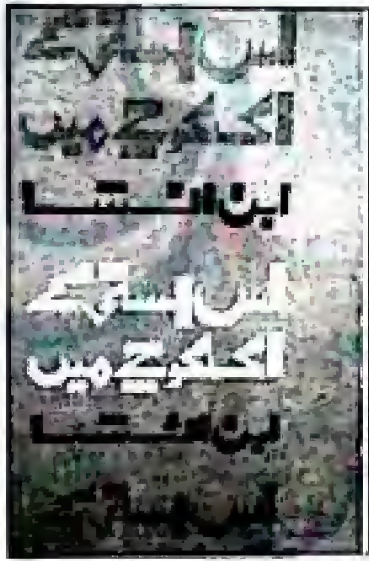
☆☆☆

دو ہفتے انتہائی مصروفیت کے گزرے تھے،
نئی نئی مصروفیت تھی، بچے کے ساتھ راتوں کو جاگنا
اور دن بھر آنے جانے والوں سے ملنا، رانیہ کا تو
دباغ پلپلا ہو گیا تھا، یہ تو ابھی نانا اعیان کو لے کر
بیٹھتی تھیں تو وہ کچھ سو لیتی تھی، ریان آفس سے

شگفتہ شگفتہ رواں دواں



ابن انشا کے شعری مجموعے



آج ہی اپنے قریبی بکسال یا براہ راست ہم سے طلب فرمائیں

لاہور اکیڈمی

پہلی منزل محمد علی امین میڈین مارکیٹ 207 سرکلر روڈ اردو بازار لاہور
فون: 042-37310797, 042-37321690

آنے کے بعد مکمل طور پر اعیان کی طرف ہی متوجہ رہتا، اس کو ایک کھلونا مل گیا تھا، وہ اس کی کیئر بھی بہت کرتا تھا، اس کی سنجیدہ و خاموش طبیعت کو دیکھتے ہوئے کسی کو امید نہیں تھی کہ وہ بچے سے اتنا والہانہ پیار کرے گا، مگر وہ تو اس سے بہت زیادہ محبت کرتا تھا، کتنی کتنی دیر اسے گود میں لئے بیٹھا رہتا۔

رات کو آنکھ کھل جاتی تو اٹھ کر رانیہ کے ساتھ لگ جاتا، کبھی اس کے رونے پر ناگواری ظاہر نہیں کی تھی، کبھی ٹائم بے ٹائم اس کی ضرورت کی کوئی چیز لانے پر مانتے یہ کوئی بل نہیں پڑا تھا، ہاں رانیہ کو وہ بہت چیک کرتا تھا کہ وہ اس کی صحیح کیئر کر رہی ہے یا نہیں، کوئی ذرا کی محسوس ہوتی تو جھڑکنے سے باز نہیں آتا تھا، اعیان جیسے جیسے بڑا ہو رہا تھا، ویسے ویسے ہاتھ پاؤں بھی چلانے لگا تھا۔

اس دن اتوار کی چھٹی تھی، وہ اسے تیار کر کے ریان کو دینے آئی، وہ دادو کے ساتھ لاؤنج میں بیٹھا تھا۔

”یہ اعیان کو لے لیں، میں کچھ کام نبٹا لوں۔“ وہ اسے اس کی طرف بڑھانے لگی کہ اس نے اتنی تیزی سے ہاتھ پاؤں چلائے کہ اس کے ہاتھوں سے چھوٹے چھوٹے بچا، ریان نے جھپٹ کر اسے پکڑا اور دھاڑا تھا۔

”ایسے پکڑتے ہیں اتنے سے بچے کو، ابھی یہ گر جاتا تو۔“ وہ سہم کر پیچھے ہٹی تھی۔

”دادو آپ اس کی خود کیئر کیا کریں، اسے کیا پتہ بچہ کیسے پالتے ہیں۔“

”تو پالنے سے ہی پالنا آئے گا نا۔“

”ایسے آئے گا پالنا، جب دو چار دفعہ اسے گرا لے گی، اگر یہ تم سے گرا تو میں اس کے لئے گوبنس کا انتظام کر لوں گا، تمہیں تو ہاتھ بھی لگانے

نہیں دوں گا۔“

وہ تو صبحِ ردمم میں آیا تھا، رانیہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے، دادو نے تاسف سے سر جھٹکا تھا۔ پھر سارا دن وہ چپ اور کتنی کھینچی رہی تھی، ریان پہلے اس کی کتنی پرواہ کرتا تھا کہ اب فکر ہوتی، جمعے کو نو نو مبر کی چھٹی تھی، وہ پھر سارا دن گھر پر تھا، اپنے معمول کے کاموں سے فارغ ہو کر وہ لیپ ٹاپ لے کر اپنی میلو چیک کرنے لگا کہ اعیان کے رونے کی آواز پر چونکا۔

وہ کیری کاٹ میں اس کے پاس بیڈ پر موجود تھا، اس نے حیرت سے اسے دیکھا، پتا نہیں کب رانیہ اسے چھوڑ گئی تھی، اس نے اسے کیری کاٹ سے نکالا اور گود میں لے کر بہلانے لگا مگر شاید وہ بھوکا تھا۔

”رانیہ..... رانیہ۔“ وہ کچھ تاخیر سے کمرے میں آئی تھی۔

”سنائی نہیں دے رہا، کتنا رو رہا ہے یہ؟“

”تو آپ چپ کروا لیتے نا۔“ اس کے تلخی سے کہنے پر ریان تو سکتے میں ہی رہ گیا تھا۔

”کیا، کیا کہا میں چپ کرواتا تو تم کس مرض کی دوا ہو۔“ ہوش میں آ کر وہ دھاڑا تھا۔

”تو جب گورنس رکھیں گے تو وہ کیسے چپ کروائے گی؟“ وہ بھی ترکی بہ ترکی جواب دے رہی تھی۔

”تو یہ تکلیف ہے تمہیں اب تک، کہ میں نے گورنس کا کیوں کہا، تو ٹھیک ہی کہا تھا میں نے، اس طرح میرا بچہ پا لوگی تو بندوبست کرنا ہی ہوگا۔“

”تو یہ صرف آپ کا بچہ ہے، میرا کچھ نہیں لگتا۔“

”تم بدتمیزی کر رہی ہو رانیہ اور میں بہت برداشت کر رہا ہوں، اسے لو اور فیڈ کرواؤ، کتنا رو

رہا ہے یہ۔“

وہ چپ سی ہو گئی، اعیان کو لے کر فیڈ کروا کر، کندھے سے لگا کر تھپکا، اسے ڈکار آئی تو بیڈ پر لٹا دیا، وہ خوب ہاتھ پاؤں مارنے لگا، ریان نے لیپ ٹاپ سائیڈ پر رکھا اور اس سے مسکرا مسکرا کر باتیں کرنے لگا۔

”آپ یہ نہیں سوچتے کہ آپ اسی طرح مجھے سب کے سامنے ڈانٹیں گے، جھڑکیں گے تو ہمارے بیٹے پر کیا اثر پڑے گا، وہ میری کیا عزت کرے گا، اس کی اچھی تربیت کے لئے تو ہم دونوں کو ہی خود پر قابو پانا ہوگا، ہم خود بروکن فیملیز کے بچے ہیں، ہمیں اپنی محرومیوں کا اچھی طرح پتا ہے تو ہم اپنے بچے کو تو ایک مکمل ماحول، ایک مکمل فیملی دے سکتے ہیں، اس طرح چیخ چلا کر تو ہم اسے بھی اپنا رمل کر دیں گے۔“

ریان تو جیسے اعیان پر جھکا ہوا تھا، کتنی ہی دیر اسی پوزیشن میں رہ گیا تھا، اتنی گہری بات اور رانیہ کے منہ سے، سننے کا تو خواب بھی نہیں دیکھا تھا، بہت دیر خاموشی چھائی رہی، پھر وہ سیدھا ہوتا ہوا مسکرایا۔

”یعنی اب تم ماں بن چکی ہو، تو تمہارا احترام بھی مجھ پر فرض ہو گیا ہے، اچھی بات ہے آئندہ تمہیں مجھ سے یہ شکایت نہیں ہوگی۔“ رانیہ سمجھ نہیں پائی کہ وہ سنجیدہ تھا یا مذاق اڑا رہا تھا۔

”نانو نے کبھی مجھے نہیں ٹوکا، کبھی میری غلطی کو درست نہیں کیا، مجھے تو چھوٹ دیتی گئیں اور اس کی خامیاں نکالتیں رہیں، شاید میں بھی اندر کہیں خود کو مسٹر پرفیکٹ سمجھ کر، اسے ہر بات پر ٹوکنا اپنا فرض سمجھ بیٹھا یہ بھول گیا کہ اب و صرف میری بیوی نہیں، ایک ماں بھی ہے۔“ وہ مسکرا دیا، جانے کیا سوچ کر۔

”چلو تمہیں خود احساس ہو گیا یہ اچھی بات

ہے، اب تم دونوں مل کر اپنے بچے کو وہ سب دو جو تمہیں نہیں مل پایا۔“ دادو شفقت سے مسکرائیں۔
”انشاء اللہ۔“

☆☆☆

اعیان سو رہا تھا، رانیہ صوفے پر بیٹھی کسی گہری سوچ میں گم تھی، ریان پاس آ کر بیٹھا تو وہ چونکی۔

”ناراض ہو؟“

”نہیں، میں تو ناراض نہیں ہوں۔“ وہ بہت دھیمے سے بولی۔

”ہو بھی تو میں منالوں گا۔“ وہ دلکشی سے مسکرایا اس نے نظریں جھکا لیں۔

”میں مانتا ہوں میں بہت جگہ غلط تھا، میں سمجھتا تھا کیونکہ ہم دونوں بروکن فیملیز کے بچے ہیں تو ہم نہ تو ایک مکمل فیملی بنائے گئے نہ ہی بچوں کی صحیح تربیت کر پائیں گے لیکن تم نے تو میرے سارے خدشات کا خاتمہ کر دیا، نہ صرف میرا دل خیال رکھا بلکہ اپنے بچے کی اتنی اچھی دیکھ بھال کی کہ میں اب کہنے پر مجبور ہوں کہ دادو ہماری شادی کر کے ایک بہترین فیصلہ کیا تھا، دو بروکن فیملیز کے بچے تو شاید زیادہ اچھی فیملی بنا سکتے ہیں، وہ جن دکھوں، تکلیفوں اور محرومیوں سے گزر رہے ہوتے ہیں، ان سے اپنے بچوں کو تو کبھی نہیں گزرنے دیں گے، کب کہاں اور کیوں انہوں نے اپنے پیرنٹس کو مس کیا ہوتا ہے، وہاں وہ اپنے بچوں کو مس نہیں کرنے دیں گے، تم نے تو میری آنکھیں کھول دیں رانیہ میرے اندر جو ایک خوف تھا جو تمہاری محبت کو تسلیم نہیں کرنے دیتا تھا، وہ تم نے ایک جھٹکے سے ختم کر دیا ہے۔“ رانیہ نے چونک کر اسے دیکھا، وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا تھا۔

”کیوں تم کیا سمجھتی ہو، محبت صرف تم کرنا ہانتی ہو، میں نہیں کر سکتا۔“ اس کے شرارت سے

کہنے پر وہ جھینپ گئی تھی۔
”میں شروع سے جانتا تھا کہ میری لا ابالی کزن میرے لئے خاص فیملیگر کھتی ہے، مجھے بھی وہ گڑیا بہت پیاری لگتی تھی لیکن میرے اندر کا خوف مجھے تمہاری طرف بڑھنے سے روکتا تھا، اب پتا چلا ہے کہ میں کتنا غلط تھا، اپنی غلطی تسلیم کی ہے تو اپنی محبت کو بھی تسلیم کرنا ہو گا۔“ رانیہ نے غیر یقینی سے اسے دیکھتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔
”مجھے تو نہیں لگتا کہ آپ کو مجھ سے کوئی محبت بھی ہے، اتنے دن ہو گئے، ہماری ناراضگی کو تو آپ نے اسے ختم کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔“

”تو یہ اب کیا کر رہا ہوں، ویسے باقی دا دے آپ کس قسم کی کوشش چاہ رہی ہیں۔“ اس کی معنی خیز بات پر رانیہ کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔
”آپ بہت فضول.....“ ریان کے بے ساختہ قہقہے کی گونج میں اس کی بات ادھوری رہ گئی تھی، خوشیاں اس کے گرد رقص کر رہی تھیں، دکھ، ہرشیانیاں، خدشات وہاں سب کہیں دور رہ گئے تھے۔

بہارِ مطبوعات

ہماری مطبوعات

ماں و باپ	قصہ اللہ شہب
یا خدا	"
طیف نثر	ڈاکٹر سید عبداللہ
طیف نثر	"
طیف اقبال	"
انتخاب کلام میر	سرری عبدالحمید
قواعد اردو	"

لاہور اکیڈمی - لاہور

جسٹس اور جیسا کہ ہے

سونیا چوہدری

ہمدردی کی بھی اس پر نہیں ڈالی تو مجھے اس سے محبت کیسے ہو سکتی ہے؟“

”محبت کیسے پا ایسے نہیں ہوتی ولی احمد، محبت تو بس محبت ہوتی ہے اور یہ ہو ہی جاتی ہے، کسی کو بھی..... کسی سے بھی۔“ اس نے سوچتے ہوئے آنکھیں موند لیں اور کروٹ بدلتے ہوئے

سونے کی سعی کرنے لگا، لیکن شاید آج نیند بھی اس سے روٹھ کر کہیں چلی گئی تھی اور شاید اس کی آج کی رات کروٹیں بدلتے ہی گزرنے والی تھی۔

☆☆☆

آفس میں آج ایک ضروری میٹنگ تھی جس کے لئے ولی کو دس بجے آفس پہنچنا تھا، لیکن رات دیر سے سونے کی وجہ سے وہ جلدی بیدار نہ ہو پایا۔

اس نے مندی مندی آنکھوں سے گھڑی کی جانب دیکھا تو کرنٹ کھاتے ہوئے سیدھا ہو کر بیٹھ گیا، ساڈھے نو ہونے والے تھے، وہ جلدی میں بیڈ سے اتر کر وارڈ روب کی جانب بڑھا اور اپنی مطلوبہ شرٹ ٹوٹنے لگا جو اس کو آج پہننی تھی، مگر وارڈ روب کی حالت اتنی بگڑی ہوئی تھی کہ بے ترتیب چیزیں دیکھ کر اب الجھنے لگا تھا، اقراء کی موجودگی میں ہر چیز اس کو وقت سے پہلے تیار ملتی تھی، غصے میں جو شرٹ اس کے ہاتھ لگی پکڑ کر وہ شاور لینے چلا گیا اور چند لمحوں میں شاور لے کر نکل آیا، وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے سے بال بنا کر ہٹا تو اپنی گھڑی اور والٹ تلاش کرنے لگا،

وہ دس دن پہلے ولی سے ناراض ہو کر اپنے میکے چلے گئی تھی، مگر ولی کو اس کی غیر موجودگی کا احساس اس قدر ستانے لگا تھا کہ اسے لگا وہ سالوں سے اس دور ہو۔

لیکن آخر کیوں؟؟؟

”آخر کیوں ہمیں کسی بھی چیز کی قدر اس وقت ہوتی ہے جب وہ ہم سے دور چلی جائے۔“ ولی نے آنکھیں موندے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے ہوئے سوچا تو دفعتاً وحشت کے احساس سے سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

”ولی احمد ابھی میں آپ کے پاس ہوں اسی لئے آپ میری قدر نہیں کرتے مگر آپ دیکھئے گا جب ایک دن میں آپ سے دور چلی جاؤں گی تو آپ کو میرا احساس ہو گا اور تب آپ دوڑے دوڑے میرے پاس چلے آئیں گے۔“ ناراضگی میں کہا گیا اقراء کا جملہ سوچوں سے نکل کر اس کی سماعتوں سے ٹکرایا تو ولی نے سر جھٹکتے ہوئے خود کو تارل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے سامنے وال کلاک کی جانب دیکھا۔

رات کے دو بج چکے تھے اور وہ اب تک صرف اس کی یاد میں جاگ رہا تھا۔

”کیوں؟ ولی احمد کہیں تمہیں اس عورت سے محبت تو نہیں ہو گئی؟“ دل کے کسی کونے سے بہت ڈرتے ڈرتے یہ آواز باہر نکلی تھی۔

”محبت اور وہ بھی اقراء سے؟ بھلا میں اس سے محبت کیسے کر سکتا ہوں؟ میں تو ہمیشہ سے اس سے نفرت کرتا آیا ہوں، میں نے تو کبھی اک نظر



چیزیں تلاش کی اور بنانا شستے کے ہی باہر پورچ
میں چلا آیا، گاڑی کے قریب پہنچ کر اس کو یاد آیا
کہ وہ گاڑی کی چابی تو ڈریسنگ ٹیبل پر ہی بھول
آیا ہے، ولی نے جھنجھلاتے ہوئے اپنے قدم
واپس کمرے کی جانب بڑھائے اور ڈریسنگ

ولی اکثر آفس جانے سے پہلے اپنا والٹ گھڑی
اور موبائل بیڈ کی سائیڈ ٹیبل سے اٹھاتا تھا لیکن
آج وہاں والٹ تھا نہ گھڑی اور نہ ہی اس کا
موبائل، اب تو آفس جانا بھی اس کو عذاب لگنے
لگا تھا، اس نے مختلف جگہوں سے اپنی مطلوبہ

نیل سے چابی اٹھاتے ہوئے اس کی نظر وہاں بڑی ایک تصویر پر ٹھہر گئی، وہ ان دونوں کی شادی کی تصویر تھی، جس میں اقراء نازک پری کی مانند نظریں جھکائے ہلکی سی مسکان لبوں پر سجائے ولی کے ہمراہ کھڑی بے حد مطمئن سی لگ رہی تھی، مگر ولی..... ولی کے چہرے پر تو خفگی غصہ، اکتاہٹ ہر طرح کے آثار صاف نمایاں تھے۔

آخر کیوں وہ اقراء سے گریز کرتا تھا؟ محض اس لئے کہ وہ اس کے والدین کی پسند تھی؟ نہیں بلکہ اس لئے کہ اس کو ہر عورت سے ہی نفرت ہو چکی تھی، صرف اور صرف ایک عورت کی وجہ سے، جس سے کبھی وہ بے حد محبت کرتا تھا، جس کو وہ بہت چاہتا تھا اور وہی عورت اس کو دھوکہ دے کر کسی اور کے ہمراہ چل دی تھی، لیکن ان سب میں اقراء کا کیا قصور تھا؟ اس نے اب تک اقراء کو کیوں اس کے تمام حقوق و فرائض سے محروم رکھا ہوا تھا، وہ تصویر کی جانب بغور دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا، جب موبائل پر آنے والی کال نے اس کو خیالوں سے حقیقت کی دنیا میں واپس آنے میں مدد کی تھی، اس نے فون کان سے لگایا تو اس کے نی اے کی کال تھی، ولی نے دس منٹ میں آفس پہنچنے کی اطلاع دیتے ہوئے فون آف دیا اور واپس ایک نظر تصویر کو دیکھ کر آفس کے لئے روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

”اقراء تمہیں ایسے گھر چھوڑ کر نہیں آنا چاہیے تھا، تم تو اب تک ولی کی سحر سے واقف ہو چکی ہونا کہ وہ کیسا ہے اور اگر وہ تمہیں لینے نہیں آئے گا تو کیا تم کبھی واپس نہیں جاؤ گی؟“ اقراء کی بہن ایمل نے فکر مندی سے پوچھا۔

”وہ آئے گا ایمل، وہ ضرور آئے گا، ایسا میں نہیں میرا دل کہتا ہے اور دل کبھی جھوٹ نہیں

بولتا، لیکن ایک بات تو طے ہے ایمل، اب جب تک وہ اپنی مرضی اور خوشی سے مجھے لینے نہیں آئے گا میں بھی نہیں جاؤں گی۔“ اقراء کے لہجے میں یقین کے ساتھ سنجیدگی بھی تھی۔

”لیکن تم ایک بار اسے کال تو کر لو؟“ ایمل نے التجائی انداز میں کہا۔

”کیوں؟ میں کیوں کروں کال؟ کیا اس کے پاس میرا نمبر نہیں ہے؟ کیا اس کو میری ضرورت نہیں ہے؟ ایمل پچھلے ایک سال سے میں ہی ہر کام میں پہل کرتی آئی ہوں، مگر اب مجھے لگتا ہے اگر میں مزید خاموش رہی اور اس کو اپنے رشتے کا احساس نہ کروایا تو وہ کبھی بھی میری کمی کو میری ضرورت کو میری اہمیت کو محسوس نہیں کر پائے گا اور میں بہتر جانتی ہوں کہ میں نے اپنے شوہر کو اب کیسے اپنا احساس کروانا ہے، چار دن اور گھر کے معاملات سنبھالنے پڑیں گے تو یاد میں ہی آؤں گی۔“ اقراء نے شرارت سے مسکراتے ہوئے کہا۔ ایمل کو بھی جبراً مسکرانا پڑا، وہ بس اپنی بہن کو ہر حال میں خوش دیکھنا چاہتی تھی۔

☆☆☆

اقراء نے ولی سے فرمائش کی تھی کہ وہ اس کو آکس کریم کھلانے کہیں باہر لے کر جائے تو ولی نے اقراء کو دسمبر کی سردی کا احساس دلانے کے بجائے کہ وہ اتنی سردی میں آکس کریم کھائے گی تو بیمار بھی ہو سکتی ہے، اس کو اتنا ڈانٹا کہ وہ اپنی الٹی سیدھی فرمائشیں لے کر اس کے پاس نہ آیا کرے اور اگر اس کا زیادہ کچھ کھانے پینے کا دل چاہے تو اکیلی ہی چلی جایا کرے، مگر اس کو تنگ مت کیا کرے۔

اس دن اقراء اس کی ڈانٹ کے بعد پوری رات روٹی رہی تھی اور وہ سکون کی نیند سویا ہوا تھا، تب ہی اقراء نے سوچا کہ وہ اپنے والدین کے

دونوں بہت گہرے دوست تھے، آفتاب جانتا تھا دلی کا اقراء کے ساتھ اچھا رویہ نہیں ہے، اس لئے موقع ملتے ہی اس کو سمجھانے لگتا تھا۔

”عورت مرد سے صرف عزت اور محبت چاہتی ہے، لیکن تم نے تو نہ کبھی ان کو عزت دی ہے اور نہ ہی محبت، ان کا قصور کیا ہے یار؟“ آفتاب نے کافی کاگ ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔

”مجھے نہیں پتہ اس کا کیا قصور ہے.....“

لیکن کیا؟ اگر تم نے یہی رویہ اختیار کرنا تھا تو تم شادی ہی مت کرتے جو گیوں کی طرح ہی اس بے وفا کی یاد میں اپنی ساری زندگی گزار لیتے، کم از کم اپنے ساتھ کسی بے گناہ کی زندگی تو برباد مت کرتے۔“ آفتاب عاجز آ گیا تھا اس کو سمجھاتے سمجھاتے۔

دلی نے گہری نظروں سے آفتاب کی جانب دیکھا اور خاموشی سے کافی کے گھونٹ حلق سے اتارنے لگا۔

☆☆☆

شال اوڑھے اداسی میں ڈوبی وہ تنہا بالکونی میں کھڑی دلی کے بارے میں ہی سوچ رہی تھی، نہ جانے اس نے کچھ کھایا ہوگا کہ نہیں، وہ سونے سے پہلے کافی ضرور پیتا تھا پتہ نہیں وہ خود بناتا بھی ہوگا کہ نہیں یا بنا کافی کے ہی سو جاتا ہوگا، صبح آفس جاتے اس کو اپنا موبائل ڈھونڈنے میں مشکل تو نہیں ہوتی ہوگی کیونکہ دلی کی عادت تھی جہاں بھی بیٹھتا تھا موبائل وہیں رکھ کر بھول جاتا تھا، اداسی سے اس کی آنکھوں میں نمی اترنے لگی، وہ شادی کے بعد پہلی بار اتنے دن تک اپنے والدین کے گھر رہی تھی، اس کو دلی سے محبت کے ساتھ اس کی عادت بھی ہو چکی تھی، سب کے سامنے وہ خود کو کیسے مارل اور خوش رکھتی تھی یہ بس

گھر چلی جائے گی اور اب کبھی واپس نہیں آئے گی، جب کسی کو یہاں اس کی ضرورت ہی نہیں کوئی فکر ہی نہیں تو واپس آ کر کرے گی بھی کیا۔ اگلی صبح اس نے دلی کو اپنے جانے کی اطلاع دی تو وہ نہ حیران ہوا اور نہ ہی پریشان، دلی نے اس کو روکنے کی بھی کوشش نہیں کی تھی اور وہ اداس سی ایک نگاہ اس کے سنجیدہ چہرے پر ڈال کر چلی آئی۔

☆☆☆

میٹنگ کے بعد وہ آفتاب کے ہمراہ اس کے بہت زور دینے پر کافی بار چلا آیا، وہ دونوں کونے میں کھڑکی کے قریب گئے ٹیبل پر چلے آئے۔

آفتاب کرسی کھسکا کر دلی کے سامنے آ بیٹھا، آفتاب نے ویٹر کو ہاتھ کی انگلی کے اشارے سے دو کپ کافی کا آرڈر دیا، تو چند ہی لمحوں میں ویٹر باپ اڑاتے کافی کے دھگ ان کو پیش کر گیا۔

دلی کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا، یہ دسمبر کے آخری دنوں میں سے ایک دن تھا، وہ کسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا جب آفتاب کے مخاطب کرنے پر اس کی جانب متوجہ ہوا۔

”کیا تم اب تک بھابھی کو واپس نہیں لے کر آئے؟“ آفتاب نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا تو وہ اس نے نظریں چرا لیں اور چند ثانیے بعد کچھ کھوئے ہوئے سے انداز میں بولا۔

”اس کو واپس آنا تھا تو گئی ہی کیوں؟“

”کیونکہ وہ تمہاری اس بے رخی سے تنگ آ گئی ہوگی، آخر کوئی کب تک برداشت کرے گا دلی؟ وہ تم سے چاہتی ہی کیا ہے؟ صرف تمہاری محبت اور تھوڑی سی توجہ؟ جو کہ ان کا حق بھی ہے۔“ آفتاب نے دلی کو سمجھاتے ہوئے کہا، وہ

وہی جانتی تھی، لیکن اتنے دن گزرنے کے بعد بھی جب ولی نے اس کی کوئی خبر نہیں لی تو وہ اندر ہی اندر ٹوٹ کر بکھرنے لگی تھی۔

☆☆☆

تھکا ہارا شام کو جب وہ آفس سے لوٹا تو جوتے اتار کر ٹی وی لاؤنج میں صوفے پر ہی ٹھہال سا ہو کر گر گیا، اس نے پورے دن میں صرف ایک کپ کافی پی تھی وہ بھی آفتاب کے بہت کہنے پر، اب اس کو شدید بھوک کا احساس ہوا تو وہ اٹھ کر کچن میں چلا آیا، سینک میں رات کے کھانے والے برتن اب تک پڑے تھے، اس نے فریج کھول کر کچھ کھانے کے لئے ڈھونڈا مگر سب کچھ ختم ہو چکا تھا، گھر کی مالکن کے بغیر گھر بالکل بے ترتیب ہو چکا تھا۔

”عورت بے جان بنی اینٹوں کی عمارت میں جان ڈالتی ہے اور جس گھر میں عورت موجود نہ ہو وہ ایسا ہی ہوتا ہے، بے ترتیب، بکھرا اور ادھورا۔“ ولی نے اکتا کر فریج کا دروازہ زور سے بند کیا اور واپس لاؤنج میں چلا آیا، اس نے ٹیبل سے گاڑی کی چابی اٹھائی اور جیکٹ پہنتا ہوا گھر سے نکل گیا۔

کئی لمحے وہ یونہی سڑک پر گاڑی بھگاتا رہا، اس کو بھوک بھی لگی تھی لیکن کچھ کھانے کا دل بھی نہیں چاہ رہا تھا، سردیوں میں سورج جلد ہی غروب ہو جاتا ہے، ولی نے گاڑی سڑک کنارے کھڑی کی اور خود باہر نکل آیا، اس نے آسمان کی جانب نظریں اٹھائیں، آسمان بادلوں کی اوٹ میں چھپا ہوا تھا، ہوا سرد ہو جھل اور نم ہو چکی تھی، کچھ دیر کھڑا رہنے کے بعد وہ واپس گاڑی میں آکر بیٹھ گیا، اس نے کچھ کھوئے کھوئے سے انداز میں چابی انکیشن میں گھمائی اور گاڑی اشارت کرتے ہوئے اقراء کے گھر کی جانب

روانہ ہو گیا۔

چند منٹوں کی ڈرائیونگ کے بعد وہ اقراء کے گھر کے سامنے تھا، گھر میں داخل ہوا تو اقراء کی امی سفینہ بیگم اور ایمیل لوگ روم میں آتش دان کے قریب بیٹھے دسمبر کی سرد شام میں چائے سے لطف اندوز ہو رہے تھے، ولی نے آگے بڑھ کر انہیں سلام کیا تو سفینہ بیگم نے پر جوش انداز میں اس کی سلام کا جواب دیا اور اس کے استقبال میں کھڑی ہو گئیں، ان کے اتنی عزت دینے پر ولی آج پہلی بار اندر ہی اندر شرمندہ ہوا تھا، ان کی بیٹی کے ساتھ اتنی نا انصافی کرنے کے بعد بھی وہ اس کو کتنی عزت اور مان دیتی تھیں، یا پھر شاید اقراء نے ایمیل کے علاوہ بھی کسی اور سے ولی کی بے رخی اور اس کے رویے کے بارے میں شیئر نہیں کیا تھا، اسی لئے اقراء کے والدین اس سے اتنے پر جوش انداز میں ملتے تھے۔

”آؤ بیٹھو بیٹا!“ سفینہ بیگم نے شائستگی سے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ صوفے پر براجمان ہو گیا۔

”ایمل جاؤ بیٹا ولی کے لئے چائے لے کر آؤ، اتنی سردی میں باہر سے آیا ہے۔“ سفینہ بیگم نے چائے پیتی ایمیل سے کہا تو اس نے بغور ولی کو گھورا اور بنا کچھ کہے کچن کی جانب بڑھ گئی۔

”اور بتاؤ واپس کب آئے؟ اقراء بتا رہی تھی تم کام کے سلسلے میں شہر سے باہر گئے تھے۔“ سفینہ بیگم نے بتایا تو ولی نے دل ہی دل میں اقراء کی مخلصی کو سراہا کہ اس نے ناراضگی میں بھی ولی کا مان رکھا تھا۔

”جی بس آج ہی واپسی ہوئی ہے، تو اقراء کو لینے چلا آیا، کہاں ہے وہ؟“ ولی نے تلاشتی نظروں سے لاؤنج میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”وہ ابھی کچھ دیر پہلے ہی اپنے کمرے میں

گئی تھی، میں ابھی بلاتی ہوں۔“ سفینہ بیگم اٹھ کر جانے لگی کہ اقراء ہاتھ میں چائے کے ساتھ تمام لوازمات کی ڈش تھامے داخل ہوئی، ایمل نے شاید اس کو ولی کے آنے کی خبر کر دی تھی، وہ ولی کی جانب دیکھے بغیر ڈش ٹیبل پر رکھ کر سلام کرتی ہوئی سامنے صوفے پر بیٹھ گئی، وہ ولی کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے موبائل کی جانب متوجہ ہو گئی، وہ جان بوجھ کر اس کو انگور کر رہی تھی۔

”اقراء ولی تمہیں لینے آیا ہے، جاؤ بیٹا تیار ہو جاؤ۔“ سفینہ بیگم نے محبت سے مسکراتے ہوئے کہا تو اقراء نے ولی کی جانب دیکھا جو پہلے سے ہی اس کو دیکھ رہا تھا، اقراء کو اس کی حالت دیکھ کر تکلیف بھی ہوئی تھی لیکن وہ جان بوجھ کر اس کو چھوڑ کر آئی تھی کہ وہ اس کی کمی محسوس کرے، وہ ولی کو صرف اس کی زندگی میں اپنے ہونے کا احساس کروانا چاہتی تھی، جو کہ وہ کروا چکی تھی، ولی کی حالت اس کو بتا رہی تھی کہ اس نے یہ دن کیسے گزارے ہیں۔

بڑھی ہوئی شیو، بکھرے بال اور چہرے پر چھائی برسوں کی سی تھکاوٹ اس کی کیفیت بیان کر رہی تھی۔

اقراء بنا کچھ بولے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی آئی جہاں ایمل پہلے سے موجود تھی، اقراء کے پاؤں مارے خوشی کے زمین پر نہیں پڑ رہے تھے، اس نے جھوم کر خوشی سے ایمل کو گلے سے لگالیا تو ایمل بھی مطمئن سی ہو کر مسکرا دی۔

”آخر تمہارا پلان کامیاب ہو ہی گیا۔“ ایمل نے شرارت سے اس کو چھیڑتے ہوئے کہا تو وہ کھلکھلا اٹھی۔

”وہ تو ہونا ہی تھا، آخر ولی صاحب کب تک اپنی حسین بیوی سے دوری اختیار کر سکتے تھے۔“ اقراء نے ہنستے ہوئے کہا تو ایمل بلند آواز

میں ہنسنے لگی۔

”اچھا اب ہنسنا بعد میں میرے ساتھ پہلے میرا سامان پیک کروانے میں مدد کرو۔“ اقراء نے بیگ میں اپنا ضروری سامان رکھتے ہوئے کہا، چند لمحوں بعد وہ دونوں واپس لاؤنج میں چلی آئیں۔

”چلیں؟“ اقراء نے سپاٹ لہجے میں ولی کی جانب دیکھتے ہوئے کہا تو وہ بھی جانے کے لئے کھڑا ہو گیا۔

دونوں سفینہ بیگم اور ایمل سے اجازت طلب کرتے ہوئے وہ گاڑی میں آ بیٹھے، ولی نے اب تک اس کو مخاطب نہیں کیا تھا تو اقراء نے بھی اس سے کوئی بات کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

کئی لمحے وہ خاموشی سے ڈرائیو کرتا رہا اور پھر اپنی اناضدا اور بے رخی کو ختم کرتے ہوئے آج پہلی بار وہ اس سے نرم لہجے میں مخاطب ہوا تھا۔

”کیسی ہو؟“

”آپ کے بغیر کیسی ہو سکتی ہوں؟“ اقراء نے سوال کے بدلے میں سوال کر ڈالا تو وہ چند ثانیے کے لئے خاموش ہو گیا۔

”تم مجھے چھوڑ کر کیوں چلی آئی تھی؟“ ولی نے نظریں سامنے سڑک پر جمائے ہوئے سنجیدگی سے پوچھا۔

”تو آپ نے مجھے جانے سے روکا کیوں نہیں تھا؟“ اقراء نے ٹنک کر کہا۔

”تمہیں نہیں جانا چاہیے تھا۔“ ولی کے لہجے میں شکایت تھی۔

”آپ کو بھی جانے سے روکنا چاہیے تھا۔“ اقراء بھی شکوہ کرنا نہیں بھولی تھی۔

”معذرت چاہتا ہوں۔“ ولی نے بے بسی سے کہا۔

”آپ کی معذرت قبول کی جاتی ہے۔“

اقراء نے مسکرا کر اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا تو ولی نے بریک لگا کر گاڑی روکی اور بنا کچھ کہے گاڑی سے اتر گیا، اقراء بھی نا بھگی کے سے انداز میں اس کے ساتھ گاڑی سے اتری، باہر ہلکی ہلکی رم بھم برس رہی تھی، ہوا میں بے حد خشکی تھی۔

ولی سامنے ایک گلابوں کے اشال کی جانب بڑھ گیا اور ایک سرخ گلاب کا بکے خرید کر واپس اس کے قریب چلا آیا۔

رات جیسے جیسے ڈھلتی جا رہی تھی سردی کی شدت کا احساس بھی بڑھ رہا تھا، اقراء نے کندھوں سے سرکی ہوئی شال کو درست کرتے ہوئے سامنے کھڑے ولی کو دیکھا۔

”یہ گلاب تمہارے لئے، میں چاہتا ہوں اب ہمیشہ تمہاری زندگی کو ان پھولوں کی طرح مہکا دوں، اب کبھی تمہیں خود سے دور نہیں جانے دوں گا، تم نہیں جانتی اقراء یہ دس بارہ دن میں نے کس طرح گزارے ہیں، تم میری چھوٹی سے چھوٹی ضرورت کا خیال کیسے رکھتی تھی یہ مجھے تمہارے جانے کے بعد احساس ہوا، تم دور ہوتے ہوئے بھی بہت قریب تھی میرے، تمہارے بغیر گھر کے ساتھ میری زندگی بھی بے ترتیب ہونے لگی تھی، اس لئے میں تمہیں لینے چلا آیا کہ تم مجھے اور ہمارے گھر کو ترتیب دے سکو، تمہارا وجود میرے لئے میرے گھر کے لئے کتنا ہم ہے یہ میں اب جان پایا ہوں، میں نے تمہیں بہت ستایا ہے اقراء، پلیز مجھے معاف کر دو۔“ ولی اس کے روبرو کھڑا اپنے کیے کی معافی مانگ رہا تھا، اقراء کی آنکھوں میں نمی تھی اور لبوں پر مسکراہٹ، اقراء نے محبت سے ولی کا ہاتھ مضبوطی سے تھام کر اس کی شرمندگی کو کم کرنا چاہا۔ ہلکی ہلکی رم بھم دفعتاً تیز بارش کی شکل اختیار کر گئی تو وہ دونوں گاڑی میں آ کر بیٹھ گئے۔

”ولی!“ اقراء نے مخصوص دھیمے لہجے میں اس کا نام پکارا، وہ گاڑی سے باہر تیز برستی بارش کو دیکھ رہا تھا۔

”ہوں۔“

”آپ تو واقعے ہی میرے بغیر بہت بے ترتیب ہو گئے ہیں اور اس کا ثبوت آپ کے موزے دے رہے ہیں، ایک جراب اور تو دوسری اور ہے۔“ اقراء نے اپنی مسکراہٹ دہاتے ہوئے معصوم سی شکل بناتے ہوئے کہا، وہ جب گھر میں لاؤنج میں صوفے پر بیٹھا تھا اقراء نے اس وقت ہی اس کے پاؤں میں الگ الگ موزے دیکھ لئے، لیکن اس وقت وہ بمشکل اپنی ہنسی پر قابو پاسکی تھی، اقراء کے بتانے پر ولی نے بے اختیار اپنے پاؤں میں پہنی جرابوں کو دیکھا، ولی کا جاندار قہقہہ گاڑی میں گونجا تھا۔

”یار بس دیکھ لو ثبوت بھی میں ساتھ لے کر آیا تھا کہ میں کس قدر بے ترتیب ہو گیا ہوں۔“ ولی نے بمشکل اپنی ہنسی روکتے ہوئے کہا۔

”اور اس وقت تم جوتوں جرابوں پر نہیں بلکہ مجھ پر توجہ دو۔“

”اس لمحے صرف تم میں اور یہ حسین بھیگا دمبرا ہم ہے۔“ ولی نے محبت سے کہا تو اقراء نے مسکراتے ہوئے اس کی جانب دیکھا اور ولی نے گاڑی اشارٹ کرتے ہوئے گھر کے راستے پر ڈال دی، دونوں کی زندگی ایک دوسرے کے ساتھ پا کر مکمل ہو گئی تھی اور اس بھیکے دمبرا نے ان دونوں کے ان لمحوں کو چار چاند لگا دیئے تھے۔

☆☆☆

تیرا جانتا کے نام

سیمانت مریم



وہ لاکھ سر پٹختی واویلا کرتی مگر اس کے ہمراہ
اماں کا دم پھٹا لگا رہنا اک لازمی امر تھا، جن کا
خیال تھا کہ وہ اتنی تالاق تھی کم عقل ہے کہ کوئی بھی
منہوں میں اسے بے وقوف بنا سکتا ہے، خیر یہاں
تک بھی درست تھا مگر جو اس ضمن میں اماں کے
ال فینر ڈرویے تھے اکثر اوقات اسے جی بھر کے
پشیمان کیا کرتے، رستے میں کسی جان پہچان
والے یا والی کا ٹکراؤ اماں کو گھٹنے بھر کے لئے
”بک“ کر دیا کرتا عین راستے میں کھڑے ہو کر
جس کے خاندان بھر کی خیریت سے واقفیت اماں
کے لئے لازم و ملزوم، ایسے میں اس کی سیروں
کے حساب سے بڑھتی کوفت کا تو کوئی شمار ہی نہ تھا
جس کے چہرے کے بننے بگڑتے زاویے اس کی
برمزیگی کا کھلم کھلا اعلان کیا کرتے۔

تجہی کے بیاہ کر آنے کے بعد اس نے سکھ کا
سانس لیا تھا، انہوں نے جی بھر کے اکثر بازاروں
کے پھیرے لگائے تھے دوستوں کے گھر یہاں
تک کہ کالج کی پچھڑی بھولی بسری سہیلیاں بھی
اسے یاد آتی گئیں مگر ابھی اس کا سکھ کا سانس
راستے ہی میں تھا کہ تجہی کی حالت کے پیش نظر
اماں نے ڈھیروں ڈھیر دفعات اس پہ نافذ کر
دیں جن کی بجا آوری پر بہر حال تجہی بھی مجبور تھی،
تجہی اس کی ہم عمر سہیلی مگر اپنے اس گھر سے رشتے
کی نزاکت کو بھی سمجھا کرتی تھی اور درینہ بلا مانعہ
اس کی ہمت پر اس کی پیٹھ ٹھونکا کیا کرتی، بھلا
اماں جیسی نان شب ہستی کو راضی رکھنا آسان
کام تھا اور ابھی ہفتہ بھی نہ گزرا تھا کہ دوپہر کی نام
نہاد ٹکڑی بیماریوں نے اک نیا رخ بدلا اسے نہ
چاہتے ہوئے بھی ہسپتال کا منہ دیکھنا ہی پڑا،
صاف ستھرے چکنے ماربل کے فرش، ڈاکٹرز کے
خوبصورت گلاس والے کمرے، آدھا تو
مریض یونہی اپنا مرض بھول جاتا ہے ورنہ

ہسپتالوں کی روائتی گندگی اس کی طبیعت ہمیشہ
مکدر کر دیا کرتی تھی اور ایسے میں اماں کا شل
کاک برقعے سے سجاد جود ہولنا، کھولنا جن کی غالباً
پیدائشی بیماری تھی، ویننگ لاؤنج میں سنگی بیچ پر
بیٹھنے کا لازمی بولڈو بے تکلفانہ انداز اسے نظریں
اٹھانے لائق نہ چھوڑتا، وہ فراغت پا کر اونگھنے بھی
لگا کرتیں اور یہی وہ موقع ہوتا جب وہ اطمینان
سے ڈاکٹر کے روم کا رخ کر سکتی تھی ورنہ ٹکھوڑ
مارے جوان جہان ڈاکٹر بھلا اماں کی نظروں میں
قابل اعتبار ٹھہرے ناممکن، مگر ان کا اونگھنا در یہ کو
مزید شرمندگی سے بچا گیا اور دو چار روز میں اماں
کو ہسپتال کے عملے سمیت ڈاکٹر پر بھی اعتبار آ ہی
گیا۔

وہ مزید فراغت اور یکسوئی سے اونگھنے کا
پروگرام جاری رکھا کرتیں اور در یہ چند سکوں کے
سانس لیتی، انتہائی اعتماد سے ریسپشن پر جا کر نام
درج کرواتے نمبر لیتے ہوئے وہ پل بھر کو اپنے
آپ کو خاصا پر وقار محسوس کیا کرتی تھی، مگر وہ جو
اک مثل ہے ناں، آسمان سے گرا مجبور میں انکا،
غالباً ایسے مواقعوں کے لئے استعمال کی جاتی
ہے، اس کا تیسرا ایا چوتھا چکر تھا جب خوش پوش دور
سے اسمارٹ نظر آنے والے ڈاکٹر کی نظریں پیغام
دیتی محسوس ہونے لگیں اور مزے کی بات یہ تھی کہ
اس کی بد مزگی بھی نہ اثر انداز ہو سکی اور آج بھی وہ
اسے دیکھ کر قدرے کھل سا گیا تھا۔

”زہے نصیب، آج دیر ہو گئی آپ کو۔“
اس نے بے ساختہ گھڑی کی جانب دیکھا تھا اور
در یہ کے دل کی دھڑکنوں نے اپنی لے تبدیل کر
لی (بس یہیں تو مات کھا جالی ہیں در یہ جیسی
لڑکیاں)۔

”آپ نے انتظار کیا۔“ تجہی کا خیال تھا اور
غالباً درست ہی تھا کہ وہ خاصی حاضر جواب ہے،

وہ جواباً ہولے سے ہنسا اور یونہی تھرما میٹر اٹھا کر
کے کرنے لگا۔

”منہ میں ڈالیں انشاء اللہ پارہ
اضافی حدود کراس کر جائے گا۔“

”خیریت۔“ وہ پھر ہنسا غالباً یہ ادراک
اسے پہلے ہی نصیب ہو چکا تھا کہ اس کی ہنسی
خاصی دلکشی رکھتی ہے۔

”خیریت ہوئی تو یہاں نظر آتی؟“ اس
کے تیور خونخوار تھے۔

”ارے تو حال چال ہی بتا دیجئے۔“
”حال خاصا بد حال ہے مگر چال چلن
نیک۔“

”گڈ۔“ انہوں نے کہتے ہوئے تھرما میٹر
اس کی جانب بڑھایا تھا۔

”منہ بند کروانا تھا تو ویسے ہی بتا دیتے، اس
کی کیا ضرورت تھی؟“

”تمہاری یہی باتیں سننے کے لئے تو تمہارا
انتظار کرتا ہوں اور معلوم ہے دنوں سرشار رہا کرتا
ہوں، تمہاری یہی گفتگو یاد کر کر کے سر اور ایسا ہوتا
ہے ناں، جب مقابل ہماری ہر کڑوی کسلی کو طرح
دے جائے تو یونہی بناوٹی غصہ کر کر کے ایسے ناز
اٹھواتا اچھا لگتا ہے اور غالباً اسی سے مات کھائی
جاتی تھی۔“

☆☆☆

”اسے کہتے ہیں، شکل چڑیلوں کی مزاج
پریوں کے، ایک آنکھ نہیں بھاتے مجھے اس لڑکی
کے لیل و نہار، سمجھ میں نہیں آتا اس کا بنے گا
کیا؟“ اماں کے ایور گرین راگ جاری تھے۔

”پیسہ پانی کی مانند بہہ رہا ہے مگر اسے ذرا
خیال نہیں، اسے ایسا کون سا اللہ مارا مرض ہوگا جو
جا کے نہیں دے رہا، گلے کے غدد پھولے
ہوئے ہیں آئے روز بخار کا بہانہ کر کے پڑی رہتی

تھی اور اسے ان کاموں کو اس کی اپنی حرکتوں نے
پہنچایا ہے، سینکڑوں کے حساب سے دن بھر میں
چھالیہ کی پڑیاں کھا جاتی تھی اور خرا دیکھو، سرکاری
ہسپتالوں سے گھن آئی ہے شہزادی صاحبہ کی خاطر
پرائیویٹ ہسپتال کا منہ دیکھنا پڑا مگر ذرا جو اسے
احساس ہو، ذرا افاقہ نصیب ہوا اور محترمہ نے
چھپ چھپا کر کیری کترنی شروع کر دی، دواؤں
کے بل کا تو کوئی حساب ہی نہیں مگر ان کے کون
سے پلے سے جا رہا ہے جو یہ احساس کریں، کم
بخت نے ہمیشہ میرا دل جالایا ہے نہ ڈھنگ سے
پڑھ کر دیا نہ گھریلو کام کاج کی سدھ بدھ، میں تو
سوچتی ہوں کون لے کر جائے گا عقل کا اندھا
گانٹھ کا پورا اس بے نتھنے نیل کو۔“ اور اس میں
کوئی شک نہیں کہ اس کے ازلی لا پرواہ و غیر ذمہ
دارویوں نے اماں کی جان عذاب کر رکھی تھی وہ
جتنا جھلا نہیں کم تھا۔

”لوٹھا کی لوٹھا ہو گئی مگر تیز نام کو نہیں، بچوں
کی مانند کرکٹ سے لگوالو، جھولے کی اونچی اونچی
پینکس لینا بھلے سے ماں کا دل ہولتا ڈوبتا ہی
رہے، گھٹنے گھٹنے بھرنون پر گفت و شنید اور اگر جو
فراغت نصیب ہو جائے تو موئے کیبل کے بے
ہودہ پروگرام جو دن رات ایمان خراب کیا کرتے
ہیں، جب دیکھو کوئی نہ کوئی منحوس ماری سہیلی منہ
اٹھائے چلی آرہی ہے، بتائے دیتی ہوں اس کی
ساری سہیلیوں کا بائیکاٹ نہ کیا تو میرا نام نہیں
ہا۔“ وہ جانے کسے سنا رہی تھیں اور کس سے
مخاطب تھیں، جی اپنے کمرے کے کسی کونے
کھدرے میں کھسی تھی جبکہ وہ دیر سے آنگن میں
پڑے جھولے پر جھولے لیتے ہوئے ان کی
لتاڑیں سنتے ہوئے کچی کیری چبا رہی تھی جسے
چوری سے کترنے پر اماں کے عیض و غضب کو
دعوت ملی تھی، اماں جانے کب تک جاری رہیں

اور اس کی شکل ان کے غصے کو مزید ہوا دیتی رہتی، ناچار اس نے ایک لمبی پیٹنگ لیتے ہوئے دھپ سے آنگن کے فرش پر قدم رکھے، اماں نے دہل کر کليجے پر ہاتھ رکھا اور شعلہ بارنگا ہوں سے اسے گھورا جو ان کی سابقہ جھاڑ لا پرواہی سے جھٹک کر مجھی کے کمرے کا رخ کر چکی تھی، وہ عادت کے مطابق دھپ سے اس کے بیڈ پر گرمی تو الماری میں منہ گھسیڑے مجھی نے مڑ کر اسے دیکھا اور مسکرائی۔

”سن لیں اماں کی سخت سست، ہفتے بھر کی ڈوز ایک ہی روز میں، کیا ضرورت تھی کھلم کھلا ان کے سامنے یوں کیری کترنے کی۔“

”جب انہوں نے چوری سے کھاتے پکڑ ہی لینا تھا تو پھر چھپا کر کھانے کی کیا تک۔“

”پھر گلے سوچ جائیں گے اور پڑی نظر آو گی بخار میں، اماں کا غصہ بے جا نہیں۔“

”جب مسیحا ہی اتنا دلکش ہو تو کس کافر کا دل چاہے گا صحت مند ہونے کو۔“ اس نے مسکراتے ہوئے آنکھیں موند لیں۔

”اماں تک پہنچا دوں تمہارے زریں خیالات۔“ وہ شرارت سے مسکرائی۔

”وقت آنے دو انشاء اللہ یہ کام تم ہی نے انجام دینا ہے۔“

”صرف چند ملاقاتوں میں اتنا بڑا فیصلہ، محترمہ یہ زندگی ہے فلم نہیں، حقیقت کی دنیا میں واپس آؤ۔“

”کاش تم نے بھی خوابوں کی دنیا میں جا کر رہنا سیکھا ہوتا، کتنا دل خوش کن ہوتا ہے وہ جہان، کتنا ہی وقت گزر جائے آنکھیں کھول کر حقیقت کی دنیا میں آنے کو دل ہی نہیں کرتا، بس اک ہجر اک آواز سماعت میں رس گھولتی رہتی ہے جسے بار بار کیسٹ کی مانند ریو اسنڈ کر کے دھرانے کے عمل

سے جی نہیں بھرتا، آنکھیں موند تو دل کے آسمان پر فقط ایک ہی چہرہ چاند کی مانند چمکتا ہے جس کے دیدار سے طبیعت سیر ہی نہیں ہو پالی کتنی دلفریب ہوا کرتی ہے یہ خوابوں کی دنیا، مجھی ڈیئر تم کیا جانو۔“ وہ سچ سچ آنکھیں موندے بے حد جذب سے کہہ رہی تھی مجھی کو قریب آ کر کتاب اس کے سر پر ہولے سے مارنی ہی پڑی۔

”محترمہ جاگ جائیے صبح ہو گئی ہے۔“ اس نے اس دخل در معقولات پہ اسے گھورنا چاہا تھا مگر وہ مسکرا رہی تھی۔

”میری زندگی کا بدترین دن تھا وہ، جب تمہیں بھابھی بنانے کا خیال میرے دل میں آیا۔“

”اور میری زندگی کا خوبصورت ترین دن تھا وہ، جب میں سچ سچ تمہاری بھابھی بن گئی۔“ اس نے برجستہ کہا تھا وہ شارق کے کپڑوں کا ڈھیر الماری سے نکال کر لائی تھی، استری کرنے کی نیت سے وہ استری شینڈ کی جانب بڑھ گئی، در یہ نے سارے کپڑوں کا ڈھیر اس سے جھپٹ کر ایک جانب ڈال دیا۔

”سارے کام چھوڑو، میرا فینشل کر دو۔“

”ہائیں فینشل کی تمہیں کیا ضرورت، بے بی اسکن ہے ابھی تمہاری۔“

”تم کیوں کیا کرتی ہو جبکہ تقریباً ہم عمر ہو میری۔“

”میری بات اور ہے، مجھے کسی کی خاطر جنا سنورنا ہوتا ہے۔“

”تو مجھے بھی کسی کی فقط اک ستائشی نگاہ کے حصول کے لئے اپنا آپ سنوارنا بھاتا ہے اور جس روز وہ کہے گا کہ میں دنیا کی خوبصورت ترین لڑکی ہوں تبھو کہ.....“

”دری..... محض مفروضوں کی بنیاد پر

خیالات کے محل تعمیر کر لینا درست نہیں۔“
”مگر خواب دیکھنا تو ہر ذی روح کا فرض ہے۔“

”ایسے خواب بھی نہیں دیکھنے چاہئیں جو انسان کو گمراہ کر دیں۔“

”ہر دل خوش کن احساس کا بھیانک ترین روپ دکھا ڈالنے میں ماہر ہوتا ہوں۔“ اس نے غفلت سے کہا اور اسے مصروف پا کر سائیڈ ٹیبل پر پڑی کتاب اٹھالی۔

”جانے کیونکر ہضم کر پاتی ہو تم یہ ثقیل قسم کی شاعری، نجی ڈیر۔“ اس نے کہتے ہوئے اوراق اٹھائے تھے۔

باندھ لیں ہاتھ یہ سینے پہ سجائیں تم کو جی میں آتا ہے کہ تعویذ بنا لیں تم کو پھر تمہیں روز سنواریں تمہیں بڑھتا دیکھیں کیوں نہ آنگن میں چنبیلی سا لگا لیں تم کو اسقدر ٹوٹ کر تم پہ ہمیں پیار آتا ہے اپنی بانہوں میں بھریں مار ہی ڈالیں تم کو کتاب کی پشت پہ وحی شاہ مسکرارہا تھا وہ کتاب آنکھوں پہ رکھ کر اک اک لفظ اپنے اندر اتار لی رہی۔

☆☆☆

”جانے کون سے جنم کے کرم تھے جن کے عوض اللہ نے نجی جیسے ہیرے کو میرے مقدر میں لکھا، ماشاء اللہ صورت شکل دیکھ کر ہی بندہ سیر ہو جاتا ہے اور گن ہیرے جیسے، سلیقہ، صفائی پسندی ختم ہے اس پہ، ذمہ دار اتنی کہ کبھی کسی کام کو کہنا ہی نہیں پڑا۔“ چہیتی بیوی کی تعریفوں پر شارق میاں کا دل بلیوں اچھل رہا تھا مگر بظاہر سنجیدگی کا لبادہ اوڑھے ناشتہ کرتے وہ اماں کا لیکچر سن رہے تھے۔

”اور جانے کون سی بد نصیب گھڑی تھی جو

اس بد بخت در یہ کو میں نے جنم دیا، ایک پل سکون کا سانس نہ دیا اس نے، جوڑوں کا درد چین لینے نہیں دیتا مگر جتنی رہا کرتی تھی چوہے چوکی میں، اگر کبھی کوئی کام کہہ بھی دو تو ڈھنگ سے نہ کر کے دیتی ہے، اللہ میاں مجھے تو سوچ سوچ کر ہول چڑھتے ہیں اس مردود کا بنے گا کیا۔“

”اماں بلا وجہ کے اندیشے نہ پالیے سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔“ انہیں فی الوقت اماں کی تسلی کی خاطر یہی لفظ مناسب معلوم ہوئے ان کی متلاشی نظریں دور دور تک سفر کر کے لوٹ آئیں تو وہ آفس کی تیاری کی غرض سے اپنے کمرے کا رخ کرنے کے لئے پر تو لنے لگے۔

”اللہ کیوں نہ اندیشے پالوں، لاکھ چاہتی ہوں یہ کوئی گن نجی ہی سے سیکھ لے، بیجاری نے صبح سے مشین لگا رکھی ہے مگر اسے یہ تو فتن نہیں کہ ساتھ مل کر بھادج کا ہاتھ ہی بٹا دے، ابھی دیکھتی ہوں کدھر ہے وہ۔“

”نجی..... نجی پلیر یار، مشین میں کپڑے گھوم گھوم کر تھک گئے ہیں اب تو انہیں نظر التفات بخش دو۔“ ادھر در یہ نے بے خیالی میں آلو چھیلے ہوئے جملہ اچھالا، ادھر اماں کا سنسناتا اور کرارادو ہٹرا نگارے کی مانند اس کی کمر جھلسا گیا۔

”کبخت، نامراد، ہزار مرتبہ کہا ہے کہ دلہن کو اس طرح مخاطب نہ کیا کر، بڑی بھادج ہے وہ تیری، مگر تو ہے ہی بے ہدایت، آئندہ زبان کھینچ لوں گی تیری اگر جو اس طرح بات کرتے ہوئے سن لیا، غضب خدا کا کیسا زمانہ آگیا، رشتوں کی حرمت کا ذرا پاس نہیں اس نسل کو، ہماری بھادج نے ہیشن اماں کے گزر جانے کے بعد چھانی سے لگا کر پالا تھا ہمیں، کبھی ہم میں اور اپنی اولاد میں تفریق نہ کی اور ہم بھی آج تک انہیں ماں کا

خوشگوار گزرے۔۔۔ نجمی ہنستی ہوئی چلی گئی تو وہ بھی مسکراتے ہوئے مشین سے کپڑے نکال کر کھنگالنے لگی۔

☆☆☆

”جب وہ بولتا ہے تو دل چاہتا ہے کہ بس وہ بولتا ہی رہے اور ہم صرف سنا کریں، جب وہ مسکراتا ہے تو لگتا ہے آس پاس کئی خوش رنگ پھول کھل اٹھے ہوں جن کی خوشبو سے روح تک سیراب ہوئی جاتی ہے، طبیعت معطر ہو جاتی ہے۔“

”اف دری پلیر یہ اپنا ڈاکٹر نامہ بند کر دو، ورنہ میں اپنا یہ سر کہیں دے ماروں گی۔“

”تم مذاق اڑا رہی ہو میرے جذباتوں کا۔“ نہ جانے وہ اس کے تذکرے کے معاملے میں اتنی چٹکی کیوں تھی، ذرا جو نجمی نے لقمہ دیا اور اس نے ہرٹ ہونے کی تیاری کی۔

”او بندی خدا، مجھے تو لگتا ہے تمہارا وہی معاملہ ہے کہ۔“

یا تیرا تذکرہ کرے ہر شخص
یا کوئی ہم سے گفتگو نہ کرے
”ہاں سچ بالکل دل چاہتا ہے ہر بات میں موضوع خواہ کوئی بھی ہو ہر شخص صرف اسی کے بارے میں بات کرے اور یہ وہ تذکرہ ہے جس سے میں کبھی سیر ہو ہی نہیں سکتی۔“ اس نے جذب سے اپنی کشادہ بھوری آنکھیں موند لیں تو نجمی کو اس پر بے طرح پیارا آ گیا۔

”محبت کے سچے تو سیکھ لو پہلے، یہ تم کس طرح کہہ سکتی ہو کہ وہ بھی تم میں اتنا ہی انٹرسٹڈ ہے، بلاوجہ ہی دن وے ٹریفک چلائے جا رہی ہو۔“

”سنو! اس روز مجھے کلینک پہنچنے میں تاخیر ہو گئی تو اس نے بے ساختہ گھڑی دیکھ کر کہا تھا

درجہ دیا کرتے ہیں۔“ اب اماں کے نان سناپ مکالموں کو بند باندھنا سہل نہ تھا سو وہ کانوں میں اٹھلیاں ٹھونس کر باہر صحن میں نکل آئی اور واشنگ مشین میں سر جھکائے نجمی نے اسے دیکھ کر دانت نکال لیے۔

”اڑالو میرا مذاق، خوش ہو لو جی بھر کے، نیا نیا خمار چڑھا ہے اماں کو، حسین و جمیل بہو کا، کچھ روز گزر جانے دو پھر دیکھوں گی کون کس کا حامی ہے۔“ اسے اپنی عزت افزائی پر نجمی کا ہنسنا ایک آنکھ نہ بھایا۔

”تم بھول رہی ہو دری ڈیر، میرے رشتے کی خاطر سب سے زیادہ جوتیاں بھی تم ہی نے گھسائی تھیں۔“

”تو ہمارے بھیا کو اپنی من موہنی صورت کی جھلک دکھا کر دیوانہ بنانے کا مشورہ کس نے دیا تھا، ہائے مجھے کیا معلوم تھا عزیز ترین دوست کو بھابھی بنا ڈالنے کا تجربہ اتنا مہنگا پڑے گا۔“ اسے نئے سرے سے اپنی دکھتی کمر کا غم ستایا تو وہ صوفے پہ بیٹھ کر بیک کشن سے کمر سہلانے لگی، گاڑی کا ہارن خاصی بے قراری سے بجایا گیا تو در یہ تمام تکلیف بھول بھال کر سرعت سے اٹھی اور بیڈ شیٹ کھنگالتی نجمی کے ہاتھ تھام لے۔

”تم جاؤ اپنے میاں کو رخصت کر دو، ورنہ وہ یونہی ہارن بجا بجا کر سب کے کان کھاتے رہیں گے۔“

”خدا تم جیسی نند سب کو دے۔“ نجمی نے بمشکل مسکراہٹ دبائی تھی۔

”مگر تم جیسی بھادج دشمن کو بھی نہ دے۔“ اس نے مصنوعی خفگی سے اسے گھورا۔

”جس دن تم بھادج بن گئیں ناں، اسی روز طبل جنگ بج اٹھے گا اب جاؤ اور اپنی حسین صورت کا دیدار بخش دو انہیں، تاکہ بقیہ دن

”آج آپ کو دیر ہو گئی“ کتنے ہی روز تک اس کا یہ جسد میرے کانوں میں گونجتا رہا، کیا یہ سن کر کوئی تجھی یقین نہیں کر سکتا کہ وہ منتظر رہا کرتا ہے، مریضوں کی لمبی قہر میں سے صرف میرا اور میں منتظر ہوں اس روز کی جب وہ یہ بھی کہے گا کہ وہ صرف میرا ہے، صرف میرا۔“ بے نیازی سے پوچھ جھلا کر چاکلیٹ کھائی وہ خاصی لا پرواہ نظر آرہی تھی۔

”مرد کی محبت صرف سراب ہوا کرتی ہے اور یکطرفہ محبت نری حماقت، وقت کا ضیاع۔“

”مجھے نہیں لگتا کہ اس سفر میں، میں تنہا ہوں، کبھی تم اس کی نظریں دیکھو، ان کی زبان پڑھنے کی کوشش کرو تو سمجھیں ادراک ہو کہ وہ نظریں صرف میرے لئے ہیں ان میں چھپا اک اک پیغام میری روح کو شانت کر دیا کرتا ہے، مجھے دیکھ کر اس کے ہاتھوں میں جیسے بجلی بھر جاتی ہے وہ جس اکٹاہٹ اور تیزی سے مریض بھگتا تا ہے تم دیکھو تو میری مانند ہی چہکو، بعض اوقات تو بیماری کا حال مریض کے منہ میں ہی ہوا کرتا ہے اور وہ نسخہ لکھ کر ہاتھ میں بھی پکڑا دیتا ہے۔“ بقول اس کے صرف میری چند میٹھی میٹھی باتیں سننے کے لئے۔

”سنا تھا کہ محبت خوش فہم ہوا کرتی ہے اور آج دیکھ بھی لیا۔“ تجھی نے بے نیازی سے کہتے ہوئے سائڈ ٹیبل پر رکھا فریم اٹھایا جس پر سندھی کڑھائی کے چند بوئے جگمگارے تھے۔

”سنو تجھی سارے کام ادھورے چھوڑ دو صرف مجھے سنو، اس کے تذکرے اس کی باتیں اور لگاؤں کے قصے۔“ در یہ نے اس کے ہاتھوں سے فریم لے کر واپس رکھ دیا۔

”اتنا ڈھیر سارا وقت باتوں میں برباد کرنے کی بجائے کسی کام میں صرف کر لو تو تمہارا

فائدہ ہے سراسر۔“

”میں نے کہیں پڑھا تھا، جولوہ کسی کی یاد میں گزر جائے ضائع نہیں ہوا کرتا۔“

”وہاٹ، تم نے پھر میری کتابوں کو ہاتھ لگایا۔“

”جی ہاں آپ کے وصی شاہ کی کتاب میں اپنے شاہ جی کو گفٹ کر چکی ہوں۔“

”دری آئی ول کل یو۔“ وہ اس پر چڑھ دوڑی مگر وہ در یہ تھی اسے قابو کرنا اتنا آسان نہ تھا۔

”تم ہی تو کہتی تھیں، شاعری جذبات کی ترجمانی کا سہل ترین ذریعہ ہے۔“ اس کی دسترس سے دور جا کر در یہ کہہ رہی تھی۔

”کتنا سینت سنبھال کر رکھا تھا، اک خراش تک نہ تھی اس کتاب پر۔“ تجھی کا قلق مدھم پڑ کر نہ دے رہا تھا، مزید اپنی بے خبری کا تاسف۔

”جی تو وہ گفٹ میں دینے کے لئے موزوں ترین ٹھہری، مجھے لگا اسی مصرف کی خاطر اتنے عرصے سے یہ کتاب سنبھال کر رکھی گئی تھی۔“ وہ مزے سے کارنس پہ چڑھی پیر ہلا رہی تھی۔

”اک بار ملو او تو سہی، کامران شاہ جیلانی سے، میں تجھی تو دیکھو کیا شے ہیں وہ۔“ تجھی نے بڑی دیر بعد تاسف سے جھکا سراٹھایا تھا۔

”تم ایسی حسین صورت کو اس کے سامنے لے جانے کا رسک میں تو نہیں لے سکتی، جانے میں اس کے معاملے میں اتنی پچی کیوں ہوں، یا پھر پوزیو کہہ لو۔“

”جی ہاں، آپ کو تو وہ ہوا میں بھی بری لگتی ہوں گی جو شاہ جی کو چھو کر گزریں۔“ تجھی کی جان جل کر رہ گئی۔

”نہیں ان ہواؤں کو تو اپنے اندر اتار لینے کو دل کرتا ہے۔“ در یہ نے اک گہری سانس لے کر

آنکھیں موند لیں تو جی نے اسے کشن دے مارا۔
 ”اماں نے مجھے ذمہ داری بخشی ہے، اپنا ہنر
 تھوڑا بہت تم میں انڈیل ڈالنے کو سو تم یہ سندھی
 کڑھائی کا پھول بنانا سیکھو۔“

”اماں جانے کس جہان میں رہتی ہیں، دنیا
 چاند پر پہنچ گئی اور وہ مجھے سندھی کڑھائی سکھانے
 کے در پر ہیں، سیکھ لو گی بابا، ذرا وقت آنے دو۔“
 ”کیوں شادی کی تاریخ مقرر کئے جانے
 کے بعد سوئی پکڑنا اور روئی گول کرنا سیکھو گی۔“
 ”بالکل ابھی تو دلی دور ہے، معاملہ ابتدائی
 مراحل میں ہے، وہ کہتا ہے اپنے اور میرے تعلق
 کو اک باضابطہ شکل دے دو، دوستی کی شکل۔“ وہ
 خاصے عام سے لہجے میں فریم گھماتے ہوئے کہہ
 گئی۔

”وہاٹ دماغ درست ہے تمہارا، دری ڈیر
 مرد و عورت کی دوستی کا ہمارے معاشرے میں جو
 تصور ہے وہ خاصا شرمناک ہے۔“
 ”یہ صرف ذہنوں کی پراگندگی ہوتی ہے جو
 وہ دوسروں کے معاملات پر تھوپ کر انہیں پراگندہ
 کیا کرتے ہیں۔“

”تو کیا تم مامی ہو اس کی۔“ جی کی آنکھیں
 پھٹ پڑیں۔

”نہ صرف مامی ہوں بلکہ اس کی آفر کو دل و
 جان سے قبول بھی کر لیا ہے میں نے، محترمہ
 فرسٹ سٹیپ ہے یہ۔“

”دری..... دری تم جانتی ہو یہ آگ پانی کا
 کھیل ہے، تم جھلس بھی سکتی ہو اور.....“

”تم آخر ہر بات کا منفی پہلو کیوں کھوجا
 کرتی ہو، اگر مثبت پہلوؤں پر غور کیا جائے تو کوئی
 شے بری نہیں ہوا کرتی، صرف بندے کی سوچ
 ستھری ہونی چاہیے۔“

”دری جانے کیوں مجھے لگتا ہے کہ تم

نقصان اٹھاؤ گی۔“

”یہ محض تمہارے اندیشے ہیں ورنہ وہ اک
 تائیس بندہ ہے، ورنہ یہ عرصہ کم نہیں ہوا کرتا کسی
 کی بددینتی کو سامنے لانے کے لئے اور جی ڈیر
 اگر وہ غاصب ہو، یا بیٹے کی آڑ ہی میں سہی معمولی
 سی بددینتی کا بھی مرتکب ہوتا تو میں اس کے منہ
 پر تھوکتا بھی پسند نہ کرتی کہ بہر حال اپنی حرمت
 مجھے بھی پیاری ہے، مگر میرے جذباتوں میں کوئی
 کھوٹ نہیں اور اس کا بے ریا خلوص اگر مجھے اس
 کے ساتھ کا خواہاں بنا بیٹھا ہے تو یہ آرزو اتنی
 نامناسب بھی نہیں ہے۔“ اس کا لہجہ ٹھوس تھا جی
 کی آواز پست ہو کر رہ گئی۔

”میں نہیں چاہتی کہ تم غلط رستے کا انتخاب
 کرو۔“

”تم ایک بار اس سے مل لو تو تمہارے تمام
 اندیشے ختم ہو جائیں گے، جی میں اتنی بھی نادان
 نہیں ہوں، بس یوں سمجھ لو کہ میں فقط منتظر
 ہوں۔“

”صاف نیت رکھنے والے کبھی چور راستے
 نہیں اپنایا کرتے۔“ جی نہ چاہتے ہوئے بھی
 کہہ گئی اور صاف ظاہر تھا کہ دریہ کو برا لگا مگر بات
 بہر حال راست تھی، سو وہ خاموش ہی رہی۔

☆☆☆

نہ جانے اماں کو اسے سکھڑ بنا ڈالنے کی کیسی
 دھن سوار تھی اور اس کا ہر امتحان میں فیل ہو جانا
 اماں کے غصے کو شہہ دیا کرتا ان کا بس نہ چلا کرتا
 کہ تمام سلیقے طریقے اسے گھول کر پلا دیں اپنے
 اندیشوں کے راست نہ ہونے کی وہ دل سے دعا
 گورہا کرتیں، ان کی بھاگ دوڑ اور تفکرات کے
 نتیجے میں جس قسم کے رشتے آئے وہ اماں کی
 طبیعت مکدر کر گئے، اکلوتی نازوں پٹی پٹی کے
 مزاج اور نخروں سے واقف تھیں اور وہ خود بھی

کہاں چاہتی تھیں لاکھوں میں ایک لڑکی کو کسی ایسے ویسے، کہ سے بیاہنے کا خیال بھی نہ دل میں لاسکتی تھیں اس کی غیر ذمہ داری و لاپرواہی ہو ابن کران کے سر پر سوار رہا کرتی۔

اماں کی دور پار کی چچیری میری بہن رستہ بھول کر ادھر آنکلیں اور در یہ پر جو نظریں نکلیں تو جانو کہ پلٹنا ہی بھول گئیں۔

”بس ایک ہی بیٹی ہے میری، انٹر کیا ہے پچھلے سال اس نے۔“ در یہ کے وجود سے ان کی چپکی نظریں ہٹانے کی خاطر انہوں نے اپنی جانب متوجہ کیا تھا۔

”اور ایک ہی بیٹا ہے بڑا، جس کے فرض سے سبکدوش کیا اللہ نے، دلہن بھی ماشاء اللہ لاکھوں میں ایک ہے، ان دنوں میکے میں قیام ہے، خیر سے خوشخبری متوقع ہے، جی گھبراتا ہے ان دنوں یوں بھی، بیٹا کسی آفس کے کام سے اسلام آباد گیا تو جانے سے قبل اسے میکے چھوڑنا گیا۔“

”ماشاء اللہ..... ماشاء اللہ..... آپا کہیں بات چیت وغیرہ تو طے نہیں پجی کی۔“ ان کا روپہ و لہجہ کسی خوش آئند مرحلے کا غماز تھا ان کی سوتی مستقل در یہ میں اٹکی تھی۔

”نہیں ابھی تو نہیں، ابھی عمر ہی کیا ہے پجی کی، ابھی تو دور دور تک ارادہ نہیں اگرچہ کئی رشتے آچکے ہیں۔“ اماں بھی گنوں کی پوری تھیں اتنی آسانی سے کسے رضا مند ہوتیں لہذا ان کی آتش شوق کو بھڑکا گئیں وہ بے قرار ہو اٹھیں اور در یہ کے منظر سے ہٹ جانے کے بعد جانے کون سی میٹھی میٹھی سرگوشیاں اماں کی سماعتوں میں گھولیں کہ جوش مسرت سے اماں کا چہرہ تہمتا اٹھا، سونے پہ سہاگہ کہ جی کی غیر موجودگی میں در یہ نے جوان کی مذاکرات کا بیڑہ چارو ناچار ہی سہی اٹھایا تو

سوئے اتفاق کوئی کام نہ بگڑا، وہ خاصے امید افزاء تاثرات لے کر پٹی تھیں اماں کی امیدوں کا جہاں آباد ہو گیا در یہ سے اچانک ہی غیر معمولی طور پر نرم رویہ اپنانے پہ مجبور ہو گئیں اور یہ خوشی شیر کرنے کو جی کو بھی بلا بھیجا، جوان کے بلاوے پر لپکی چلی آئی تھی، مگر جانے وہ ان جیسی خوشی کا بھرپور اظہار نہ کر سکی، دو پرے کی ساس کے اکلوتے بیٹے کی قابلیت و شرافت کے قصے سن کر بھی لبوں کا قفل نہ توڑ سکی۔

☆☆☆

”ارے یہ کون سا طریقہ ہے اداسیاں منانے کا۔“ در یہ نے کمرے میں آ کر لائٹ آن کی تو جی نے بے ساختہ بازو آنکھوں پر رکھ لیا۔

”دری پلیز لائٹ آف کر دو، آنکھوں میں چھن ہوتی ہے۔“

”یوں کہو کہ آنکھوں میں جھلملاتے ان موتیوں کا بھرم رکھنا ناگزیر ہے۔“ در یہ نے جی کی تھوڑی اٹھالی تو چند قطرے اس کی مکھن ایسے گالوں پہ لڑھک آئے۔

”اے یہ بلیک میلنگ نہیں چلنے گی، مائی ڈیروہ آفس کے کام سے چند روز کے لئے گئے سالوں کا بن باس کاٹنے کے ارادے سے نہیں۔“

”تم کیا جانو تنہائی کتنی اذیت ناک ہوا کرتی ہے دری ڈیر۔“

”تو پھر آپ کیوں اس تنہائی کو سلیبریٹ کرنے کے لئے اندھیرے کمرے میں بند پڑی ہیں۔“

”کبھی کبھی یونہی اندھیرا کر کے خاموشی سے اپنی اداسیاں منانے کو دل کرتا ہے۔“

”دل کے کہے کو ٹال دیا کرو، دل کبھی کبھی بڑے غلط مشورے بھی دیا کرتا ہے۔“ وہ شرارت سے مسکرائی۔

”میرا دل تمہارے دل کی مانند نادان نہیں ہے۔“

”تو ایسا کون سا نادانی کا کام کر ڈالا ہے آج تک آپ نے، چھٹی چیز سے ساس اور میاں کا دل مٹھی میں کرنے کے علاوہ۔“ وہ بولی۔
”تو تم نے کیوں نہ اب تک تیر چلا لئے۔“
”تم جانتی ہو میرا دل مستعار چلا گیا ہے اور جس کے پاس ہے اس کا لوٹانے کا کوئی ارادہ بھی نہیں اور تم یونہی تو من کی بوٹھی لٹکائے بیٹھی رہیں تو منہ لمبا ہو جائے گا، بھیا ایر پورٹ سے ہی اگلا جہاز پکڑیں گے واپسی کے لئے۔“

”منہ اچھا نہیں تو بات ہی اچھی کر لیا کرو۔“
مجھی نے اسے گھورا اور بری طرح ماسٹڈ کیا۔
”اس شکل کی یہ خوبی کیا کم ہے کہ اسے شرف پسندیدگی بخشا گیا ہے۔“

”ہاں یہ منہ اور مسور کی دال۔“ عادت کے مطابق پل بھر میں مجھی کا موڈ بدل گیا۔
”اور اسی منہ کی بدولت ہی آج فرمایا گیا ہے کہ میں اسے اچھی لگتی ہوں، تم یہاں ہجر و فراق کے ہنڈولوں میں جھول رہی ہو، بجائے اس کے کہ میرے ساتھ۔۔۔۔۔“

”کیا کروں بھنگڑا ڈالوں اور اس ”اچھا لگنے“ کے لئے تم کتنے جتن کیا کرتی تھیں مجھے معلوم ہے اور اچھا لگنے کا مطلب صرف ”اچھا“ لگنا بھی ہو سکتا ہے، فار یو کا سنڈ انفارمیشن۔“
”تم ہمیشہ یونہی میری خوشیوں کو غارت کیا کرو، تمہارا خیال ہے مجھ میں اچھا لگنے والی کوئی بات نہیں، یا وہ مجھے بیوقوف بنا رہا ہے۔“

”میری چندا، محض مفروضوں کی بنیاد پر خوابوں کے محل تعمیر کر لینا خود اپنے آپ کو دھوکہ دینے کے مترادف ہے تم یہ بات کب سمجھو گی۔“
”تمہارا کیا خیال ہے اس کا بطور خاص

میری ذات کو اہمیت دینا کوئی معنی نہیں رکھتا۔“
”میرے نزدیک صرف اتنا کہ تم صنف مخالف ہو جو کہ بہر حال اک خاص کشش کا حامل ہوا کرتی ہے۔“

”اور یہی کشش پسندیدگی کا پیرا ہن اوڑھ کر معنی بھی تو بدل جایا کرتی ہے۔“
”بالکل مجھے اس سے انکار نہیں، مگر یہ یقین بھی ہمراہ ہونا چاہیے کہ محبتوں کے سفر میں ہم تنہا نہیں ہیں۔“

”تم ہمیشہ ہولناک باتیں کر کے میرا دل توڑ دیا کرتی ہو۔“

”اسی لئے کہا جاتا ہے کہ سچائی تلخ ہوا کرتی ہے۔“

”اس کا مصنوعی و امتیازی رویہ اس امر کا غماز ہے کہ وہ بھی مجھے پسند کرتا ہے۔“

”مگر اس کی پسندیدگی کی اختتامی حد کیا ہے، کبھی یہ بھی جاننے کی کوشش کرو، تمہارا ہمیشہ بیمار رہنے کے لئے دوائیں ضائع کرنا انتہا پسندی ہے، گلے کی انفیکشن عموماً اتنا وقت نہیں لیا کرتی، مگر کیا تمہیں محسوس نہیں ہوتا کہ تم اپنے ہمراہ اپنے گھر والوں کو بھی دھوکہ دے رہی ہو۔“

”میرے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ میرے جذبے راست ہیں، وہ کہتا ہے میں اک مکمل لڑکی ہوں اور خوبصورتی اس کی کمزوری ہے کیا یہ مان کافی نہیں ہے میری تسلی کے لئے جس کا خیال اک پل کو مجھ سے جدا نہیں ہوتا، مقابل کے دل میں ہمارے لئے رتی بھر سہی جگہ تو ہے، ٹھکرائے جانے کا اذیت تو میرے ساتھ نہیں میرے غرور کو اتنا ہی کافی ہے۔“

”تم پاگل ہوئی ہو دریا، جانتی ہو اماں کیا سوچ رہی ہیں۔“ مجھی کی آنکھیں پھٹ پڑیں۔
”جانتی ہوں اور ان کی سوچ سے میرا متفق

ہونا لازمی نہیں۔“ اس کے لہجے سے سرکشی ہویدا تھی اور جمی جان سکتی تھی کہ ایسے میں اس پر دباؤ ڈالنا اسے مزید بھڑکا سکتا ہے سوا سے رام کرنے کی سعی کرنے لگی اور وہ آمادہ ہوئی گئی مگر اس حد تک نہیں کہ جمی کوئی اچھی امید وابستہ کر سکے۔

☆☆☆

”تم سے ہزار مرتبہ کہا ہے کہ یہ لمبی لمبی پردہ بجز زوالی ڈشز کم از کم میرے بس سے باہر ہیں، اماں کو تو بس خواہ مخواہ کا شوق ہے مجھے چولہے میں جو نکلنے کا۔“ وہ مزے سے سنگی تختے کے سامنے کھڑی سلاد بنانے سے زیادہ کھا رہی تھی اور جمی بھی تو بے پتلتے کبابوں سے نبرد آزما کبھی بخنی کی فکر میں ہلکان۔

”اگر تم اسی رفتار سے مولیاں، چقدر چرتی رہیں تو مجھے مہمانوں کے سامنے تھلکے سجا کر پیش کرنے پڑیں گے نتیجتاً تمہارا ہی نقصان ہوگا۔“

”اسی نقصان میں میری رضا پنہاں ہے یہ تم خوب سمجھتی ہو۔“ اس نے لا پرواہی سے سلاد کا پتہ چبایا۔

”دری تمہیں نہیں لگتا کہ تم سراب کے پیچھے دوڑ رہی ہو۔“

”آج تمہیں بتانا ہی پڑے گا کہ تمام خوفناک و ہولناک تشبیہات تمہیں میرے معاملے ہی میں کیوں راست نظر آیا کرتی ہیں جیسے محبت کر کے میں نے کسی بڑے جرم کا ارتکاب کیا ہے۔“

”دری تم سچ بچ بے حد خوش فہم ہو اور مجھے ڈر ہے کہ.....“

”پلیز مزید کوئی خوفناک بات نہ کرنا، میں نے تمہارے اصرار پر کپڑے بھی بدل لئے میک اپ بھی کر لیا اور تمہارے کہنے کے مطابق سکھڑپن و خوش اخلاقی کے ریکارڈ بھی توڑنے کی کوشش

کروں گی اور تم بھی اپنا وعدہ نہ بھولنا، ہر حال میں میرا ساتھ دینے والا۔“

”دہن بریانی دم دے دی۔“ حسب عادت اماں کو تشویش نے آگھیرا تو انہوں نے کچن میں جھانکی ماری۔

”اماں وقت تو دیکھیں آپ، شام کے چھ بجے ہیں اور آپ بریانی دم دینے کی بات کرتی ہیں۔“ در یہ جھانگتی۔

”اے لڑکی ہزار مرتبہ کہا ہے کہ اس لہجے میں بات نہ کیا کر، زبان گدی سے کھینچ لوں گی ہاں، جمی ہی سے کچھ سیکھ لے باتیں کرتی ہے تو پھول جھڑتے ہیں منہ سے، ماشاء اللہ خوش گفتار، خوش اخلاق، سکھڑ، سلیقہ مند، مجال ہے جو ایک گر بھی بھولے سے سیکھ کر دیا ہو تو نے۔“ موضوع کوئی بھی ہو اماں کو جمی کی تعریف کا موقع درکار ہوا کرتا، بساط بھر چند سخت ست در یہ کوسنا کر وہ لوٹ گئیں تو جمی کو دانت نکالتے دیکھ کر وہ جھلا گئی۔

”سردوں کے حساب سے خون بڑھ گیا ہوگا تمہارا تعریفیں سن سن کر اور اماں ہمیشہ یہ بات بھول جایا کرتی ہیں کہ تمہیں بھائی کے لئے منتخب کرنے کی اولین رائے میری ہی تھی۔“

”اسی احسان کی وجہ سے تو سر نہیں اٹھاپاتی تمہارے سامنے، ورنہ میری تو عمر نکلی جا رہی تھی۔“ جمی کھی کھی کھی کرنے لگی تو اس کے لبوں پر بھی مسکراہٹ رنگ آئی۔

”اب اپنے شاہ جی کو کہو کہ معاملات تمہارے بس سے باہر جا رہے ہیں اگر وہ مخلص ہیں تو دست سوال دراز کریں۔“

”کیا یہ کہنا اتنا ہی آسان ہے۔“ در یہ اسے دیکھتی ہی رہ گئی۔

”کیوں تمہیں تو ان کے جذبوں کے

راست ہونے پر پختہ یقین ہے اور پھر وعدے کے مطابق تمہاری خاطر جدوجہد کرنے کا مرحلہ تو اگلا ہو گا ناں۔“ جانے بات در یہ کی ناقص عقل میں سائی کہ نہیں تاہم من بھر کا سر ضرور ہلا دیا۔

☆☆☆

”اماں جی خواہ مخواہ میں ہوتی ہیں آپ، ابھی اپنی در یہ کی عمر ہی کیا ہے، فقط دو سال ہی تو ہوئے ہیں انٹر کیے ہوئے، ایک تو بلا وجہ آپ نے کالج چھڑوا دیا گھر داری میں جھونکنے کے لئے، بی اے کر چکی ہوئی اب تک۔“ شارق میاں خاصے جھلمائے ہوئے تھے، لگتا تھا یہ اس کی حمایت میں جمی کا پہلا قدم تھا، اسے بے اختیار جمی پر پیار آ گیا، مگر اماں کے تو تلووں سے لگی سر پر ہنسی۔

”اے میاں ہوش کے ناخن لو، ایسی بھی پالنے میں نہیں جھول رہی اپنی در یہ، لڑکیوں کی یہی مناسب عمر ہوا کرتی ہے شادی کی، خدا نخواستہ زائید عمر گزر گئی تو ایسا بر بھی ماننا مشکل اور پڑھائی کی بھی خوب کہی تم نے، کون سے لیاقت و قابلیت کے جھنڈے گاڑ دیئے تھے اس کجست نے، ایسے نمبر لاتی تھی کہ کسی کو بتاتے ہوئے بھی شرماتی تھی میں، کالج میں سیکھا کیا اس نے، بال کٹوانا، ناخن بڑھانا جس کے سبب ہر کام سے فراغت نصیب ہو، بچوں کی پائندہ پھل کود کروالو، آنگن میں پڑے جھولے پہ پینگیں لیتی رہے گی، یا پھر کیبل کے اللہ مارے واہیات چینل دکھوالو، اس سے فرصت ملے تو گھنٹہ بھر نوں سے چپکے رہنا اور اسے بگاڑنے میں جمی کا بہت بڑا ہاتھ ہے، سونے پہ سہاگا والی بات ہے۔“ حسین و جمیل بیوی کے وارفتہ بھیا پہلو بدل کر رہ گئے، در یہ نے بمشکل ہنسی ضبط کی۔

”اور ایسی ننھی بچی بھی نہیں ہے کالج

چھڑوایا تھا کہ گھر کے کام کاج سیکھ لے گی، مگر جمی نے اس کے ناز اٹھا اٹھا کر جو تھوڑی بہت کام کی عادت تھی وہ بھی چھڑوا دی، نام نہاد نگوڑی بیماری کو ہوا بنا رکھا ہے، اگلے حلق کا ایسا کیا مرض، غرور پھوے ہوئے ہیں ڈاکٹروں نے آپریشن تجویز کیا تو یہ سدا کی ڈر پوک بھاگ نکلیں، اب معلوم ہو رہا ہے کتنے پیسے خرچ ہوا کرتے ہیں میرے اس کے علاج کے چکر میں، مگر اس نامراد کو ذرا پروا نہیں، نہ کبھی ڈھنگ سے دوا کھاتے دیکھا اور پرہیز کا تو چند سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، کھٹی کیریوں کے چاؤ نے تو یہ دن دکھایا ہے۔“

”تو اماں جی اس کے صحت مند ہونے کا ہی انتظار کریں۔“ اماں کی عادت تھی بات کھینچ کر کہیں کی کہیں لے جایا کرتی اور در یہ سے تو وہ یوں بھی عاجز رہا کرتیں۔

”جب آپ کو من مانی ہی مقصود ہے تو مجھ سے بھی مشورہ طلب نہ کیا کریں۔“

”اے میاں تم باتیں ہی بچوں والی کیا کرتے ہو اور یہ عمر والی بات تو خوب ہی کہی، اسی کی سہیلی اور ہم عمر اپنی جمی، ماشاء اللہ خیر سے اب ماں بن جائے گی اور سارا گھر سنبھال رکھا ہے میرا، پلنگ پر بٹھا دیا مجھے، اللہ اسے چاند سا بیٹا دے اور اس نامراد نے کبھی ڈھنگ سے کوئی کام نہ کر کے دیا۔“

”یہی تو میں کہتا ہو کہ اسے ذرا ذمہ دار باشعور ہو لینے دیجئے۔“ انہوں نے لولی لنگڑی سی توجیہ پیش کرنی چاہی محرم صرف بیوی سے کیے گئے وعدے کا بھرم رکھنا تھا ورنہ اماں کی ضد سے خوب واقف تھے اور ان کی خواہش بے جا تھی نہ توجیہات بے وجہ۔

”تم کچھ بھی کہتے رہو مگر اب میں کسی کی سننے والی نہیں ہوں ہاں، یونہی اس کے بچنے کے

سبب میں معقول رشتے ٹھکراتی رہی تو ایک روز سر پر ہاتھ رکھ کر روتی نظر آؤں گی۔“ شارق میاں نے بیچارگی سے کھڑکی کی اوٹ سے چھب دکھائی بیوی کو دیکھا جس کی خواہش کا کوئی سر پیر نہ پاتے ہوئے بھی وہ تعمیل پر مجبور تھے، نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن کے مصداق عجب کشمکش میں گرفتار غصے تمام عذر، عذر لنگ ثابت ہو رہے تھے اور نجی کی اس معاملے میں اس حد تک دلچسپی حد سے زیادہ تھی اور ان دونوں کی محبت ایسی مثالی تھی کہ دل میں کوئی ایسا ویسا خیال بھی نہ لا سکتے تھے اور ان کا خیال نہ تھا کہ وہ زیادہ دیر اس محاذ پر ڈٹے رہیں گے، اماں کی تمام توجیہات راست تھیں اور عزائم خطرناک۔

☆☆☆

”اور محبتوں میں سود زیاں کا حساب کون رکھتا ہے نجی ڈیر، عقل احساسات انا سب ہی کچھ تو ہم مقابل کے قدموں میں رکھ دیا کرتے ہیں، ہمارے پاس بچتے ہیں تو صرف جذبات، جو ہمیں اندھا گونگا بہرا بنا ڈالنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے انہی جذبات کے عوض ممکن تھا کہ میں اپنا چندار اس کے قدموں میں رکھ دیتی اسے پا لینے کی خاطر ہر صورت اسے منالیتی، مگر میں بھول گئی تھی کہ بظاہر خوش اطوار، دیل ڈریسڈ نظر آنے والے انسانوں میں بھی کچھ خامیاں ضرور ہوا کرتی ہیں ہم جنہیں اپنے آئیڈیل کے خانے میں فٹ کر کے دیکھتے ہیں ان کی شخصیت کے کچھ منفی پہلو بھی ضرور ہوا کرتے ہیں مگر محبت تو محبوب کو گل تصور کیا کرتی ہے ہر خامی سے مبرا۔

”میں نے پل پل گن کر اس روز کا انتظار کیا تھا جس پل اپنی تمام عزت نفس کو باطاق رکھ کر میں اس سے اسی کو مانگ لینے کا فیصلہ کیا تھا، مگر کبھی کبھی صرف ایک لمحہ ہی ہمیں بچا لیا کرتا

ہے، ہماری ساری زندگی کا دھارا پلٹ کر رکھ دیا کرتا ہے اس روز اس نے اک عام سی بات کہی، جو اس کے لئے عام ہی رہی ہوگی، مگر مجھے فیصلہ کرنے کا ہنر بخش گئی، نجی ڈیر اس نے کہا کہ خوبصورت لڑکیوں سے دوستی کرنا اس کی ہالی ہے؟ سنا تم نے میں جو اسے جیون دان کرنے چلی تھی اس کے لئے فقط ہالی تھی، وقت گزارنے کا مشغلہ، تو کیا اس سے بڑھ کر بھی کسی کے جذبات کی بے حرمتی ہو سکتی ہے، تو کیا وہ سب کو اسی طرح تعریفیں کر کے چند انسیت بھرے الفاظ بدل، بدل کر چاہت کی انتہاؤں تک پہنچا دیا کرتا ہو گا؟“ درمی اسے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہی تھی اور نجی سوچنے لگی کہ کیا اتنی ہی آسان ہوا کرتا ہے لڑکیوں کو گمراہ کرنا فقط چند انسیت بھرے بول اور تعریف کے چند جملے، جن کے عوض لڑکی اپنی عزت نفس بھی کسی کے قدموں میں رکھنے پر تیار رہا کرتی ہے، کیا اتنی ہی تاثیر ہوا کرتی مرد کے چند لچھے دار جملوں میں، یا پھر لڑکیاں ہی اتنی ارزاں ہوا کرتی ہیں محض چند عناصر کی بناء پر بے وقوف بن جانے والی، صد شکر کہ دریہ کے پاس بہترین آپشن موجود تھا، مگر آپشن ہر کسی کے پاس کب ہوا کرتا ہے، دریہ چہکوں پہکوں رو رہی تھی اور اس کے آنسوؤں سے نجی کا اپنا دل پگھلا جا رہا تھا۔

☆☆☆

الکھلاؤ

سدرۃ المنتہی

بائیسویں قسط کا خلاصہ

علی گوہر عمارہ سے سچ اگلو لیتا ہے اصل بات جان کر، وہ نڈھال ہے مگر بدلا ہوا بھی۔
امرت کو اپنے نکاح کا پتہ چلتا ہے، وہ چوری گھر سے نکل آنے میں کامیاب ہو جاتی ہے، گھر پہنچ کر عمارہ کی رائے ہے کہ اسے لاهوت سے نکاح کر لینا چاہیے تھا۔
لاہوت کا غذات کی فائل لے کر فنکار کے گھر جاتا ہے مگر تعارف نہیں کرا پاتا اپنا۔
واپسی پر وہ فائل پڑھتے ہیں اور ان کے ساتھ نواز بھی حیران ہے، صدے میں۔
لاہوت امرت کو وضاحت دینے آتا ہے۔
فنکار ایک عرصے بعد بھائی کی موت پر اپنے گاؤں جاتا ہے۔
امرت جاب کے سلسلے میں کئی جگہ انٹرویو دینے جاتی ہے۔
ہالار امر کلہ سے ملنے ایک عجیب علاقے تک آ نکلا ہے اور اس نے امر کلہ کو شادی کے لئے پروپوز کر دیا، وہ شدید حیرت کی زد میں آ جاتی ہے۔

تیسویں قسط

اب آپ آگے پڑھیے





”تم اپنے آخری سوال کے لیے لیے کہاں کہاں پھرتی رہو گی، مجھے پتہ ہے بہت زیادہ سفر نہیں کر سکتی، تم تاش کے پتے کھیل رہی ہو کیا لڑکی؟“ خاتون خاصی چڑی ہوئیں لگ رہیں تھیں۔
 ”ایک تو وہ لڑکا بہت سرکھا گیا ہے، پکا گمراہ بن گیا ہے۔“

”آپ لوگ تلاش میں نکلے ہوئے مسافر کو گمراہ کیوں کہتے ہیں آخر۔“ امرت کو اختلاف تھا۔
 ”جوراہ سے بے راہ ہوا سے گمراہ ہی کہتے ہیں۔“ خاتون کے چہرے پر سختی زیادہ تھی، امرت بہت تلخ ہو گئی اندر سے، کڑوی گولی۔

”تمہیں کیا چاہیے ہم سے، یہاں کیوں آئی ہو آخر؟۔“

”آپ یہاں کیوں بیٹھی ہیں آخر؟ کس لئے؟ اور کس کی اجازت سے؟“ امرت کو خود پتہ تھا کہ یہ سوال اسے نہیں کرنا چاہیے تھا، وہ خاتون ہنسنے لگی۔

”میرے ساتھ مذاق زیادہ دیر نہیں چلتا لڑکی، مجھ کو غصہ نہ آ جائے۔“ وہ خود کو کسی حد تک نارمل رکھ رہیں تھیں۔

”تمہیں کیا چاہیے؟“ ایک عورت ڈری سہی کوٹھی کے اندر آ گئی تھی، یہ چھوٹی سی فقیر کی چلہ گاہ تھی۔

”صوفی کے مزار پر دعا لینے کا یہ کون سا طریقہ ہے بچی؟“ عورت کو ڈر تھا کہ بڑی بی کہیں خفا نہ ہو جائیں، اگر ہو گئیں تو بات مشکل ہو جائے گی۔

”اسے اپنے باپ کے لئے دعا چاہیے شاید۔“ عورت ماحول کو ذرا نرم بنانا چاہتی تھی۔

”نہیں مجھے ان سے کیوں دعا چاہیے ہو گی؟“ امرت کو تو چہ نہی۔

”میں نے کہا بھی نہیں کہ تم مجھ گھنگار سے دعا لینے آؤ۔“ خاتون غصے میں آ گئیں تھیں، پیچھے بوا اماں آ گئیں ورنہ یقینی شامت تھی۔

”امرت تم یہاں کیوں آئی ہو؟“ بوا اماں کو اعتراض تھا۔

”آپ نے مجھے اپنے کسی سوال کا جواب نہیں دیا۔“ اسے اب بوا اماں سے بھی شکایت تھی۔

(امرت الو کی پٹھی تم پاگل ہو گئی ہو کیا؟) وہ کہنا ہی چاہ رہی تھیں۔

”ہماری مہمان کے ساتھ غلط سلوک کرنے کی تمہیں کس نے اجازت دی ہے؟“ خاتون کے چہرے کے تاثر دیکھتے ہوئے بوا اماں نے مزید امرت کو جھڑکا تھا۔

”آپ کی مہمان خاتون کو میرے ساتھ غلط کرنے کی اجازت کس نے دی۔“ عورت نے امرت کو ٹوکا آنکھوں ہی آنکھوں میں۔

عورت کا نام زہرہ تھا، درمیانی عمر اور درمیانی قد کاٹھ کی یہ سانولی اور تیکھے نقوش والی خاتون بہت بالحاظ بھی تھیں اور بامروت تھی۔

جو بڑی بی بی کی خادمہ کے طور پر ساتھ ساتھ ہوتی تھیں، بڑی بی بی بوا اماں کی بچپن کی سہیلی تھیں، شادی کے بعد اولاد نہ ہوئی، علیحدگی کے بعد ان کا پورا رخ پلٹ گیا، ایک دفعہ فیض مانگا چھ دن بڑے سائیں کے مزار پر اکیلے رہیں اور اس کے بعد اب حاضری کا حکم ہوا تھا اور پہلے ہی دن لاموت برس پڑا تھا۔

”کہ لوگ بندوں سے دعا مانگتے ہیں، ویسے لیتے ہیں، لوگ شرک میں مبتلا ہو گئے ہیں۔“ وہ لوگوں کی اصلاح کرنا چاہ رہا تھا، چیختا تھا تو باغی کہلاتا اثر کوئی نہ ہوتا تھا، مگر اب کی بار اس نے بہت کچھ بدل دینے کی ٹھان لی تھی۔

”تمہارے بچے گمراہ ہو چکے ہیں بی بی؟“ خاتون نے بوا اماں سے شکوہ کیا۔

”لو۔“ امرت ہنسی۔

بوا اماں نے اسے جانے کا اشارہ کیا، امرت نے کھڑے رہنا بھی فضول ہی جانا۔

”سنو جاتے ہوئے ہنستی ہوئی جانا، تمہارے چوتھے سوال کا جواب اللہ کے پاس ہے، تیسری کا میں دے دیتی ہوں، نکتہ گہرائی چاہتا ہے، تمہیں جز اور قل کے فلسفے کا نہیں پتہ؟“ امرت پلٹی تھی۔

”کیا اس کے لئے ایک بار پھر نئے سرے سے کوئی بساط بچھائی گئی تھی۔“ اس کے ذہن میں چھٹا معصومانہ سوال ابھرا تھا۔

☆☆☆

”تمہیں حیرت ہوئی، یہ سن کر۔“ وہ بچوں کی طرح خوشی سے پوچھ رہا تھا اور اس کا دل چاہا سر پیٹ لے۔

”ہالار میں یہ تو نہیں کہوں گی کہ تم کچھ پی کر آئے ہو؟ کیونکہ مجھے پتہ ہے بہت عرصہ باہر رہنے کے بعد بھی تم نے کبھی پی نہیں ہوگی، مگر اتنا ضرور کہوں گی کہ تم بے خبر ہو یا پھر ہوش میں تو ہو نا؟“ وہ اس کی بات یہ سن پڑا تھا اور ہنستا رہا۔

”آہستہ ہالار کوئی نہیں بھی جاگ رہا ہو گا تو جاگ جائے گا۔“ وہ اس کا خیال کرتے ہوئے چپ ہوا تھا۔

”اچھا پھر بتاؤ نا، چلو یہ تو رکھو، میں پہنا دوں؟“ اس قدر اعتماد اس نے سوچا بجائے اس کا سر پیٹ لے یا بچوں کی طرح کپ اٹھا کر دے مارے۔

”ہالی تمہیں کچھ حقیقتوں کا نہیں پتہ؟“

”مجھے سب پتہ ہے امر کلہ، اس نے بتا دیا ہے، امرت نے سب بتا دیا ہے مجھے، وہ خط امرت لکھتی تھی، مگر وہ ترجمانی تمہاری ہوتی تھی۔“

”ہالار ایسا ہرگز نہیں، میں خود بے سمجھ تھی اور تم ایک سراب کے پیچھے بھاگتے جا رہے تھے، مجھے تم میں دلچسپی ضرور تھی، انسیت تھی، احساس تھا، مگر محبت نہیں تھی۔“ یہ آخری جملہ کہتے ہوئے جتنی تکلیف اسے ہوئی تھی اس سے کہیں زیادہ تکلیف وہ سہہ رہا تھا۔

”یہ غلط ہے امر کلہ؟ ایسا نہیں ہے تمہیں مجھ سے محبت تھی۔“

”اگر وہ محبت تھی ہالار تو پھر اس یہ حالات کی گرد کیسے چڑھ گئی، میں تلاش کے رستے میں سب کچھ چھوڑ کر کیسے آ گئی، نجانے میں کیوں خوار ہو رہی تھی اور کس کے لئے، شاید میں صرف بھاگ رہی تھی۔“ اس نے اپنے سوال کا فوری جواب خود دیا تھا۔

”انسان کو اپنے سوال کے فوری جواب خود دینے پڑتے ہیں، کیونکہ ان سوالوں کے جواب ان کے اندر تب سے جنم لے چکے ہوتے ہیں جب سوال اٹھتے ہیں جیسے موت کے ساتھ زندگی اور

بیماری کے ساتھ علاج اترتا ہے، اسی طرح ہر سوال اپنے جواب کے ساتھ پیدا ہوتا ہے، فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ کچھ لوگوں کو سوالوں کے جواب فوری طور پہ ملتے ہیں اور کچھ کو بہت دیر سے اور کچھ کو تو ملتے ہی نہیں، اگر ملتے ہیں تو سمجھ سے گزر جاتے ہیں، ٹھہرتے نہیں، سوال کبھی کاٹا ہوتے ہیں، کبھی تو پ کا گولہ اور جواب کبھی موت ہوتے ہیں اور کبھی حیات کی خوشخبری، سوال اور جواب کی جنگ زندگی اور موت کی طرح ساتھ ساتھ چلتی رہتی ہے۔“ ہالار کی آنکھوں میں پانیوں کا سمندر تھا۔

”تمہیں خود یہ طے کرنا ہوگا ہالی کہ تمہیں کیا چاہیے تھا، تمہیں کس کی ضرورت تھی؟ میری یا پھر امرت کے صحت مند لفظوں کی، تمہارے زخموں پر مرہم وہ حرف لفظ بن کر رکھتے تھے اور تم مجھے دیکھ کر خوش ہوتے تھے، ہالی یہ ایک لمبی کہانی ہے اور تکلیف دہ بھی، امرت نے تمہیں یہ تو بتا دیا کہ خط وہ لکھتی تھی، مگر اس نے یہ نہیں بتایا ہوگا کہ وہ کتنی دہری مشقت سے گزری تھی۔“ گفتگو کا رخ پلٹ چکا تھا، ہالار کے آنسو جاری تھے، وہ اس کی بات سن تو رہا تھا مگر اس کے ذہن میں صرف ایک جملہ گونج رہا تھا کہ ”مجھے تم سے محبت نہیں تھی“

”یہ ایک جملہ بہت بڑا فرق دیتا ہے، صرف یہ کہہ دینا کہ مجھے تم سے محبت ہے اور پھر یہ کہہ دینا کہ مجھے تم سے محبت نہیں، زندگی دینے اور چھین لینے والی بات ہو جاتی ہے، جیسے آپ کسی سے زندگی کا احساس چھین لو، یا اسے کسی گہرے کنویں میں دھکیل دو کہ جاؤ جا کر مرو، مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا، کیونکہ مجھے تم سے محبت نہیں ہے اور کسی سے سچا اظہار محبت کرنا ایسا ہوتا ہے جیسے آپ کہہ دو کہ مجھے تم سے محبت ہے گو کہ وہ کسی گہرے کنویں میں آخری سانس لے رہا ہو اور آپ اسے کہہ رہے ہوں کہ مجھے تم سے محبت ہے آپ اسے زندگی کی امید دے رہے ہوں، آپ اسے کہہ رہے ہوں کہ مجھے بہت فرق پڑتا ہے، اس ساری چیز سے، تمہاری تکلیف سے اور آخری سانس لینے والا اگر جم کر کنویں سے باہر نہ بھی آسکا تب بھی وہ سکون کی آخری سانسیں آنکھیں موند کر چھوڑے گا، اس کے چہرے پر مسکراہٹ ہوگی اور وہ بتا رہا ہوگا کہ وہ خالی ہاتھ اس دنیا سے نہیں جا رہا، اس کے پاس ایک دولت ہے، جسے محبت کہتے ہیں، جو دنا سکھاتی ہے، جو وعدے کی پاسداری سکھاتی ہے، جو ذمہ داری ڈالتی ہے۔“

وہ کس منہ سے امر کلہ کو اپنے وعدے یاد دلاتا، اپنے ساتھ گزارے ہوئے وقت کا کون سا حوالہ دیتا، اس پر وفا کی کیا ذمہ داری ڈالتا، وہ تو صاف مکرگئی ہر احساس سے صرف یہ کہہ کر صرف اتنا کہ ”مجھے تم سے محبت نہیں ہے“ اور اسے لگا زندگی سارے در اس پر بند کیے جا چکے ہیں، ہر دروازے سے بس اک یہی صدا بلند ہوتی ہے کہ ”مجھے تم سے محبت نہیں، اس لئے دستک نہ دو“، یہ سب اس سے امر کلہ نے نہیں، جیسے زندگی نے کہا ہو، اسے پہلی بار احساس ہوا کہ اس کا باپ کئی سالوں سے موت کی تمنا میں آخر کیوں جی رہا ہے۔

☆☆☆

دوسرے دن صبح سویرے لکی اس کے سر پہ کھڑی تھی کہ ”تمہارا وہ تو بہت اچھا خاصہ ہیرو آدی ہے“ جبکہ اس کے لئے ڈوب مرنے کا مقام تھا کہ کسی مرد سے اس کے رشتے کو کن معنوں میں لیا جا رہا تھا، وہ بجائے ملامت کے سرگوشیاں تھیں نگاہوں کی روشنی معنی خیز انداز میں مسکراتی تھی، یہ سب

شاید ان سب کے لئے فخر یہ تھا۔

”لے میری بات سن شادی کیوں نہیں کر لیتی اس سے یہ چھپ چھپا کر ملنے سے تو جان چھوٹے گی نا، دن دیہاڑے ملا کر۔“

اس کا دل کیا زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔

”دیکھو میں یہ پہلی اور آخری بار کہہ رہی ہوں تم لوگوں سے میرا کوئی ایسا تعلق نہیں ہے اس آدمی کے ساتھ، میرا ساتھ پڑھا ہوا تھا خیریت معلوم کرنے آیا تھا اور بس۔“

”لے کس کو سکھا رہی ہے میما، خیریت معلوم کرنے آیا تھا اور منہ اندھیرے چپ چھپا کر۔“
ککو ہنسنے لگی تھی او بسکٹ کے دو پیکٹ ریشماں لڑکی کے ہاتھ لگے تھے، وہ بڑے شوق سے کھاتی ہوئی اندر آئی تھی۔

”بڑا اچھا ہے تیرا دولہا، کیسے خیال رکھتا ہے تیرا۔“ اس نے خونخوار نظروں سے اسے گھورا تھا۔
”چل دولہا نہیں بنا تو کیا ہوا بن جائے گا، ریشم کی دعا لگے تجھے۔“ اتنا کہہ کر وہ کھی کھی کرتی ہوئی کمرے سے چلی گئی تھی۔

اس کے لئے ذلت کے لمحات تھے، وہ سوچ سوچ کر پریشان ہو رہی تھی کہ اگر انکل کو ان باتوں کی بھٹک پڑ گئی تو اک اور تماشہ لگے گا، وہ اسی رات انکل کے گھر گئی مزید پیسوں کا مطالبہ کیا انہوں نے یہی کہا کہ مزید کچھ دن مہلت دے دی جائے اور یہ کچھ دن اس کا وہاں رہنا مزید دامن داغ دار کرنے کے مترادف تھا، وہ بے بسی سے دیکھنے لگی۔

”دیکھو ہمیں کوئی مسئلہ تو سو بار بلا اسے ہمیں کیا پڑی ہے، کہے تو رکھوالی کریں تیری۔“ اس کا دل کیا اس تیز دھار والی چھری سے اپنایا پھر ان دونوں کا خون گر لے۔
”دیکھو تسکو اور لگی بس بہت ہو گیا یہ کھیل، اب اس سے آگے کچھ نہیں۔“ اسی شام اس کی دونوں سے اچھی منہ ماری ہو گئی تھی۔

دوسرے دن حالار نے ضرورت کی اشیاء کسی اور کے ہاتھوں بھجوائیں تھیں اور ان کا شک توپکا یقین میں بدل گیا تھا۔

آدمی چیزیں چھوڑ کر رکائیں تھیں، چیزیں تسکو کا شوہر لے آیا تھا دروازے سے۔

امرکلہ نے وہ فروٹ بسکٹ چاکلیٹ اور چند ضرورت کی اشیاء والا تھیلا وہیں پھینک دیا تھا جسے آدھا تسکو کے بچے لوٹ کر لے گئے۔

وہ سیدھی حالار کے گھر کی طرف گئی تھی تاکہ اس کی اچھی خبر لے لے، مگر بد قسمتی سے اس کے دروازے پر تالا تھا، وہ اس کے آنے سے پچاس منٹ پہلے یہاں سے امرت کے ساتھ لاهوت کے گاؤں روانہ ہوا تھا۔

وہ اسے غیر حاضر دیکھ کر اپنی ساری بھڑاس اپنے اندر لیے وہیں لوٹ آئی، مزید ایک دو دن اس کے لئے وہاں گزارا کرنا زہر کے گھونٹ پی کر جینے کے مترادف تھا اور اسے یہ زہر کا گھونٹ پینا ہی پڑا تھا۔

زندگی میں پہلی نہیں کئی بار وہ خود سے بیزار ہوئی تھی اور یہ شکوہ کہ آخر میری زندگی کب پرسکون

ہو گئی، یہ زندہ رہنے والا ہر انسان کہتا تھا۔

☆☆☆

کسی مرے ہوئے مسلمان کے ساتھ آخری وفاداری کرنا بہت نیکی کا کام ہے، صبح سویرے اسے پتہ چلا تھا، علی گوہر کو جانے کہاں رات سے پھر سے پرانے روگ میں پھر رہا تھا، وہ عمارہ اور ہالار کو لے کر نکل آئی تھی، اس نے اپنے چاچے کا آخری مرتبہ منہ نہیں دیکھا تھا۔

اسے دیر ہو گئی تھی، اس نے سوچا تھا شاید وہ ان کو نہیں دیکھ پاتی، یا پھر دیکھتے شرمندہ ہو جاتی، مگر وہ دیکھنا ضرور چاہتی تھی، وہ جیسے بھی تھے ان سے وابستہ بہت یادیں رہی تھیں، پھر بہت ساری تلخی اپنی جگہ مگر ان کے احسانات اپنی جگہ، چودہ سال وہ ان کا لایا ہوا رزق کھاتی رہی تھی، ان کے لائے کپڑے پہنتی رہی تھی، ان کی دلائی چیزیں استعمال کرتی رہی تھی اور اس کے بعد بھی، جب تک اسے ماں باپ ساتھ لے گئی تب تک۔

وہ اتنی بھی احسان فراموش نہ تھی، لاسٹ ٹائم یہاں سے فرار ہو کر نکلنے کے بعد سب سے پہلی نگاہ ملانا دشوار تھا، مگر پھر اس نے سب کچھ سنبھال لیا، تین دن تک حویلی کے اندر کے انتظامات اس کے ذمے تھے اور اس نے بہت احسن طریقے سے نبھائے تھے۔

لاہوت کی ماں کو پتہ تھا اب کی بار وقت نہیں کسی ایسی بات کا، مگر دل میں یہ ایک بات رہ گئی تھی کہ کاش تب نکاح ہو جاتا۔

امرت سے وابستہ سب کی شکایتیں ختم ہو چکی تھیں، اس کی ماں گھر پہنچ چکی تھی تب اور فون پہ فون کر رہی تھی، مگر وہ دسویں تک وہیں رکی رہی تھی، علی گوہر چوتھے دن عمارہ کو لے کر گیا تھا اور ابھی وہ دونوں اسی مچھلی کے تالاب کے پاس بیٹھ کر باتیں کر رہے تھے، جب عبدالحادی کو انہوں نے گھر سے باہر نکلتے دیکھا۔

”یہ درگاہ کی طرف جا رہے ہیں؟“ امرت نے لاہوت سے پوچھا نہیں رائے لی۔
”ہاں مگر جا نہیں سکیں گے، کل بھی آدھے رستے سے لوٹ آئے تھے، دیکھنا آج بھی لوٹ آئیں گے، کوئی خوف ان کو کہیں جانے نہیں دے رہا۔“

”ان کا پہلا سوال کیا تھا لاہوت جب وہ بو اماں کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔“

”ان کا پہلا سوال یہ تھا کہ کیا جانے والا اپنے کام پورے کر گیا ہے؟“

”اور ان کا دوسرا سوال یہ ہو گا کہ وہ کیا کام ہو سکتا ہے اور تیسرا یہ ہو گا کہ اگر وہ اپنا کام ادھورا چھوڑ گیا ہے، تو کیا کوئی اور یہ کام پورا کر سکتا ہے؟ اور یہ بقیہ دو سوال انہوں نے بو اماں سے نہیں بلکہ خود سے کیے ہونگے، اگر انہیں پہلے سوال کا جواب مل گیا ہو گا تو ہو سکتا ہے بقیہ سوالوں کی نوعیت بدل گئی وہ، مگر مجھے اندازہ ہے کہ بو اماں نے کہا ہو گا کہ جس نے کام دیا ہو گا اسی کو پتہ ہو گا یعنی کہ خدا کو، تمہارے اندر کے کیا سوالات ہیں امرت؟“

”کس کے خدا کے متعلق؟“

”نہیں ان کے بتائے ہوئے روز کے متعلق، زندگی اور موت کے متعلق۔“

”لاہوت تمہارے ذہن میں خدا کے لئے کوئی دوسرا ہے کیا؟“

”پتہ نہیں امرت، بس میں ان کو تسلیم کرتا ہوں۔“

”ان کو تسلیم کون نہیں کرتا لاهوت، جو نہیں کرنا چاہتا وہ بھی کرتا ہے بلکہ اسے کرنا پڑتا ہے، خدا کی موجودگی کی حقیقت ہر جگہ خود اپنا اعلان کرتی ہے۔“

”امرت کیا ابھی تمہارا دل کیا کہ تم خدا کو دیکھو۔“ اسے اندازہ تھا لاهوت اس سے یہ سوال ضرور کرے گا۔

”لاہوت تمہیں پتہ ہے خدا کو دیکھتے نہیں محسوس کرتے ہیں، کسی بڑے اسکالر نے سچ کہا تھا کہ وہ اپنی صفات سے پہچانا جاتا ہے، وہ اپنی قدرت سے پہچانا جاتا ہے اور ہم اس کی قدرت دیکھ رہے ہیں۔“

”امرت میں نے یہ نہیں پوچھا کہ تم اسے دیکھو یہ پوچھا کہ کیا دل میں یہ تمنا ہے؟“ امرت کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے، فنکار کو بہت دیر ہوئی لوٹا نہیں تھا۔

”چلو لاهوت ان کی خبر گیری کرو، وہ شاید درگاہ تک پہنچ چکے ہوں گے، اکیلے ہیں، اتنے بہادر نہیں رہے کہ وہاں جا کر ڈریں نہیں، پورے رستے ان کا لاشعور انہیں طرح طرح کے واہے دے رہا ہوگا۔“ امرت نے یہ سوال کیوں کیا، وہ جان نہ سکا تھا۔

”پہلے انہوں نے اوطاق بسائی، اب اگر درگاہ میں روز روز جانے لگے تو درگاہ بسالیں گے، جب لوگ ان کو یاد کرتے ہونگے، وہ نہیں لوٹنا چاہیں گے، وہاں بیٹھ کر اپنے مرنے کا انتظار کریں گے اور وہ انتظار بہت جان لیوا ہوگا، نہ مارے گا نہ زندہ رکھے گا۔“

”لاہوت انہیں گھر لے آؤ، بس ان کا وہم ٹوٹنے دینا اس لئے کچھ دیر انہیں وہاں چھوڑنا پھر لے آنا۔“

”امرت اگر انہوں نے گوشہ نشینی اختیار کر لی؟“ وہ بھی ڈرا ہوا تھا۔

”تو پتہ نہیں کیا ہوگا، اس سے آگے میں سوچنا نہیں چاہتی۔“

”کیا تم میرے ساتھ چل سکتی ہو؟“

”ہاں ٹھہر جاؤ میں اپنی چادر لے کر آ جاؤں، یہاں اتنی ٹھنڈ ہے تو باہر کتنی ہوگی۔“

”ہاں مگر جلدی آ جانا۔“ وہ وہیں کھڑا تھا، وہ چادر لاتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ اتنے بچہ ذہنی

بیمار ہو جاتا ہے اور پھر وہ ذہنی طور پہ ہمیشہ اسی کرائسز کا شکار رہتا ہے، وہ اسی طرح ڈرے ہوئے تھے۔

”اور اس کی وجہ تمہیں پتہ ہے امرت کہ کیوں اور کس لئے ہمیں بچپن سے ایسے کئی ڈر دیئے

جاتے ہیں، کئی خوف جو ہمیشہ ہمارے ساتھ سفر کرتے ہیں، تمہیں یاد ہے بیچی ماں بچپن میں ہمیں کتنے ڈر دیا کرتی تھیں اور تم تو جسے چیلنج لے لیا کرتیں، یاد ہے ایک دن بڑے ابا کی کوٹھی کا تالا کھولنے تم رات میں چلی گئی تھیں مگر آدھا صحن عبور کرتے ہی تمہیں چیخوں کا دورہ پڑ گیا تھا، یہ بتاؤ کیا دیکھا تھا۔“

یہ چوتھا روز تھا لاهوت کے والد کی وفات کو پانچویں کی رات تھی اور چاندنی تھی، وہ دونوں چھوٹے پھلیوں کے تالاب کے پاس بیٹھ کر باتیں کر رہے تھے۔

ہالار واپس جا چکا تھا، وہ اسے لائی ہی زبردستی تھی یہ کہہ کر ہالار اگر زندگی میں کوئی نیکی نہیں کی تو یہ نیکی سمجھ کر کر لو۔

”مجھے اندازہ ہے ان کے سوال کس طرح کے ہو سکتے ہیں، مجھے بتاؤ لاهوت ان کا پہلا سوال کیا ہے؟“

”ان کا پہلا سوال کیا ہے؟ وہ یہ تو قطعی نہیں کہیں گے جانے والا کس لئے اور کیوں گیا، دیکھو تمہارا رونا فطری ہے، وہ تمہارے باپ تھے، بلکہ ہیں، جدائی کسی طور جدائی ہی ہے اور ان کا رونا بھی فطری ہے، مگر لاهوت وہ جس طرح رو رہے تھے اس دن، یقین مانو اپنے بھائی کے لئے نہیں روئے تھے، ان کے اندر بہت سارے دکھ رو رہے تھے، مگر ان کے رونے میں ایک خوف تھا، ایک ڈر تھا، جو دس سالہ بچے کے رونے میں ہوتا ہے، کسی ہونی انہونی کا ڈر، ماں کا دیا ہوا وہم جیسے مائیں بچوں کو منہ اندھیرے باہر نکلنے سے روکنے کے لئے عجیب واہموں میں ڈال دیتی ہیں، اس وقت معاشرے کی سو برائیوں سے روکنے کے لئے دینے والے ڈر کو وہ ہتھیار سمجھ رہی ہوتی ہیں، وہ سمجھتی ہیں ایک ڈر کا مقابلہ دوسرے ڈر سے کیا جاتا ہے بچہ رک جاتا ہے، ماں کے ڈر پر بچے کا خوف حاوی ہو جاتا ہے، بچہ جسمانی طور پر رک جاتا ہے، بچ جاتا ہے، مگر اس کا اندر کسی ڈر کی وجہ سے سہم جاتا ہے۔“ دنوں سے وہ ان سے سامنا کرنے سے گریز کر رہی تھی اور وہ خود بھی بھاگ رہے تھے۔

لاہوت اسے بتا چکا تھا کہ وہ انہیں بتا چکا ہے پھر نہ بھی بتایا ہوتا تو یہاں تک پہنچ جانا ہی بہت ساری باتیں سمجھا دیتا تھا، وہ چادر لے آئی، دونوں ان کے پیچھے پیچھے نکل گئے۔

☆☆☆

”یہ کچھ ڈھونڈ رہے ہیں امرت۔“ لاهوت اور وہ ان سے فاصلے پر کھڑے تھے۔

”یہ بہت کچھ ڈھونڈ رہے ہیں لاهوت، تم ان سے ملو امرت ان کی بے قراری کو قرار آئے گا، ان کی بے قراری اس وقت میں نہیں ہوں لاهوت، میں ان معاملات میں مغل نہیں ہونا چاہتی۔“

ذکار اپنے دادا کی مزار کی اوٹ میں سر نہواڑے بیٹھا تھا۔

”یہ شاید اپنی غلطیوں کا اعتراف کرنے آئے ہیں۔“ لاهوت دروازے سے باہر تھا، امرت کی آنکھیں پانی سے بھر گئیں۔

”یہ بکھرا اجڑا دل والا مایوس شخص جو اپنی زندگی کی آخری امید ڈھونڈ رہا ہے، یہ میرا باپ ہے، امرت انہیں تسلی دوتا۔“

”نہیں لاهوت، یہ وقت میری دی گئی تسلی کا نہیں ہے۔“

کوئی فقیر صحن سے اٹھ کر اس طرف آیا تھا۔

لاہوت نے کہا ”امرت یہاں سے ہٹ جاؤ“ وہ دونوں صحن میں اک کوٹنے میں کھڑے تھے۔

حویلی کی عورتوں کا یوں ٹکنا یہاں خواب سمجھا جاتا تھا، پہلے باقاعدہ طور پر پردہ کر دیا جاتا تھا۔

”اور پھر یہاں تشریف لائیں، رسومات اور اصولوں میں صدا کا بندھا ہوا بیچارہ انسان۔“ اس وقت امرت کا لگا تھا لاهوت کو اس کا یہاں کھڑا ہونا کھٹک رہا ہے، حالانکہ بے دھیانی میں لایا تو خود ہی تھا۔

یہ رات کا پہلا پہر تھا اور فقیر، مسجور مسافر خانوں میں ٹھہرے لوگ جاگتے تھے، فقیر قوالی کہتا تھا، یا قصیدہ پڑھتا تھا یا مناجات اور اس کے بعد فجر تک اللہ والوں کے پاس اللہ کا ذکر ہوتا تھا۔ جو زندہ اور مردہ دونوں دلوں کے سکون کا سامان ہے، امرت ایک کونے میں مسافروں کی طرح چھپ کر بیٹھ گئی، جیسے بچپن میں کرتی تھی، لاهوت اجنبی بن کر احاطے میں بیٹھا تھا، قوالی کے بعد مناجات اور پھر ذکر خدائے کریم کی ہو گو بنجنے لگی تھی۔

”سب طاقتیں خدائے واحد کی ہیں۔“ وہ کونے میں تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اس فجر مسافر خانے میں نماز پڑھنے کے بعد اس نے نکلنے سے پہلے لاهوت کو کہا تھا کہ مجھے بلا لینا جب ضرورت پڑے۔

”اس نے کہا کب؟“

”کہنے لگی جب میرا باپ بچا رگی کی انتہا کر دے اور بڑے سائیں کا حجرہ یا مزار بسا دے، جب وہ اپنی تلاش کو ایک کونے میں سمیٹنے کی حرکت کرے گا (نہیں معلوم وہ غلطی ہوگی یا نہیں) اس دن میں ان سے پہلی بار کھل کر بات کروں گی۔“ وہ اس دن کے انتظار میں وہاں سے نکلی تھی اور اسے نکلتے وقت پتہ تھا کہ وہ وقت دور نہیں ہے، وقت نزدیک تھا۔

☆☆☆

یہ نواب شاہ کی طرف جاتی ہوئی سڑک پر بس اسٹاپ کے پاس کھڑی گاڑیوں کے بیچ میں سے آتا ہوا تیز رفتاری سے اس کی طرف دوڑتا کالی وردی والا پولیس آفیسر تھا، وہ اسے اپنی طرف دوڑتا دیکھ کر خود ہی رکی تھی، بھاگی نہیں، بھاگتے مجرم ہیں۔

اسے صرف حیرت تھی کہ آدمی اس کی طرف کیوں دوڑا آیا ہے، وہ رکی، وہ واقعی اس کی طرف آیا تھا، مگر آتے ہوئے اس کی اسپید اس لئے سلو ہوئی کہ کچھ لمحوں کے لئے وہ خود حیران تھا کہ خاتون اسے دیکھ کر رکی کیوں ہے، حلیہ تو وہی جو بتایا گیا تھا۔

”میڈم، سادھنا بچی کے کیس میں آپ کو تھانے چلنا ہے۔“

”سادھنا! کہاں ہے وہ؟ کون سا کیس؟“ وہ جی بھر کر حیران تھی اور آدمی کا شک یقین میں بدل گیا۔

”میں آپ کو جھکڑی نہیں پہنانا چاہتا، آپ ساتھ چلیں میرے۔“

”مسئلہ کیا ہے؟“

”اچھی خاتون لگتی ہیں، کیسے کر لیا کام یہ۔“

”مجھ پہ کوئی الزام؟“ وہ حیران تھی، پولیس والا اور شرافت سے بات کر رہا تھا اس پہ پولیس

والے کو زیادہ حیران ہونا چاہیے تھا۔

”آپ چلیں تھانے چل کر بات ہوگی۔“

”اچھا ٹھیک ہے۔“ اسے خود سڑک پر تماشہ کرنا معیوب لگ رہا تھا، وہ اتنے اطمینان سے کھڑی تھی جیسے آدمی سے وہ گہری واقفیت رکھتی ہو۔
 ”تھانہ کہاں ہے؟ آپ میرے پیچھے آئیں، میں رکشہ پکڑتی ہوں، اگر ادھر ادھر ہو جاؤں تو فائرنگ کا حق آپ کو ہے۔“

عجیب خاتون تھی، وہ موٹر بائیک پر سوار ہوا، خاتون نے رکشہ پکڑا، سیدھا تھانے پہنچا، وہ اسے اندر لے آیا، آدمی نے سونا کوفون کر دیا تھا۔
 ”آ جاؤ تھانے تمہاری مجرم یہاں ہے۔“
 اور دوسرا فون سب انسپکٹر کو تھا۔

”سروہ خاتون موجود ہے جس کو آپ نے بہت عزت سے لانے کو کہا تھا۔“ وہ کارروائی اس کے سامنے کر رہا تھا اور امر کلہ کے لئے یہ لمحہ ایک حیران کن لمحہ تھا، مگر وہ صبر سے بیٹھی تھی، تو ایک اور امتحان اب کس طرح کا رہتا ہے، اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔
 تھوڑی دیر میں سونا آگئی تھی اور اس پر چلا رہی تھی۔

”دیکھو سونا ایک لمحے کے لئے بیٹھو میری بات سنو، میرا یقین کرو مجھے سادھنا کی گمشدگی کا کچھ پتہ نہیں میں تو اتنا عرصہ اپنے کاموں میں گم رہی۔“ مگر وہ مسلسل چلا رہی تھی۔
 ”اسے کہو بتادے میری بیٹی کو کہاں چھپا کر رکھا ہے، کس لالچ میں چھپا رکھا ہے۔“
 اسی وقت سب انسپکٹر آیا تھا۔

”آپ ہی ہیں؟“ وہ مسکرایا۔
 ”کیسی ہیں آپ؟“ سپاہی حیران تھا۔
 ”سریہ وہی ہے جنہوں نے اس خاتون کی بیٹی کو اغواء کر دیا ہے۔“
 ”اچھا واقعی؟“ امر کلہ نے سپاہی کو تعجب سے دیکھ کر کہا۔
 ”جی ہاں واقعی، اس پر سزا ہوتی ہے۔“
 ”سرنے اگر نشانیاں نہ سمجھائی ہوتیں تو میں آپ کو ایسے نہ لے کر آتا۔“
 ”رفیق مجھے بات کرنے دو۔“

”بیٹی میں آپ کو کبیر احمد کے حوالے سے جانتا ہوں ان کے ساتھ دیکھا تھا، پہلی بار انہوں نے کہا یہ میری بیٹی ہے بہن ہے، دوسری بار پروفیسر غفور نے کہا کہ اس قسم کی لڑکی جہاں نظر آئے اسے عزت سے لانا اور کہنا تمہیں کہاں جانا ہے، مگر اس سے پہلے میں آپ کو بتاؤں، آپ کی خودکشی کی خبر کے بارے میں بھی جانتا ہوں۔“ یہ جملہ انہوں نے آہستگی سے کہا تھا، سونا پھر سے فریادی کی طرح چلائی۔

”چپ خاتون انہیں بولنے دو۔“

”میں کیا صفائی پیش کروں اب، مجھے خود سادھنا کی گمشدگی کا دکھ ہو رہا ہے، کہیں تو ایک رپورٹ میں بھی لکھوا لوں اور وہ رپورٹ میں بھی یقیناً سونا تم پر ہی لکھواؤں گی کیونکہ اس کے گھر سے بھاگنے کی ذمہ داری میں کم تم زیادہ ہو۔“

”مگر یقین کرو ایک ماں ہونے کے ناطے تمہارا دل جیسے اس کے لئے تڑپتا ہوگا، تمہارے احساس بھی سمجھتی ہوں۔“

”پلو یہ وعدہ رہا پکا والا کہ جب کبھی سادھنا مجھے نظر آئی میں اسے تمہارے پاس لاؤں گی، تم دل مت چھوٹا کر سونا۔“

”آپ کو ہم کہاں چھوڑ دیں؟“ سیاہی کو سب انسپکٹر کا اشارہ تھا۔

”مجھے کہیں چھوڑنے کی ضرورت نہیں، میں اپنا پتہ اور نمبر چھوڑے جا رہی ہوں، شک اب بھی موجود ہو تو رابطہ کر لیجئے گا۔“ وہ انسپکٹر کا شکر یہ ادا کر کے نکل آئی، سادھنا کی فکر باقی تھی۔

☆☆☆

”تو تم تیار ہو گئیں امرت؟“ عدنان دروازے سے جھانکتے ہوئے بولا۔

”میری کیا تیاری ہوگی۔“ اس نے جلدی جلدی کچھ کپڑوں کے نیچے چھپا دیا تھا، وہ مشکوک ہو کر اندر آیا، بظاہر نارمل۔

”آج تمہارا خواب پورا ہونے جا رہا ہے، مجھے یقین ہے امرت تمہیں جگہ پسند آئے گی، بہت اچھی جگہ یہ مل گیا اسٹور اور اسٹاف کا تم نے کیا سوچا؟“ وہ اس کے سامنے آکھڑا تھا الماری کا پٹ کھلا تھا، عدنان نے اسے بیگ لینے کے لئے کہا۔

وہ میز کی طرف آئی اور اس نے ڈھیر سارے بے ترتیب گھسیڑے ہوئے کپڑوں میں سے جھانکتا سرخ کپڑا جو خود اپنی چغلی کھا رہا تھا۔

”تمہاری الماری سے کوئی چیز باہر آنا چاہتی ہے۔“ یہ بچوں کی جادوئی فلم کا ایک جملہ تھا جو صورتحال پر فٹ بیٹھتا تھا، وہ بے ساختہ ہنسی تھی۔

”تم نے کب سے اپنے بچے کے ساتھ بیٹھ کر فلمیں دیکھنا شروع کر دی ہیں۔“

”پوچھو کب سے دیکھنا بند کر دی ہیں، جب سے میرا چھوٹا نیند میں ڈرنے لگا ہے۔“ گٹھڑی باہر تھی اور اس کے ہاتھ میں تھی۔

”اسے کھولنا مت، عدنان پلیز مت کھولنا۔“

”کیوں؟ اس میں ایسا کیا راز ہے۔“ اسے تو کھولنا ہی تھا، امرت کو یاد آیا منع کرنے پر تجسس

بڑھتا ہے۔

”اچھا ٹھیک ہے کھول دو۔“

”اچھا، بہت شکریہ۔“ وہ کھول چکا تھا یہ اک چٹ تھی وہ بے ساختہ آگے بڑھی۔

”اسے یقیناً مت کھولنا عدنان پلیز۔“ اس نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ کی گرفت مضبوط کر لی۔

”تم نے تعویذ کب سے لکھنا شروع کر دیا ہے۔“

”میں نے کوئی تعویذ نہیں لکھا۔“ وہ گھبرائی کیوں تھی۔

”تمہیں یہ کہنا چاہیے تھا کہ تم نے تعویذ لکھنا چھوڑ دیا ہے، مجھے یاد ہے تم اپنی سہیلی کے لئے کتنے نقش لکھتی تھی، کتنی پلٹیں لکھتی تھیں اور تسبیاں پڑھتی تھیں۔“

”یہ بھی اسی کے لئے تھا۔“

”ہاں..... ٹھیک ہے اب مجھے دے دو عدنان۔“

”اس میں ایسا کیا ہے امرت؟ یہ تجس مجھے تب بھی تھا مگر مجھے اندازہ نہ تھا کہ میں کبھی اس پوزیشن میں آ سکوں گا کہ تمہارے سامنے تمہارے کمرے میں کھڑا ہو کر تمہاری الماری کھول سکوں گا۔“

”بس بہت ہو گیا۔“ اس نے چٹ چھین لی اور پرس کی اندرونی پاکٹ میں دبالی، گٹھڑی کا کپڑا کسی بھی تجس سے خالی الماری کے سامنے والے خانے میں ظاہر پڑا تھا، اس کی اہمیت گھٹ گئی تھی، وہ جیسے ہلکا پھلکا ہو کر ٹھنڈی سانسیں بھر رہا ہو، امرت نے بیگ کندھے سے لگایا، گلاسز پکڑے۔

”اب چلو، چلنا ہے یا نہیں۔“

”مجھے اگر چٹ کھولنی ہوتی تو میں کھول چکا ہوتا۔“

”چلو عنقریب تمہارے عجوبے بھی پہنچ جائیں گے۔“

”کون عجوبے؟ علی گوہر اور عمارہ، لاهوت۔“ وہ جانتی تھی۔

”اور کون بھلا؟“

”میں اگر بیچکر ہوتا تو تمہاری کزن بیچاری سے شادی کر لیتا، اس کی ماؤس کے حوالے نہ کرتا۔“

”شرم کرو عدنان۔“ وہ اسے ٹوکتی ہوئی باہر گئی۔

”تم ایک ساتھ اس طرح بات کرتے ہوئے اچھے لگتے ہو۔“ صنوبر امرت کے لئے ناشتہ لا رہی تھی، عدنان کر چکا تھا۔

”اب تم اور دیر کرانا مجھے۔“ وہ کوفت سے بیٹھ گیا۔

”بس تھوڑا سا تو چکھ لوں ذرا، امی کے ہاتھ کے پراٹھے تو چھوڑنا مشکل ہے۔“

وقار صاحت دھوپ سینکے باہر لاؤنج کی کھڑکیاں کھولے اخبار دیکھ رہے تھے۔

سب کتنا اچھا لگ رہا تھا، اسی وقت لاهوت اور عمارہ ایک ساتھ اندر آئے تھے۔

”لو بلبل اور جگنو آ گئے۔“ ان کے سامنے عدنان کافی لحاظ کر لیا کرتا تھا۔

”تم نے آخر کیا سوچ کر اس کو مجھ سے شادی کروائی بولو؟“ لاهوت آتے ہی کھانا اور بولنا دونوں کام ایک ساتھ شروع کر دیتا تھا۔

”میں خود اس سے بیزار ہوں۔“ عمارہ کے چہرے پہ جھلاہٹ تھی۔

”خوشی خوشی گئی تھیں، شادی کو دو ہفتے ہوئے ہیں اور یہ عالم ہے، دو صدیوں کی دعا کیسے

دوں۔“ وہ ناشتہ ختم کر چکی تھی اور اب لاهوت پر نظر تھی۔

”علی گوہر کی بہت کمی ہے امرت۔“ لاهوت کو محسوس ہوا۔

”شکر ہے تمہیں کسی کا احساس تو ہوتا ہے۔“ عمارہ کا یہی حال تھا۔

”عمارہ شادی کے بعد پچھتانے کے لئے کم از کم دو سال کی ضرورت ہوتی ہے دو ہفتوں میں

یہ حال ہے، مت پوچھو امرت میں تو دوسرے دن بیزار تھا۔“ وہ اب چائے پی رہا تھا پوری کھا کر

اور اب جائے پی رہا تھا، عمارہ اسے گھور رہی تھی۔
 ”صبح سے میں نے بھی کچھ نہیں کھایا خالہ؟“ اس کی فریاد وہاں تھی جہاں درج ہوتی تھی۔
 ”میری جان تم یہ کیک لے لو۔“

”اوہ اسے کھاتے کھاتے ایک گھنٹہ لگے گا، گاڑی میں کھالوں گی۔“ لاهوت کو آدھا کپ
 وہیں چھوڑنا پڑا تھا، ایک چپس امرت کو اشارہ کر کے عمارہ سے لیتا ہوا لاهوت بھی ہاتھ میں پکڑے
 ہوئے تھا۔

”تم شادی کے بعد کچھ زیادہ پیو ہو گئے ہو لاهوت۔“ امرت اسے گھر کتنی گاڑی تک آئی،
 عدنان ڈرائیونگ سیٹ سنبھال چکا تھا۔

☆☆☆

”جس کو کبھی حقیقت سمجھا تھا وہ کئی لاشعور کی کیفیتیں نکلیں اور جس کو لاشعور کی حرکت سمجھتی
 رہی، درحقیقت وہی حقیقتیں تھیں۔“ امر کلہ نے پلٹتے ہوئے سکھی کی طرف ڈبڈبائی آنکھوں سے دیکھ
 کر کہا تھا۔

اس کی ماں برق رفتاری سے اندر آئی تھی اور اتنی ہی بے ساختگی سے ایک زوردار تھپڑ امر کلہ
 کے منہ پر جڑ دیا، جتنی حیران امر کلہ تھی اس سے کہیں زیادہ وہ خود تھی۔
 ”تم نے اسے تھپڑ کیوں مارا؟“ سکھی حیران تھی اور دکھی بھی۔

امر کلہ کو تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا اس نے ایک بار اپنے دہکتے ہوئے گال کو چھو کر یقین کرنا
 چاہا کہ یہ تھپڑ سونا نے سادھنا کو مارا ہے یا اس کی ماں نے اسے۔

”تم نے اس کیوں مارا؟“ سکھی کا بس چلتا وہ الٹا جڑ دیتی اسے، یقیناً سو جڑتی اگر رشتے میں
 اس سے بڑی ہوتی یا عمر میں، لحاظ والے کو تو عمروں کا لحاظ ہی مار دیتا ہے۔
 ”میں نے اسے خواب میں دیکھا ہے۔“ وہ ہانپ رہی تھیں۔

”خواب میں دیکھا ہے اور اسے مارنے آئی ہو خواب میں کیا دیکھا ہے تم نے؟“
 ”اس نے میرے ساتھ دھوکا کیا ہے سکھی، یہ ماں کو بہکا دئے دیتی ہے۔“ تھپڑ دوبارہ پڑا تو
 امر پیچھے ہٹی اور سکھی بیچ میں آگئی۔

”ہوش میں تو ہو تم یہ کر کیا رہی ہو، خواب میں ایسا کیا ہوا ہے آخر؟“
 ”خواب میں، میں نے اسے جھوٹی کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا ہے۔“ وہ جیسے آنکھوں سے
 انگارے اگل رہی تھیں۔

”پھر اسے سو مارو۔“ سکھی بیچ میں سے ہٹ گئی اور امر کلہ کی آنکھوں سے دو چار اشک ایک
 دوسرے کے پیچھے بے قرار ہو کر بہہ گئے۔

”اسے سو مارو، دو نہیں۔“ سکھی نے بات دہرائی، امر کلہ نے بے بسی سے اسے دیکھا، اس کی
 آنکھوں کے آگے جھلمل تھی پانیوں کی۔

☆☆☆

مینز کے عین سامنے یہ بڑی سی کھڑکی تھی اور لوکیشن دیکھنے لائق یہ گاڑیوں انسانوں دوکانوں

دفتروں سے بھری ہوئی آباد پر رونق سرک تھی، تو اس کا سالوں کا خواب پورا ہونے لگا تھا، آج پرچے کے لئے پہلا مواد موصول ہوا تھا، علی گوہر کاغذوں کے لفافے لے آیا تھا اور اس نے یہ ڈھیر میز پر الٹ دیا تھا۔

”تو کرواب امرت بی بی اپنے سارے پورے شوق۔“ اس کا لہجہ لاکھ ہشاش سہی مگر چہرہ اپنی داستان خود سناتا تھا۔

”عمارہ کا فون آیا تھا؟“ اس نے اندازہ لگانا چاہا۔
 ”نہیں، اس کے پاس وقت ہے مگر کسی اور کے لئے۔“
 ”تمہیں اس کا شکوہ ہے گوہر؟“

”نہیں امرت شکوہ کیوں، اسے خوش دیکھ کر دل آباد ہو جاتا ہے۔“
 ”تو پھر کیا مسئلہ ہے؟“

”کوئی مسئلہ نہیں، میں بے مسائل فکر مند ہوتا ہوں یا پھر میرا چہرہ ہی ایسا ہے۔“
 ”کل تم نے بہت توجہ سے کام کیا تھا گوہر۔“ وہ کتابوں کے کارٹن اسٹور سے لارہی تھی، یہ عدنان کے آنے کا وقت تھا، اس سے پہلے وہ اس سے کچھ الگوانا چاہتی تھی۔
 گاؤں سے بہت دن بعد واپسی پر ریڈیو جانے کی تو اسے ہمت نہ ہوئی اور جانے والے نے اپنی بک شاپ کہیں اور منتقل کر دی تھی۔

اس کی ماں صبح سے لوٹنے کے بعد کافی مطمئن تھی اسے شاید امرت پر یقین آ گیا تھا یہ امرت کا خیال تھا، وہ ماں کو عبادت میں مگن دیکھ کر کافی مطمئن ہوتی تھی، یا پھر گھر کے کام کاج میں، وہ محل سے جسے ماں کے لہجے میں محسوس کرنے کا اسے سالوں سے ارمان تھا، وہ اب کے کبھی کبھار جھکتا تھا۔

فنکار گاؤں کا ہو کر رہ گیا تھا۔

عمارہ اور لاهوت کا نکاح بھی شاید آسمانوں پر لکھا ہوا تھا سو چالیسویں کے فوراً بعد ایسی صورتحال بن گئی تھی۔

”عمارہ نے خود کہا کہ امرت میں راضی ہوں، تم لاهوت سے بات کر لو۔“

پوڑھے ماں باپ کی پریشانیوں کو برداشت کرنے کی حد جیسے ختم تھی اور گوہر کی بگڑتی ہوئی حالت بکھرتی ہوئی پریشانی کا سبب کبھی کبھار وہ خود کو بھی سمجھتی تھی۔

نکاح کے بعد بڑی حویلی میں رخصت ہو کر جاتے وقت وہ خوش تھی، لاهوت سیدھا سانیک نیت انسان تھا، بس تنگ بہت کرتا تھا اسے، زیادہ تر شہر رہتا تھا دیر دیر سے لوٹتا تھا اور ساس کی تنہائی کی وجہ سے عمارہ کو گاؤں میں ہی رکنا ہوتا تھا۔

وہ دونوں سیٹ تھے، کبھی شکایت کبھی شرارت، عدنان نے پرچے کے لئے امرت کو اچھی خاصی رقم قرضے پر دی تھی، مگر اس نے دل ہی دل میں سوچا تھا اگر پرچہ نہ چل سکا، سرمایہ ڈوب گیا تو وہ امرت سے ایک پائی بھی واپس نہیں لے گا، مگر امرت نے بھی سوچ کر رکھا تھا کہ اسے آہستہ آہستہ رقم کیسے لوٹانی ہے۔

اس نے سنا تھا حنان کی شادی ہو گئی ہے، اسے دلی طور پہ سکون محسوس ہوا تھا کہ چلو کوئی اپنی زندگی میں سیٹ ہوا۔

اپنا سوچتے ہوئے اسے اس سے کوئی بھی ہمدردی نہیں ہونی چاہیے تھی مگر خود اس کا رویہ اس کے بارے میں سوچتے ہوئے اسے ایک دوبار فکر ہوئی تھی، کچھ لوگ دوسروں سے زیادہ خود کو نقصان پہنچاتے ہیں اپنی حرکتوں سے۔

اس کی بیوی اس نے دیکھی تھی وہ بھی اس کی طرح سونے پہ سہاگہ تھی ثریا نام تھا، کام کی تو بہت تیز تھی، خصوصاً زبان کے کام کی، اس نے پہلی ملاقات جو اتفاقہ تھی اس میں جو ہر ملاحظہ کر لئے تھے، کسی کی تقریب ولیمہ کے گیسٹ پر اسے حنان لینے آیا تھا اور اسے دیکھ کر بوکھلا سا گیا تھا، وہ ایک ہمدردانہ مسکراہٹ دے کر عمارہ کی گھورتی ہوئی آنکھوں کے اثر میں گاڑی تک آئی اور پھر آدھے گھنٹے تک اس کی ڈانٹ کھاتی رہی تھی اور لاہوت ہستار ہا تھا۔

آج بھی اتفاقی طور پہ اس کا سامنا حنان سے ہوا جب وہ گوہر کے ساتھ آرہی تھی، گوہر تو خود میں کھویا تھا اور ابھی تک یہی حال تھا۔

”گوہر دو چیزیں انسان کے ساتھ سفر کرتی ہیں۔“ وہ کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی، علی گوہر لفافے چاک کر رہا تھا۔

”خدا کی نظر اور اس کا رحم، دیکھو ایک صفت قہر کی بھی ہے مگر صرف دو، قہار اور جبار، پر پتہ ہے سب سے زیادہ رحیم کی صفت اثر انداز ہوتی ہے۔“

”تمہیں یہ کیوں لگتا ہے امرت کے خدا کے بارے میں تمہارے سوا ہر کسی کچھ غلط نظریات لاحق ہیں۔“

”ہر دفعہ ضروری نہیں ہے کہ آپ کو کوئی معلم اعلیٰ ملے سمجھانے کے لئے۔“ امرت بھی اپنے نام کی ایک تھی۔

”تو تم معلم بن جاؤ، دیکھو امرت تم ان پرچوں درچوں کے جھنجھٹ سے نکلو درس دینا شروع کر دو۔“ اس کے لہجے کی جھلاہٹ یہ وہ ہنس پڑی تھی۔

”تمہیں یاد ہے تم سے کسی نے کہا تھا کہ پہلے خود کو ڈھونڈو اور اگر یہ بھی یاد ہو گا کہ تم نے کہا تھا کہ میں نے خود کو بہت سی جگہوں پر کھویا ہے، کہاں کہاں سے ڈھونڈوں، کہاں تلاش کروں گا، سمیٹوں گا، بہت سی جگہوں پر خود کو کھویا ہے۔“

”تم وہ سب کیوں یاد دلارہی ہو مجھے، کیوں بار بار وہ دھن بجا کر میرے احساسوں کو چھیڑ دیتی ہو امرت۔“ یہ شکوہ تھا مگر میٹھا، دھیمہ۔

”گوہر روحانیت اور اس کی ضرورتیں ہم سے الگ نہیں ہیں، ہم اپنی پوری فطرت کے ساتھ سفر کرتے ہیں، مجھے لگتا ہے کسی حادثے میں ٹھہر گئے ہو، تم کہیں رکے ہو، گوہر ہم سب کسی نہ کسی حادثے میں رکے ہوئے ہیں ٹھہرے ہوئے ہیں، ہم سفر نہیں کر پاتے ہم رکے ہوئے ہیں، میں تمہیں یہ نہیں کہہ رہی کہ وطن چھوڑ دو، میں کہہ رہی ہوں سلسلے کو آگے بڑھاؤ۔“ وہ لفافے چھوڑ چکا تھا۔

”تم نے اور امرکھ نے بہت سفر کیا ہے۔“
 ”ہم سب نے بلکہ اور ہمارے ذہن و دل کہیں ایک جگہ کسی واقعے میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔“
 گوہر نے اس کی طرف بہت سنجیدگی سے دیکھا تھا اور کچھ کہنا چاہا تھا مگر اسی وقت دروازہ کھلا،
 ہالار بے ترتیب حالوں میں آگے آیا۔

”چاہتی کیا ہو تم آخر؟ مر جائے میرا باپ؟ جان سے جائے؟ یہی نا۔“
 ”تم ہر روز ایک نیا تماشہ لے کر کیوں آ جاتے ہو ہالی؟“ گوہر کو پہلا تماشہ ابھی یاد تھا۔
 وہ امرکھ اور اس کے بارے میں تھا اور یہ تماشہ وہ باپ کا لیبل چسپاں کر کے کرنے آیا تھا
 زبان سے۔

”تم پیچھے ہٹ جاؤ، مجھے بات کرنے دو اس سے۔“ وہ گوہر سے مخاطب تھا۔
 ”اسے کہنے دو ابھی اس کے اندر میرے لئے بغض باقی ہے یہ بغض نہیں ہے سچ ہے، ایک
 کھرا سچ، میرا باپ، دیکھو امرت میرا باپ بہت برے حالوں سے اس کو ٹھڑی میں پڑا ہوا ہے، اس
 کا ذمہ دار کون ہے کہ وہ میرے ساتھ نہیں آ رہا۔“ وہ میز پر عاجزانہ جھک گیا تھا، دوسرے لمحے یہ
 پہلے والا ہالار تھا۔

”میں کیا کروں ہالار اس کے بارے میں؟“
 ”جاؤ، میرے باپ کو وہاں سے لاؤ۔“
 وہ کہنا چاہتی تھی کہ میرا بھی باپ ہے مگر نہیں کہہ سکی، کچھ رشتوں کا زبانی اقرار بہت مشکل ہوتا
 ہے۔

”ہالی میری بات سنو، میں نہیں جاسکتی، ابھی نہیں بہت کام ہے میرے سر پہ ابھی۔“
 ”تمہیں کاموں کی پڑی ہے اور ایک زندہ انسان مر رہا ہے۔“ وہ چلایا تھا۔
 ”وہ نہیں مریں گے بے فکر ہو جاؤ تم۔“
 ”کیوں؟ انہوں نے اب حیات پیا ہے اور وہ تم نے پلایا ہوگا۔“ اس کا چہرہ غصے سے سرخ
 تھا، وہ اپنی مجبوری کی خاطر پل بدل رہا تھا۔

”اپنے ذاتی مفاد کے لئے لوگوں کو اُلو کا پٹھا بنانا چھوڑ دو، خود جاؤ اور جا کر لے آؤ، میں کس
 رشتے اور کس منہ سے کس حق سے جا کر لے آؤں گی، مجھے تمہارے باپ نے کوئی ایسا حق نہیں دیا
 ہوا۔“ تمہارا باپ کہتے ہوئے اسے کتنی تکلیف ہوئی تھی یہ وہ خود ہی جانتی تھی، ہالار نے شلنگی سے
 اسے دیکھا تھا۔

”تم نے مجھے زندگی میں ہمیشہ مایوس کیا تھا، کیا ہے، مجھے تم سے کوئی امید نہیں رکھنی چاہیے
 تھی۔“ اس نے اپنی جیب سے ایک کانڈ نکالا جس میں کئی کانڈات چھپے تھے وہ اسی میز پر پھینک
 گیا، وہ اس کی غلطیاں اس کے منہ پر مار گیا تھا، سیدھے سیدھے اس کے منہ پر مار گیا، اسے ہمت
 نہ تھی کہ وہ کانڈ چاک کرے اور دیکھے، وہ کیا دیکھتی، وہ دیکھتی ہی رہ گئی تھی۔

”انسان کی کوتاہیاں غلطیاں بچپن لا پرواہی میں کیا گیا کوئی بھی کام، اس کے سامنا کرتا ہے
 ایک دن اسے آئینے میں لا کھڑا کرتا ہے، یا پھر اس کے منہ پہ ایک طمانچہ مار دیتا ہے، اس لمحے میں

انسان کو عزت دار کہلوانے سے بھی شرم محسوس ہوتی ہے۔“ اس کا ڈوب مرنے کو جی چاہا تھا، گوہر نے کاغذوں کا ڈھیر اٹھایا۔

”اس میں کوئی مقدس نام ہو تو اسے نکال دو، باقیوں کو آگ لگانی ہے۔“ وہ لمحے میں جان گیا یہ کام امرت نہیں کر سکتی۔

”اسے میں پانی میں بہا دینا چاہتا ہوں امرت، تمہیں کوئی اعتراض ہے؟“ اس کی آنکھوں میں ڈھیر سارا پانی تھا، وہ جوائنڈیٹر کی کرسی کے سامنے کھڑی ہو کر بولتی تھی، وہ جو کسی کی بات کے جواب میں اٹل ہوتی تھی، ابھی کیسی ڈھیر ہو گئی تھی، گوہر چند لمحے سوچتا رہا پھر جیب میں ڈال دیئے، بلکہ اس لئے کاغذ۔

”فکر مت کرنا میں پڑھوں گا نہیں، فرض کرو پڑھ بھی لئے تو تم سے کچھ نہیں کہوں گا، اگر کچھ کہہ دیا تو تم ایک طمانچہ میرے منہ پر مار دینا، پھر اس کے بعد تمہارے سامنے سراٹھا کر جی نہ سکوں گا اور اگر زندہ رہا تو تمہارے سامنے نہیں آؤں گا، سامنے اگر آ بھی گیا تو سراٹھا کر نہیں چل سکوں گا، ڈوب مرنے کا مقام ہو گا میرا اور امرت یقین جانو جس دن ڈوب مرنے کا مقام آیا اس دن لمحے کی دیر نہ کروں گا، ڈوب مر کے دکھاؤں گا۔“

”اسے مت بڑھنا گوہر، اگر یہ غلطی کر بیٹھے اگر اسے پڑھ لیا تو مجھ سے نہ پوچھنا، بس یہ پوچھنا کہ امرت کیا تمہیں حالار سے واقعی محبت ہو گئی تھی۔“ وہ لمحہ نہیں تھا، حیرانی تھی یا بے یقینی یا پھر کوئی یقین کی سمجھ، مگر امرت کی آنکھوں میں پانی تھا۔ علی گوہر کو جب اپنی بے بسی پر رحم آ جاتا تھا یہ تو پھر امرت تھی، مطلب کہ دوست تھی۔



اس نے کھڑکی سے جالے ہٹا دیئے تھے، وہ کونٹھی کے اندر جیسے بے سدھ بڑے سو رہے تھے، بالکل گہری نیند خراٹوں والی جو زندگی کا ثبوت دیتی تھی، مگر ایک ہلکی سی خراہٹ تھی، کوئی بھنبھناہٹ سی وہ جھک گئی کان کے قریب، حالار دروازے کے باہر جیسے دم سادھے کھڑا تھا، اس نے جھک کر کان نزدیک کیا مگر اس سے بھی تیز آواز سنائی دی تھی، نیند بہت گہری تھی ان کی مگر ان کے اندر سے حالانکہ ہونٹ بھینچے ہوئے تھے، مگر اللہ ہو کے ورد کی آواز ان کے اندر سے آرہی تھی، اس نے چونک کر حالار کو دیکھا اور حالار نے اسے یہ نفس کی ہو، نہیں نفی نفس کی ہے، وہ بوکھلائی، پھر سیدھی ہوئی، جز اور کل کے فلسفے کا سوال سراٹھا کر ایک بار پھر سامنے کھڑا ہو گیا تھا۔

(جاری ہے)



سورقہ اور شہزادی

عابی ناز



ریڈ کور والی خوبصورت نقش و نگار سے مزین ڈائری اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین بوس ہوئی، دعا کا پورا وجود اس وقت زلزلوں کی زد میں تھا، دل پائوں کی گہرائیوں میں ڈوب چکا تھا تو ذہن لامحدود خلاؤں میں گھوم رہا تھا، چند ساعتوں کے بعد اس کا سکتہ ٹوٹا تو اس نے بے یقینی سے ریڈ منقش ڈائری کو دیکھا جو اس کی عزیز از جان دوست حیا سبحانی کی تھی اور پھر اسے اٹھا کر اپنی گود میں رکھ دیا۔

”آخر میں اتنی لاعلم کیسے ہو سکتی ہوں؟“ ایک ہی سوال کی بازگشت دماغ کی وادیوں میں گردش کرنے لگی تو اس نے گھبرا کر ایک بار پھر ورق گردانی شروع کی۔

”میں حیا سبحانی اپنی دوستی پر محبت کو قربان کرتی ہوں، میں دعا بخاری کو اذہان علوی پر ترجیح دیتے ہوئے اپنی محبت کو اسی ڈائری کی قبر میں ہمیشہ کے لئے دفن کرتی ہوں۔“ الفاظ تھے یا کوئی سرسراتے ناگ؟ دعا نے ہاتھ میں پکڑا کٹشن ڈائری کے صفحات پر رکھ کر گویا اس تلخ حقیقت کی نفی کی اور سر صوفی کی پشت سے ٹکا کر خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔

تھوڑی دیر بعد ماضی کا دھندلا عکس جو ذہن کے پردے پر جھلملایا تو دھیرے دھیرے سب کچھ صاف دکھائی دینے لگا۔

☆☆☆

”ارے یار وہ لڑکا کوئی عام لڑکا نہیں تھا شہزادہ تھا یا کوئی راج کمار، کسی سلطنت کا بادشاہ ہو جیسے یا پھر کسی فلم کا ہیرو، ارے ہاں یاد آیا وہ مووی ہے ناں ٹو ایلامیٹ اس کے ہیرو ایڈورڈ جیسا تھا وہ۔“ اس نے پھر سے اس کی قصیدہ گوئی شروع کی تو دعا نے باقاعدہ ہاتھ جوڑ دیئے۔

”خدا کے لئے حیا چھوڑ بھی دو اپنے اس

ایڈورڈ کا ٹائیک اور خیال جس کا تمہیں نام پتہ تک بھی معلوم نہیں، پچھلے تین گھنٹے سے ایک ہی شخص کی تعریف کر کر کے سرکھا چکی ہو تم میرا لیکن کیا فائدہ ہوا؟ اگر تمہیں اس کا کچھ نام پتہ معلوم ہوتا تو میں کچھ ہیلپ بھی کرتی تمہاری۔“ اس کی بات پر حیا کا سارا جوش جھاگ کی مانند بجھ گیا۔

”لیس یو آر رائٹ۔“ چند لمحے سوچنے کے بعد وہ پھر چبکی۔

”بٹ میڈم ہیلپ تو ابھی بھی کرنی پڑے گی تمہیں میری۔“ اس کی بات پر دعا نے استفہامیہ نظروں سے اسے گھورا تو حیا نے مصنوعی ہاتھیں کھلائیں اور بولی۔

”صبح سونیا کے ویسے کی تقریب ہے وہیں اس ایڈورڈ کا بائیوڈیٹا بھی ملے گا اور بذات خود ایڈورڈ بھی بس تمہیں کل میرے ساتھ چلنا ہے اور ماما سے پریشی لینے کی ذمہ داری بھی آپ کی۔“ سارا بوجھ دعا کے ناتواں کندھوں پر لا دکر وہ خود ہاتھ جوڑنے لگی۔

”ایکسیکوزی مس حیا سبحانی! یونوکل میرا ٹیسٹ ہے اور میں کہیں جانے والی نہیں۔“ ایک ہی جھٹکے میں وہ سارا نادیدہ بوجھ دھڑام سے زمین پر آگرا۔

”ارے کیسی سیلفش دوست ہو تم یار؟ دوستی کا نہ سہی ہماری رشتہ داری کا ہی لحاظ کر لو، مجھ پر کڑا وقت آن پڑا ہے تو تم اتنا سا کام بھی نہیں کر سکتی میرا؟“ حیا ایموٹنی بلیک میلنگ پر اترتے ہوئے اسے شرم دلانے لگی اور پھر ایک لمبی بحث و تکرار کے بعد وہ دونوں ویسے کی تقریب کی تیاریوں میں مصروف ہوئیں۔

حیا اور دعا نے صرف خالہ زاد کزنز بلکہ بہت اچھی دوست بھی تھیں، دعا بچپن سے ہی اپنی پڑھائی کے سلسلے میں اسلام آباد خالہ کے ہاں

ٹھہری ہوئی تھی اور اسی عرصے میں ان دونوں کی مثالی دوستی باقی ہر رشتے کو مات دے گئی تھی ہر جگہ ہر وقت اور ہر میدان و امتحان میں وہ دونوں ایک دوسرے کی جان تھیں، دعا نے خالہ جانی سے ویسے کی تقریب میں جانے کی اجازت طلب کی تو انہوں نے بخوشی انہیں ساتھ لے جانے پر آمادگی ظاہر کی وہ تو پہلے بھی یہی چاہتی تھیں، لیکن حیا اور دعا ہی ہر فنکشن یا پارٹی میں جانے سے انکار کر دیتیں تھیں، انہیں خاندان والوں سے مراسم بڑھانے کے بجائے سٹڈی کمپینیشن میں نمبر بڑھانے کی فکر زیادہ رہتی تھی مگر اس بار معاملہ کچھ اور ہی تھا۔

☆☆☆

”بس کر دے میری ماں، تیرا ایڈورڈ تو پتہ نہیں ملے گا یا نہیں لیکن میری چھٹی ضرور بن جائے گی ساڑھے چار انچ کی ہائی ہیل کے ساتھ اتنے بڑے ہال کے چکر لگا لگا کر ٹانگیں شل ہو چکی ہیں۔“ ٹیبل کے پاس رکھی چیز میں سے ریک پر وہ ہاتھ پیر چھوڑ کر ڈھکے چکی تھی۔

”تو تجھے کس پاگل نے کہا تھا اتنی ہائی ہیل پہننے کو؟ تجھے پتہ تھا ناں کہ یہاں اس کو ڈھونڈنے کے لئے آئے ہیں ہم؟“ ایک تو اس ایڈورڈ کے نہ ملنے کا قلق اوپر سے دعا کی ازلی سستی حیا کو جھلاہٹ نے گھیر لیا۔

”او میڈم اس رائجے بلکہ سوری اس ایڈورڈ کو ڈھونڈنے کے لئے“ ہم“ نہیں“ صرف تم“ آئی ہو میں تو بس اس کو دیکھ کر جج کروں گی کہ آیا وہ تمہارے لائق ہے بھی یا نہیں؟“ دعا کے صاف دامن بچا کر جھنڈی دکھانے پر حیا نے تلملاتے ہوئے اسے وراں کیا۔

”دیکھ لوں گی میں تجھے بے وفا لڑکی۔“
”اجی نی الحال تو آپ اپنے ایڈورڈ کو

دیکھئے، ہمیں دیکھنے کا شوق فارغ وقت میں پورا کر لیجئے گا پلیز۔“ دعا نے بڑے اطمینان کے ساتھ بیسی دکھائی تو حیا کا بارہ اور بھی ہائی ہونے لگا مگر اس وقت دعا کی خبر لینے سے زیادہ اہم کام اس لڑکے کی تلاش بھی پورے ہال میں نظریں گھماتے ہوئے وہ زیر لب بڑبڑاتی۔

”خیر اسے تو میں ڈھونڈ کے ہی رہوں گی چاہے کچھ بھی ہو جائے۔“ چند لمحوں کے توقف کے بعد وہ ایک بار پھر اس کی کھوج میں پورے ہال کا دورہ کرنے کے لئے جا چکی تھی جبکہ پیچھے دعا یہ سوچنے پر مجبور ہوئی کہ آخر ایسا کیا تھا اس لڑکے میں جو حیا سبحانی جیسی خوبصورت اور باوقار لڑکی اس سے دوبارہ ملنے کو اتنی بے تاب ہوئی جا رہی تھی، شادی چونکہ ان کے انھیال والوں میں بھی اس لئے دعا کی پوری فیملی نے بھی شرکت کی، ویسے کی تقریب اختتام پذیر ہو چکی تھی لیکن انہیں وہ لڑکا ملنا تھا نہ ملا، حیا کی بے چینی و اضطراب کے ساتھ ساتھ دعا کا شوق اور تجسس بھی دھڑکے کا دھڑکا رہ گیا۔

☆☆☆

اگلے چند ماہ میں دعا ایم ایس سی کے فائنل ایگزامز کے بعد فیصل آباد اپنی کیمپلی کے پاس لوٹ آئی، مگر ان دونوں کا ٹیلی فونک رابطہ ہر لمحہ اس طرح بحال رہا گویا میلوں کی دوری نے ان کے رشتے اور رابطے پر رتی برابر بھی اثر نہ کیا ہو، اسی دوران دعا کے لئے ماما اور خالہ جانی کے توسط سے ان کے انھیال والوں میں سے ایک لڑکا پسند کر لیا گیا تھا اور بات بھی یہی ہو گئی تھی لیکن باقاعدہ منگنی کی رسم دعا کے پاپا کی لندن سے واپسی پر ہی ہوئی تھی جبکہ حیا کو ابھی تک اپنے اس ایڈورڈ کی تلاش تھی، جس سے دوبارہ ملاقات کی امید اور خواہش ابھی تک ماند نہ پڑی تھی۔

”مائی ڈیر بیلا تم مان کیوں نہیں لیتی کہ اب وہ ایڈورڈ تمہیں نہیں مل سکتا، آخر چھ سات ماہ کافی ہوتے ہیں کسی کی تلاش و بیسار کے لئے، میری مانو تو بھول جاؤ اسے اور میری طرح تم بھی چپ چاپ کسی ”شریف“ لڑکے کے ساتھ منگنی کر والو۔“ ہر بار کی طرح دعا نے اس بار بھی اس سمجھانے اور چھیڑنے کی ذمہ داری نبھائی۔

”تمہاری طرح بنا دیکھے بنا جانے شادی کروانے کے لئے تیار ہو جاؤں سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، میں تو شادی اسی سے کروں گی جسے میں نے پسند کیا ہے اور اپنی پسند کو میں چھوڑنے والی نہیں ہوں۔“ حیا کا ہمیشہ کی طرح وہی پر عزم مگر ضدی لہجہ تھا، ہر دفعہ ان کے کانٹیکٹ پر اس کا ذکر اور پھر اپنے اپنے تبصرے اور نوک جھونک معمول کی بات تھی۔

”پسند نا پسند کو گولی مارو یار، مجھے تو اسی بات کی بے حد خوشی بھی ہے اور تسلی بھی کہ میں شادی کے بعد تمہارے شہر میں آ جاؤں گی تمہارے پاس۔“ دعا کی متوقع منگنی اسلام آباد میں ہی ہوئی تھی اور یہ بات اس کے لئے دلی خوشی کا باعث تھی۔

”ہاں میں تو جیسے تب تک یہیں بیٹھی رہوں گی ناں، تم شادی کروا کے اسلام آباد آ جاؤ گی تو کیا گارنٹی ہے کہ میں شادی کے بعد کسی اور جگہ نہیں جاؤں گی؟ کیا پتہ وہ ایڈورڈ کس ایریے میں رہتا ہے۔“ حیا نے پتے کی بات کہی تھی لیکن اس کا میسج پڑھ کر دعا یکدم اداس ہو گئی۔

”تو کیا ہم شادی کے بعد اس طرح نہیں رہیں گے۔“ اس نے مایوسی سے ٹائپ کر کے بھیجا۔

”رہ سکتے ہیں کیوں نہیں رہ سکتے میری

جان، اگر ایڈورڈ مل گیا تو ہم دونوں اسی کے ساتھ شادی کروالیں گی اور اگر وہ نہ ملا تو پھر تمہیں اپنے شوہر کا آدھا حصہ مجھے دینا پڑے گا، اس صورت میں ہمیں کوئی الگ نہیں کر سکے گا کبھی بھی۔“ حیا کا ریپلائی اور اینڈ پر ایک عدد کارٹون کی مزاحیہ پکچر موصول ہوئی تو دعا نے بے ساختہ قہقہے کے ساتھ اسے ہزاروں کو سننے سنا دیئے۔

☆☆☆

”دعا..... دعا..... دعا..... دعا۔“ کال پک کرتے ہی حیا کی چیخ سے مشابہہ آواز کان میں پڑی۔

”ارے کیا ہو گیا؟ کیوں میرے نام کا ورد کر رہی ہو پہلی بار لینا سیکھا ہے کیا؟“ دعا نے اس کی خوشی بھانپ لی تھی مگر اس کی ایک ہی تکرار پر مصنوعی غصے سے لتاڑا۔

”بات ہی کچھ ایسی ہے یار، میں خوشی سے پاگل ہو رہی ہوں تم سنو گی تو شا کڈ رہ جاؤ گی۔“ حیا چلائی۔

”بھئی ہوا کیا ہے؟“ دعا نے حیرت سے دریافت کیا۔

”مجھے میرا وہ ایڈورڈ مل گیا دعا میں نے تمہیں کہا تھا ناں کہ میں اسے ضرور ڈھونڈ نکالوں گی، میری دعائیں قبول ہو گئیں، میں جیت گئی دعا، میری محبت سچی اور کامل تھی اسی لئے اللہ نے مجھے وہ عطا کر دیا جو میں چاہتی تھی وہ مجھے مل گیا۔“ دعا اندازہ کر سکتی تھی کہ اس وقت حیا کی حالت کیا ہو رہی ہوگی، اس کے لہجے کا جوش اور انداز بتا رہا تھا کہ اس کا انگ انگ خوشی سے جھوم رہا ہوگا۔

”ان بی لیو انیل یار، کہاں ملا وہ تجھے اور کیسے؟“ دعا کے اندر بھی خوشی کی لہر پھوٹی تھی گویا۔

”پچھلے دنوں میں نے جو کمپیوٹر کلاسز شروع

کی ہیں ناں، اس نے بھی وہ کلاسز جوائن کی ہیں، آج پہلے دن آیا تھا وہ۔“ وہ دے دے پر جوش لہجے میں اسے پوری تفصیل سنانے لگی۔

”اچھا اب تو نام پتہ پوچھ لیا ناں تو نے اس کا؟ مبادا وہ پھر سے کم ہو جائے۔“ دعا نے شریر انداز میں اس چھیڑا۔

”اس کا نام جو بھی ہو میں تو اسے ایڈورڈ ہی بلاؤں گی اور رہی ایڈریس کی بات تو وہ بھی پوچھ لیں گے فی الحال تو اتنا ہی پتہ چل سکا ہے کہ وہ یہاں اسلام آباد میں ہی رہتا ہے۔“ ہنستے ہوئے اس نے اپنی بات مکمل کی تو دعا نے بے اختیار ہر ہراہ کا نعرہ لگایا۔

”کل ہی بھائی تمہیں لینے کے لئے پہنچ جائے گا اور ہاں آتے ہوئے اپنے ہونے والے مگیترا موصوف کی تصویر بلکہ تصاویر لانا ہرگز مت بھولنا، آخر ہم بھی تو انہیں دیکھ کر جج کریں گے کہ وہ محترم بھی ہماری پیاری دوست کے قابل ہیں یا نہیں۔“ نان شاپ بولتی ہوئی حیا نے اس کو کئی ہدایات دینے کے بعد خالہ جان سے بات کی اور ان سے دعا کے آنے کی بابت اجازت لے کر فون بند کر دیا۔

☆☆☆

”اذہان علوی، اذہان علوی نام ہے اس کا۔“ دعا نے وہاں پہنچنے کے کچھ ہی دیر بعد حیا کے اصرار پر اپنے متوقع مگیترا کی تصویر دکھاتے ہوئے نام بتایا تھا، اس کے تاثرات اور کیفیت وہ اس وقت تو سمجھ نہیں پائی تھی لیکن آج جب کہ وہ ریڈ کور والی منتقل ڈائری اس کے سامنے موجود تھی تو ہر حقیقت آشکار ہو گئی تھی، آنسوؤں کی لڑیاں اس کے رخساروں پر بہہ رہی تھیں اور ماضی کی کڑیاں ملتی جا رہی تھیں۔

کیسے طبیعت کی ناسازی کا بہانہ بنا کر اس

دن حیا نہ خود کالج گئی اور نہ دعا کو اس ایڈورڈ سے ملوایا، جو درحقیقت دعا کا ہونے والا مگیترا اذہان علوی ہی تھا اور پھر آہستہ آہستہ سچ سچ اس کی حالت بگڑتی چلی گئی تھی دعا پورا ہفتہ وہاں رہی مگر اس کی طبیعت بحال نہ ہو سکی یہاں تک کہ نعیم بخاری (دعا کے پاپا) لندن سے واپس آ گئے اور یوں اذہان علوی اور دعا بخاری کو ایک دو بجے کے نام کر دیا گیا اس روز کے بعد اس نے لاکھ بار حیا سے ایڈورڈ کو پوچھا مگر اس نے کہا کہ وہ کالج چھوڑ گیا ہے اور پھر چند دن بعد خود حیا نے بھی وہ کالج چھوڑ دیا۔

تب احساس کیوں نہیں ہو سکا مجھے؟ میں جو اس کی ہر بات بنا کہے بھی جان لیتی تھی اپنی ممکنہ کے روز اس کی نگاہوں کی حسرت اور چہرے کی اداسی و کرب کو اپنے پچھڑنے کا غم کیوں سمجھ بیٹھی تھی؟ اس نے آہستگی سے درد سے پھٹتے ہوئے سر کو صوفی کی پست پر مارا۔

”نہیں یہ میری دوست نہیں ہو سکتی، وہ میرے اذہان کو چاہتی رہی اسے حاصل کرنے کی کوشش کرتی رہی اور میں.....“ جذبہ رقابت عود کر آیا تو اسے ہر اس لمحے میں اپنی بے وقوفی اور نادانی نظر آنے لگی کہ جب جب اذہان اور حیا کا سامنا ہوا تھا، نجانے کیوں یکدم کمرے میں جھس اور ٹھٹھن کا احساس بڑھنے لگا تو اس نے لمبی لمبی سانسیں بھرتے ہوئے اپنے اندر کے غبار کو کم کرنا چاہا، اسی کوشش میں اس نے دوپٹہ اتار کر ایک طرف ڈال دیا اور خود پھر ڈائری کی طرف متوجہ ہوئی۔

”کل دعا کی مہندی کی رسم ہوگی اسی ایڈورڈ سوری اذہان علوی کے ساتھ جسے میں نے روح کی گہرائیوں سے چاہا تھا، جسے میں نے دعا کے لاکھ کہنے پر بھی نہیں بھلایا تھا، لیکن قسمت کا کھیل

ہے کہ آج اسی دعا بخاری کی خاطر میں اپنے ایڈورڈ کو بھولنا چاہ رہی ہوں۔“

اذہان علوی کبھی میرا تھا ہی نہیں، وہ صرف دعا کا تھا، ہے اور اسی کا رہے گا، میرا ایڈورڈ تو مجھ سے اسی روز پھٹ گیا تھا جب میں نے دعا کے منگیتر کو دیکھا تھا، یہ سچ ہے کہ میں نے اس سے بے پناہ عشق کیا ہے مگر میرا عشق پاکیزہ جذبہ تھا، جواب دعا کے حوالے سے اور بھی محترم ہو گیا ہے، میں اعتراف کرتی ہوں کہ حیا سبحانی ان دونوں سے ہار گئی ہے، مگر میں پھر بھی خوش ہوں اور بے حد مطمئن بھی، کیونکہ جیت میری دوستی کی ہوئی ہے اور میری محبت کی، وہ سکون اور طمانیت مجھے اذہان علوی کو دعا سے چھین کر کبھی نہیں مل سکتا تھا جو مجھے اس وقت میسر ہے، ان دونوں کی خوشی اور ان دونوں خاندانوں کی خوشی ہی دراصل میری خوشی بھی ہے اور خوش قسمتی بھی کہ اللہ نے مجھے اتنی بڑی آزمائش میں سرخرو کر دیا ہے۔

جیسے جیسے وہ ڈائری پڑھتی جا رہی تھی اندر کا غبار چھٹتا جا رہا تھا، اذہان کے ساتھ اس کی شادی اور ان دونوں کے ساتھ حیا کا نارمل اور دوستانہ رویہ اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ ان دونوں کے رشتے کو دل سے تسلیم کر چکی تھی اور یہ اس کے اس روپے کا ہی اثر تھا کہ شادی کے چھ ماہ بعد تک بھی دعا کو کبھی گمان بھی نہ گزرا تھا کہ اذہان ہی حیا کا ایڈورڈ تھا، اگر آج وہ حیا سے ملنے نہ آئی اور اس کی غیر موجودگی میں بوریت سے بچنے کی خاطر ریڈ کور کی وہ ڈائری نہ اٹھاتی، جو حیا شاید مارکیٹ جاتے ہوئے دراز میں رکھنا بھول گئی تھی تو وہ اس راز کو بھی نہ جان سکتی، خالہ جانی پچھلے کئی دنوں سے اسے کالز کر رہی تھیں کہ وہ شادی کے لئے حیا کو راضی کرے، مگر اسے وقت ہی نہ مل پارہا تھا، آج اذہان آفس جاتے ہوئے اسے ڈراپ کر گیا

تھا لیکن حیا گھر پر نہیں تھی اور اس کی انی غیر موجودگی نے اسے بہت بڑی حقیقت سے آشنا کیا تھا، اس نے آہستگی سے اپنے آنسو صاف کیے اور پاس پڑا دوپٹہ اٹھا کر شانوں پر درست کیا۔

اس نے ڈائری کو اٹھایا اور سینے سے لگا لیا جس کی ہر تحریر نے ان تمام غلط فہمیوں کو دور کر دیا تھا جو لاشعوری طور پر اس کو حیا سے ہو گئی تھیں، وہ اس کی ایسی دوست تھی جس نے سچ معنوں میں دوستی کا حق ادا کر دیا تھا، لیکن اب یہ حق دعا کو ادا کرنا تھا، ایک ذمہ داری وہ بھی جو خالہ جانی نے اس پر حیا کو شادی کے لئے رضا مند کرنے کی سوچا تھی، ایک ذمہ داری وہ تھی جو حیا نے بہت عرصہ قبل اس پر ڈالی تھی ایڈورڈ سے ملنے کے بعد اس کے ماما پاپا کو اس رشتے کے لئے راضی کرنے کی اور ایک ذمہ داری وہ تھی جو اب اس نے سچ جاننے کے بعد خود اپنے آپ پر عائد کی تھی جو ان سب کو منانے کے بعد حیا کی شادی ایڈورڈ سے کروا کر اسے اس کا پیار لوٹانے کی تھی۔

بنا مجبوری کے اپنے آپ پر سوتن مسلط کرنا بلاشبہ بہت جانکاہ اور تکلیف دہ مرحلہ ہوتا ہے اور بالیقین بہت سی عورتوں کی نظر میں حماقت کا بھی لیکن اگر حیا سبحانی اپنا ایڈورڈ دعا کو سونپ سکتی ہے تو دعا بخاری اپنا شوہر اس کے ساتھ شیر کر کے اس کا پیار واپس کیوں نہیں دلا سکتی؟

اس نے حیا کو ویننگ کا میج ٹائپ کر کے بھیجا اور خود مسکراتے ہوئے اس کے پر جوش استقبال کی تیاری کے لئے چل دی، وہ جانتی تھی کہ سب کو اس رشتے کے لئے کیسے راضی کرنا ہے بدگمانی اور رقابت کے بادل گرج برس کر رخصت ہو چکے تھے اور چہار سو زندگی مسکرانے لگی تھی، جہاں روشن مستقبل ان کا منتظر تھا۔

شرک کا عذاب

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔
”جس شخص کو دوزخ میں سب سے بڑا عذاب ہو گا اللہ تعالیٰ اس سے پوچھے گا، اگر تیرے پاس اس وقت زمین بھر کا مال ہو تو اس کو دے کر تو اپنے آپ کو چھڑانا چاہے گا۔“
وہ کہے گا۔
”یقیناً۔“

اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔

”میں نے تو اس سے بہت ہی آسان بات تجھ سے چاہی تھی، جب تو آدم کی پشت میں تھا یعنی میرے ساتھ کسی کو شریک نہ بنانا تو نے نہ مانا اور شرک ہی پر اڑا رہا۔“ (بخاری شریف)
سارا حیدر، ساہیوال

تلاش

ایک مرتبہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا۔

”میں نے چھ چیزوں کو چھ چیزوں پر چھپا رکھا ہے، لیکن لوگ انہیں غیر محل تلاش کرتے ہیں، اس لئے نہیں پاتے۔“

☆ عزت کو میں نے شب بے داری میں رکھا ہے، مگر لوگ سلاطین کے دربار میں تلاش کرتے ہیں۔

☆ راحت کو میں نے جنت میں چھپا رکھا ہے، لوگ اسے دنیا میں تلاش کرتے ہیں۔

☆ بلندی کو میں نے تواضع اور انکساری میں چھپا رکھا ہے، مگر لوگ اسے غرور میں تلاش کرتے

ہیں۔

☆ دعا کی قبولیت کو میں نے لقمہ حلال میں چھپا رکھا ہے، لوگ اسے لقمہ حرام میں تلاش کرتے ہیں۔

☆ تو نگری کو میں نے قناعت میں چھپا رکھا ہے، مگر لوگ اسے حرص میں تلاش کرتے ہیں۔

☆ علم کو میں نے سفر و بھوک میں رکھا ہے، مگر لوگ اسے شکم سیری اور کتابوں میں تلاش کرتے ہیں۔

ساجدہ احمد، ملتان

فطرت

ایک دفعہ ایک بزرگ کسی حوض کے کنارے بیٹھے ہوئے تھے، ایک بچہ بار بار حوض کی طرف جاتا تھا اور وہ بزرگ بار بار اس کا رخ بدل دیتے تھے، ان کے پاس بیٹھے ہوئے ایک مرید نے جب بار بار یہ ہی نظارہ دیکھا تو عرض کیا۔

”اے مرشد صاحب! آپ اس کو اس کے حال پر کیوں نہیں چھوڑ دیتے، یہ بار بار آپ کو ڈستا ہے اور آپ بار بار اس کے حق میں جھکی کرتے ہیں۔“

بزرگ نے فرمایا۔

”جب یہ کیڑا ہو کر اپنی فطرت سے باز نہیں آتا تو میں انسان ہو کر اپنی فطرت سے کیوں باز آؤں؟“

صفہ خورشید، لاہور

محبت

خلیل جبران کہتا ہے۔

”کہ تم نے یہ بات کہاں سے سنی؟“ اس نے عرض کی۔

”جہاں پناہ! میری عمر اس خانوادہ کے قدموں میں گزری ہے، غلام ادا شناس ہے، ایک صبح حضور کو وضو کروا رہا تھا کہ آپ نے ایک لمحہ توقف فرمایا، دکن کی جانب نگاہ ڈالی اور دست مبارک مونچھوں پر پھیرا، میں سمجھ گیا کہ دکن پر حملہ کرنے کا ارادہ ہے۔“

آصفہ نعیم، نورث عباس

دسمبر

دسمبر کی سرد ہواؤں کو
کون بتائے کہ اندر سلگتی ہوئی آگ کو
اس کی برف ہوتی شامیں ٹھنڈا نہیں کر سکتیں
ان کبر آلود راتوں کو کیا پتا کہ
دل کی چوکھٹ سیاہ ہو جانے کے بعد
پھر وہاں سورج نہیں نکلتا

فرینہ اسلم، میاں چنوں

باتوں سے خوشبو آئے

☆ بیٹیاں اور مردہ مچھلیاں اسٹور روم میں غیر
معینہ مدت تک رکھنے کی چیزیں نہیں۔ (انگریزی
مقولہ)

☆ جو بیٹیوں کا باپ ہے، وہ اک خاندان کا
مالک ہے اور جس کے بیٹے ہیں اس کے لئے
اجنبیوں کا مجمع انتظار کر رہا ہے۔ (چیکو سلواکیہ کی
کہاوت)

☆ جس کی بیٹی کی شادی کسی اچھے آدمی سے
ہوتی ہے تو اسے بیٹا مل جاتا ہے، ورنہ وہ بیٹی کو بھی
کھودیتا ہے۔ (کوالٹر)

☆ بیٹا اس وقت تک بیٹا رہتا ہے جب تک اس
کی شادی نہ ہو، لیکن بیٹی تمام عمر کے لئے بیٹی
ہوتی ہے۔ (فلر)

☆ بیٹی کی شادی میں سب سے دکھی ہنسی باپ کی

آسمانوں سے ہماری محبت ہمارے دل پر
اترتی ہے اور سب کچھ بدل کر رکھ دیتی ہے،
ہمارے لئے ہر منظر، ہر موسم اور کیفیت کے معنی
بدل دیتی ہے، ایک نیا احساس جگاتی ہے، پھول
سے خوش رنگ، مشک اپنی خوشبو سے کچھ اور سوا،
سبزہ اور بھی ترواہٹ بخش ہو جاتا ہے، ساون
رت کی ٹھنڈی پون اور جھومتی گھٹا، جذبات میں
آگ لگا دیتی ہے اور پھر بارش بالکل پاگل کر
دیتی ہے، خوش گمانی کی حسین پریاں، ہمیں اپنی
نرم گداز بانہوں میں سمیٹ لیتی ہیں اور کبھی ایک
نظر عمر بھر کے لئے زندگی بن جائے، لیکن اس
کے باوجود اسی کا نام محبت ہے، جہاں سے
کائنات شروع ہوتی ہے۔

محبت ایک طلسم کدہ ہے جس میں اگر انسان
پھنس جائے تو پھر ساری زندگی رہائی کے لئے
تڑپتا رہے اور شہر دل کے موسم بھی عجیب ہوتے
ہیں، کبھی تو برسوں نہیں بدلتے اور کبھی لمحوں میں
دل کی دنیا بدل دیتے ہیں، محبت ایسی ہی ہوتی
ہے امبر کی طرح دل پر چھا جاتی ہے۔

عابدہ حیدر، بہاول نگر

ادا شناس

اورنگ زیب عالمگیر کے زمانے میں ایک
دفعہ مشہور ہو گیا کہ آپ دکن پر حملہ کرنے والے
ہیں، اگرچہ آپ اس معاملہ کا ارادہ کر چکے تھے،
مگر ابھی تک کسی سے اظہار نہیں کیا تھا، حتیٰ کہ
معتد خاص سے بھی اس کا ذکر نہیں کیا تھا، مگر
لوگوں میں اس کی شہرت عام ہو چکی تھی۔

سلطان عالمگیر حیران تھے کہ لوگوں میں یہ
خبر کیسے پہنچ گئی، محکمہ خاص کو حکم دیا گیا کہ سراغ
لگائیں کہ اس کی ابتدا کہاں سے ہوئی، کھوج لگتے
لگتے پتا چلا کہ سب سے پہلے ملازم خاص کی زبان
سے یہ بات سنی گئی، اس کو بلا کر پوچھا گیا۔

ہوتی ہے۔ (ہومر)

☆ تانرمان بیٹی ناقابل اصلاح بیوی ہوتی ہے۔
(فرینک لن)

مہین آفریدی، ایبٹ آباد

تین اشعار

کاش آزاد قبیلے کے سخن ور ہوتے
ہم محاذوں پہ نہ جکتے تو سکندر ہوتے
خود فریبی کے خرابوں میں رہے ہم ورنہ
اپنی اوقات میں رہتے تو قلندر ہوتے
موج کوثر کی قسم ہم تجھے محبت کے ولی
خاک کے در پر نہ جھکتے تو سمندر ہوتے
راحیلہ فیصل، سرگودھا

موتی کی قیمت

ایک بدنام زمانہ شخص علم و دانش کی باتیں کر
رہا تھا، لوگوں نے اس کا مذاق اڑایا اور بولے۔
”بھلا اس کی باتیں کہوں کوئی سنے، یہ تو
ایک نہایت برا اور بدتماش شخص ہے۔“ وہیں
سقراط بھی موجود تھا، اس نے کہا۔

”لوگو! یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ یہ شخص جو قیمتی
باتیں کر رہا ہے، اسے غور سے سنو اور ذہن نشین
کر لو، کیونکہ اس شخص کی حیثیت غوطہ خور جیسی ہے،
غوطہ خور کے ذلیل ہونے سے موتی کی قیمت پر
کوئی اثر نہیں ہوتا۔“

آمنہ خان، راولپنڈی

خاص عنایتیں

اللہ نے اپنے بندوں پر تین خاص عنایات
کیں۔

☆ گندم اور اناج میں کیڑے پیدا کر دیے،
ورنہ لوگ اسے سونے، چاندی کی طرح ذخیرہ کر
لیتے اور لوگ بھوکے مر جاتے۔

☆ موت کے بعد مردے کے جسم میں بدبو پیدا
کر دی، ورنہ کوئی اپنے پیاروں کو دفن نہ کرتا۔

☆ مصیبت کے بعد اہل خانہ کو صبر و سکون دیا،
ورنہ ان کی زندگی کبھی خوش گوار نہ ہوتی۔
تو تم اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمت کو
جھٹلاؤ گے؟

صابرہ سلطانہ، کراچی

باتوں سے خوشبو آئے

☆ دکھ انسان کے مرنے کا نہیں ہوتا، بلکہ
اپنائیت، محبت اور خلوص کے رشتوں کے ٹوٹ
جانے کا ہوتا ہے۔

☆ کوئی گناہ لذت کے لئے مت کرنا، کیونکہ
لذت ختم ہو جائے گی، گناہ باقی رہ جائے گا اور
کوئی نیکی تکلیف کی وجہ سے مت چھوڑنا کیونکہ
تکلیف ختم ہو جائے گی، نیکی باقی رہ جائے گی۔

☆ دوستی، بھروسہ، دل، رشتہ، وعدہ، پیار، کبھی
مت توڑنا، کیونکہ جب یہ ٹوٹ جاتے ہیں تو آواز
نہیں آتی، لیکن درد بہت ہوتا ہے۔

☆ شرم کی کشش حسن سے زیادہ ہوتی ہے۔

☆ اپنے خیالات کو اپنا جیل خانہ نہ بناؤ۔

☆ تاریخ کو یاد رکھنے کی بجائے، تاریخ بنانے
کی فکر کرنا چاہیے۔

☆ ناامید شخص ہر اچھا موقع گنوا دیتا ہے اور پر
امید شخص پریشانی میں بھی موقع تلاش کر لیتا ہے۔

☆ بے بسی اتنا اداس نہیں کرتی، جتنا بے بسی کا
احساس اداسی کر دیتا ہے۔

حنشاہین، حیدر آباد

بوڑھا سال

یاد ہے میں کیا تھا پر اب جانے کیا ہو گیا
آئینے میں شکل دیکھے اک زمانہ ہو گیا
ختم ہوئی ڈائری گرتے ہوئے تپے ریاض
آ گیا ماہ دسمبر سال بوڑھا ہو گیا
سدرہ خانم، ملتان

☆☆☆

آمنہ خان: کی ڈائری سے ابن انشاء کی نظم
چل انشا اپنے گاؤں میں
یہاں الجھے الجھے روپ بہت
پر اصلی کم بہر روپ بہت
اس پیڑ کے نیچے کیا رکنا
جہاں سائے کم دھوپ بہت
چل انشاء اپنے گاؤں میں!
بینھیں گے سکھ کی چھاؤں میں
کیوں تیری آنکھ سواہی ہے
یہاں ہر اک بات نرالی ہے
اس دلیں بسیر امت کرنا
یہاں مفلس ہونا گالی ہے
چل انشا اپنے گاؤں میں
جہاں سچے رشتے یادوں کے
جہاں وعدے کے پیاروں کے
جہاں سجدہ کرے وفا پاؤں میں
چل انشا اپنے گاؤں میں

صابرہ سلطانہ: کی ڈائری سے ایک غزل
یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا
ترے وعدے پہ جیسے ہم تو یہ جان چھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا
کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیریم کش کو
خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے یار ہوتا
غم اگر چہ جاں نسل ہے یہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غم عشق اگر نہ ہوتا غم روزگار ہوتا
کہوں کس سے میں کہ کیا ہے شب غم بری بلا ہے
مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا
اسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا

جو دونی کی بو ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا
یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا
حناشاہین: کی ڈائری سے ایک خوبصورت نظم
”اسے کہنا“

اسے کہنا دسمبر آ گیا ہے
دسمبر کے گزرتے ہی برس اک اور ماضی کے
گپھا..... میں ڈوب جائے گا
مگر جو خون..... سو جائے گا جسموں میں نہ جاگے
گا

اسے کہنا ہوائیں سرد ہیں اور زندگی کے
کھرے دیواروں میں لرزاں ہیں
اسے کہنا شگوفے نہیںوں میں سو گئے ہیں
اور ان پر برف کی چادر چھپی ہوئی ہے
اسے کہنا اگر سورج نہ نکلے گا
تو برف کیسے پگھلے گی
اسے کہنا کہ لوٹ آئے

سدرہ خانم: کی ڈائری سے ایک غزل
دل میں نہ ہو جرأت تو محبت نہیں ملتی
خیرات میں اتنی بڑی دولت نہیں ملتی
کچھ لوگ یوں ہی شہر میں ہم سے بھی خفا ہیں
ہر ایک سے اپنی بھی طبیعت نہیں ملتی
دیکھا تھا جسے میں نے کوئی اور تھا شاید
وہ کون ہے جس سے تری صورت نہیں ملتی
ہنستے ہوئے چہروں سے ہے بازار کی زینت
رونے کی یہاں دے بھی فرصت نہیں ملتی
لگا کر وہ یہ شمع لئے گھر سے بھی باہر
تنہائی سجانے کو مصیبت نہیں ملتی
آسیہ فرید: کی ڈائری سے ایک غزل

تیرے سینے میں دل اپنا سجا کر کیا کریں گے ہم
 تمہیں اپنا بنا کر مسکرا کر کیا کریں گے ہم
 کسی ویران بستی میں اگر تنہا ہمیں چھوڑا
 دشمن پھر محبت کا بنا کر کیا کریں گے ہم
 جگر میں درد باقی ہے کبھی جب چوٹ کھائی تھی
 نئے دکھ اور نئے صدمے اٹھا کر کیا کریں گے ہم
 ہمارے درد پر ہمدرد یاروں کو ہونی خوشیاں
 کسی کے درد پر خوشیاں منا کر کیا کریں گے ہم
 ہر اک شب اشک بہتے ہیں مگر سنوری نہیں قسمت
 تمہاری یاد میں آنسو بہا کر کیا کریں گے ہم
 بڑا بے کار ہے جیون ہوا نہ پیار کے قابل
 تمہارے واسطے جیون لٹا کر کیا کریں گے ہم
 ہر اک چہرہ کسی کے حال کی تصویر ہوتا ہے
 برے حالات کے قصے سنا کر کیا کریں گے ہم
 میرے ہدم بڑی ہی سنگدل دنیا ہے کچھ سوچو
 تمہیں بننے کی عادت ہے رلا کر کیا کریں گے ہم
 مریم انصاری: کی ڈائری سے خوبصورت غزل
 راہ عشق میں سفینوں کو جلایا نہیں کرتے
 یوں ہی انمول خزینوں کو لٹایا نہیں کرتے
 سجدہ ہے اس مسجود و معبود کے لائق
 ہر اک کے آگے جبینوں کو جھکایا نہیں کرتے
 جانے کس روپ میں رب مل جائے
 در پہ آئے گداؤں کو ٹھکرایا نہیں کرتے
 پردہ داروں میں لازم ہے پردہ داری
 سر بستہ راز سر محفل لایا نہیں کرتے
 لگی رہتی ہے در پہ جانے کیوں آنکھیں
 جانے والے بھی لوٹ کے آیا نہیں کرتے
 گرد سی جم گئی ہے ہر اک سحر پر
 کسی کے صبر کو یوں آزمایا نہیں کرتے
 سنگدل محبوب کہتے پھرتے ہیں گلی گلی
 ٹوٹی ہوئی کرچیاں دیواروں پہ سجایا نہیں کرتے
 عذہ فیصل: کی ڈائری سے خوبصورت نظم
 ”ہاں ابھی نہیں“

جذباتے زنجیر نہیں ہوتے، سائے تو اسیر نہیں ہوتے

جو منظر ہے، پس منظر ہے، وہ کیوں تصویر نہیں
 ہوتے
 جتنے بھی خیال گزار لیں وہ کیوں تحریر نہیں ہوتے
 اب خواب سراب سے لگتے ہیں
 دن رات عذاب سے لگتے ہیں
 کہیں جلتے بجھتے سائے سے
 کہیں ان دیکھے ہمسائے سے
 آنگن بازار میں گلیوں میں سب موت کا کھیل اٹھا
 لائے
 کوئی کسی کی فرد جرم لکھے، کوئی کسی کی جیل اٹھا
 لائے

اک خوف بچھا ہے رستوں میں
 بارود چھپا ہے بستوں میں
 اب زہر ہے رات کی رالی میں
 کہیں آگ لگی ہے پانی میں
 تم کہتے ہو تمہیں آن ملے
 تمہیں کیسے آن ملے آخر
 جو کچھ تھا بے ترتیب ہوا
 اس گھر کا حال عجیب ہوا
 نور انور: کی ڈائری سے ایک خوبصورت نظم
 ”کیا اچھا کیا برا“

ٹھہرو!

کچھ مل بھلا کر ان پرانی باتوں کو
 جو دوری کا سبب تھیں
 دسمبر کی دھوپ میں بیٹھ کر
 مل جل کے باتیں خوب کریں
 کیا اچھا کیا برا
 جنوری کی دہلیز پر
 کچھ رنگ زیست کے بکھیریں
 فروری میں ان رنگوں کو یکجا ہم کریں
 مارچ اپریل میں پر کیف ہواؤں اور بہاروں سے
 صبح و شام ہم کریں
 مئی جون کی جھلکتی اور لودیتی گرمی کو
 امن و سلامتی کے پنکھوں سے کچھ سرد ہم کریں

ساجدہ احمد: کی ڈائری سے ایک نظم
تنہائی ہو، بادل ہو، برسات ہو
اور تم آؤ

بکھی یوں بھی تو ہو
دریا کا ساحل ہو
پورے چاند کی رات ہو
اور تم ہو

بکھی یوں بھی تو ہو
کوئی نہ میرے ساتھ ہو، اور تم آؤ
بکھی یوں بھی تو ہو

بادل ایسا ٹوٹ کر برے
میرے دل کی طرح ملنے کو
تمہارا دل بھی ترے اور تم آؤ
بکھی یوں بھی تو ہو

بادل ہو، برسات ہو اور تم آؤ
بکھی یوں بھی تو ہو

آج شہر میں پاگل دل کو
تیری دید کی آس رہی
موت کی گم صم تنہائی

آج بھی میرے پاس رہی
آج بھی شام اداس رہی

صفہ خورشید: کی ڈائری سے ایک نظم
کوئی شعر کہوں

یاد نیا کے کسی موضوع پر
میں کوئی نیا مضمون لکھوں

یا کوئی انوکھی بات سنوں
کوئی بات جو سننے والی ہو

کوئی فقرہ جو دلچسپ لگے
یا کوئی خیال

اچھوتا سا
یا کہیں ملے کوئی فقرہ

جو حیران کر دے
کوئی لمحہ جو دل کو چھو جائے

میں اپنے ذہن کے گوشوں میں

☆☆☆

کیا اچھا کیا برا
اس بات کو بھول کر
جوانی اگست میں محبت کے گیت الاپ کر
ساون کی بھگی رتوں کا
مسرور و مکن ہو کر استقبال ہم کریں
ستمبر اکتوبر کی خوش کن شاموں کو
اک دو بجے کے سنگ خوشنا ہم کریں
اف ہائے اوریسی میں خوش گزراں ہم کریں
فوز! کیا اچھا کیا برا؟ چھوڑوان رگی باتوں کو
آؤ اپنی چاہت کا اقرار ہم کریں
آؤ اپنی چاہت کا اقرار جم جم کے ہم کریں
ہیں سہانے پل دسمبر کے بیت نہ جائیں
فار یہ سلیم: کی ڈائری سے ایک نظم
"آسمان کا فیصلہ"

باتھوں پہ
کتابوں پہ

درختوں پہ
کسی کا نام لکھنے سے

کوئی اپنا نہیں ہوتا
نام سے نام جوڑنا

اتنا آسان نہیں ہوتا
آسمان کا فیصلہ ہے یہ

زمین پر نہیں ہوتا

سارا حیدر: کی ڈائری سے ایک غزل
اب کس سے کہیں اور کون نے جو حال تمہارے بعد ہوا

اس دل کی پھیل سی آنکھوں میں اک خواب بہت برہان ہوا
یہ ہجر ہوا بھی دشمن ہے اس نام ک سارے رنگوں کی

وہ نام جو میرے ہونٹوں پر خوشبو کی طرح آباد ہوا
اس شہر کے کتنے چہرے تھے کچھ یاد نہیں سب بھول گئے

اک شخص کتابوں جیسا تھا وہ شخص زبانی یاد ہوا
وہ اپنے گاؤں کی گلیاں تھیں دل جن میں ناچتا گاتا تھا

اب اس سے فرق نہیں پڑنا ناشاد ہوا یا شاد ہوا
بے نام ستائش رہتی تھی ان گہری سانولی آنکھوں میں

ایسا تو بھی سوچا بھی نہ تھا دل اب جتنا بے داد ہوا

ساہیوال

سارا حیدر

س: غ غ جی کیا کر رہے ہیں؟

ج: تم کیا کر رہی ہو۔

س: لو یہ کیا بات ہوئی الٹا ہم سے سوال؟

ج: چلو بتا ہی دیتے ہیں کیا یاد کرو گی۔

س: اب بتا بھی دیں؟

ج: مجھے بے صبرے لوگ پسند نہیں ہیں صبر سے کام لو۔

س: آپ عید الاضحیٰ پر کیا پسند کرتے ہیں؟

ج: سب کچھ پسند ہے آپ مرضی جو بھیج دیں۔

س: ہم تو حلوہ پوریاں بنائیں گے کیسے سمجھوں مشکل ہو جائے گی۔

ج: ویسے ہی تمہاری نیت نہیں ہے بہانے نہ بناؤ۔

س: ارے نہیں ایسی کوئی بات نہیں؟

ج: میں خود آ جاؤں کھا بھی لوں گا اور مل بھی لوں گا۔

ملتان

ساجدہ احمد

س: ہوں دیکھیں غ غ جی آپ تو حد سے بڑھ گئے، آپ کو انگلی پکڑائی آپ ہاتھ پکڑنے لگے۔

ج: توبہ توبہ ہوش کے ناخن لو میں بھلا تمہارا ہاتھ کیوں پکڑنے لگا میرے لئے کوئی کمی ہے۔

س: دل میں بسنے والوں سے ماہانہ کرایہ وصول کرنا ہو تو کیا کرنا چاہیے؟

ج: اسے دل کے ساتھ اپنی آنکھوں میں بھی بسا لیں۔

س: آپ کو پتہ ہے کہ آپ کے اگلے پلٹے

جوابات پڑھ کر اب حنا کے قارئین کیا

سوچنے پر مجبور ہو گئے ہیں؟

ج: کیا غضب کے جواب دیتا ہے یہ بندہ۔

س: چلیں آج جلدی سے اپنی فیورٹ ڈش اور

مشروب کا ٹائم بتا دیں؟

ج: پی جی ایام کی محی کوئٹس کے ناصر۔

س: آپس کی بات ہے، آپ وہی عین غین ہیں

ناں جو تین سال پہلے.....؟

ج: ہاں ہاں وہی ہوں جس نے تمہیں قرض

خواہوں سے بھایا تھا۔

س: میرا دل آج کل بے حد اداس ہے، اگر

میرے سوالوں کے سیدھے منہ جواب نہ

دیئے تو میں.....؟ آگے آپ خود سمجھدار

ہیں؟

ج: پہلے یہ بتاؤ دل اداس کیوں ہے اور وہ بھی

آج کل۔

لاہور

صفہ خورشید

س: وقت طوفان کب اٹھاتا ہے؟

ج: جب تم کسی گرلز کالج کے باہر کھڑے ہو اور

”گرل“ کا بھائی آ جائے۔

س: کیا وقت کے ساتھ چلنا ضروری ہے؟

ج: بہت ضروری ہے ورنہ۔

س: سکون کی تلاش؟

ج: اپنے اندر تلاش کرو۔

س: کیا دنیا میں صرف غم ہی غم ہیں؟

ج: کون کہتا ہے۔

س: زندگی میں سکون کب ملتا ہے؟

ج: جب بیوی میکے ہو۔

س: آپ اتنی زیادہ ذہین کیوں ہیں؟

ج: یہی بات کل امان اللہ سے بھی کہہ رہے تھے۔

عابدہ حیدر ----- بہاول نگر

س: اب کیا ہوگا؟

ج: وہی جو ہم چاہتے ہیں۔

س: جدائی کی رات بہت طویل اور کرناک

کیوں ہوتی ہے؟

ج: اکیلے میں ڈر جو لگتا ہے۔

س: وفا کی راہ میں آج میں اکیلی ہوں؟

ج: نہیں سی لانی بے قدراں نال یاری۔

س: کیا گئے ہوئے لمحات واپس آسکتے ہیں؟

ج: گیا وقت پھر کب ہاتھ آتا ہے۔

س: کبھی کبھی دل چاہتا ہے کہ ہمارے آس پاس

کوئی نہ ہو؟

ج: تاکہ گزری ہوئی باتوں پر کبھی خوش کبھی

رنجیدہ ہو سکیں۔

س: کچھ لوگ روٹھ کر بھی لگتے ہیں کتنے پیارے؟

ج: دل آنے کے ڈھنگ ہیں۔

آصفہ نعیم ----- فورٹ عباس

س: آپ کو پھول اچھے لگتے ہیں یا کلیاں؟

ج: کلیاں کیوں کہ انہیں ابھی کھلنا ہوتا ہے۔

س: آپ کو بھینس کے آگے بین بجانا کیسا لگتا

ہے؟

ج: مجھے تو چین کی صرف بنسری بجانی آتی ہے۔

س: سبھی ہوئی حسینوں اور ابھی ہوئی حسینوں

میں کیا فرق ہے؟

ج: جو ایک سمجھدار انسان اور ایک نا سمجھ انسان

میں ہے۔

س: انسان جیتے جی کب مرتا ہے؟

ج: جب اس کی عقل کام نہ کرے۔

س: عورت زندگی میں سب سے زیادہ کس بات

کی تمنا کرتی ہے؟

ج: نئے ماڈل کی کار، وسیع و عریض بنگلہ اور

دولت مند شوہر۔

س: اگر میں تمہاری بند آنکھوں پر دونوں ہاتھ رکھ

کر پوچھوں کہ بوجھ تو؟

ج: بوجھ لیں گے۔

فرینہ اسلم ----- میاں چنوں

س: ہم تمہیں ڈھونڈ رہے ہیں کئی دنوں سے؟

ج: اندھے کوندھیرے میں بڑی دور کی سو جھمی۔

س: ایک ڈال پر طوطا بیٹھا، ایک ڈال پر مینا غ

جی کیا کہنا؟

ج: دونوں کو صحیح جگہوں پر رہنا چاہیے۔

س: اگر خواب صرف خواب ہی رہیں تو؟

ج: خواب تو خواب ہی ہوتے ہیں۔

س: کنوارے شادی کرنا چاہتے ہیں اور شادی

شدہ اپنی جان کو روٹتے ہیں؟

ج: شادی بور کے لڈو ہیں جس نے کھائے وہ

بھی پچھتائے جس نے نہیں کھائے وہ بھی

پچھتائے۔

س: عورت اپنی عمر اور مرد اپنی آمدنی کیوں

چھپاتے ہیں؟

ج: یہی چیز تو فساد کی جڑ ہے۔

س: لوگ کہتے ہیں عشق خلل ہے دماغ کا؟

ج: تبھی تو عاشقوں کی تعداد میں روز بروز

اضافہ ہو رہا ہے۔

مہین آفریدی ----- ایبٹ آباد

س: یہ زندگی تیرے بغیر کیسے کٹے گی؟

ج: جیسے اب تک کٹی ہے۔

☆☆☆

انداز بیاں اور.....

پچھلے دنوں ”ہیلٹ“ کی طرح ”پلاسٹک کے لفافوں“ کے سلسلے میں بھی شورا اٹھا تھا، لوگوں کا خیال تھا کہ آلودگی کے ذمہ دار یہ پلاسٹک کے لفافے ہیں جو شاید حکومتی اقدامات کے بعد اب کبھی دکھائی نہ دیں، اس انڈسٹری سے وابستہ لوگوں نے تو متبادل کاروبار کی تلاش بھی شروع کر دی تھی، ”ہفتہ صفائی“ بھی منایا جائے گا۔

مگر پھر کیا ہوا، پلاسٹک کے لفافے بنتے گئے، بنتے رہیں گے، بلکہ اب تو کسی پلاسٹک کے برتن میں سالن ڈال کر کھاتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے کہ ہو سکتا ہے جو پلاسٹک اس جہنم میں سالن ڈالنے والے برتن کی صورت میں سامنے ہے، پہلے جہنم میں کہیں چپل کی شکل میں نہ رہ چکا ہو۔

آسیہ فرید، خانوال

بے چارگی

”تمہاری یہ جرات کہ تم میرے ڈیڈی کو فضول اور بے ہودہ انسان کہہ رہے ہو؟“ لڑکی نے اپنے بوائے فرینڈ پر براہم ہوتے ہوئے کہا۔
”میں ان سے تمہارا رشتہ مانگنے گیا، میں نے کہہ دیا کہ میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا، اس پر وہ بولے کہ کوئی بات نہیں، تدفین کا خرچ میں اٹھالوں گا۔“

مریم انصاری، سکھر

نقصان

ہوٹل میں جنید صاحب کو ان کے دوست فیاض صاحب نے اداس، غم زدہ اور منہ لٹکائے

بیٹھے دیکھا تو ہمدردانہ انداز میں سبب پوچھا، جنید صاحب بولے۔

”دو ماہ پہلے میرے ایک خالو کا انتقال ہوا، ان کی کوئی اولاد نہیں تھی، انہوں نے تر کے میں میرے لئے چھ لاکھ روپے چھوڑے۔“

”تو اس میں اداس ہونے کی کیا بات ہے؟ آپ کو تو خوش ہونا چاہیے۔“ فیاض صاحب نے کہا۔

”پچھلے ماہ میرے ایک چچا مر گئے تھے، انہوں نے میرے لئے دس لاکھ روپے چھوڑے۔“ جنید صاحب نے گویا ان سنی کرتے ہوئے بتایا۔

”تو پھر آخر آپ منہ لٹکائے کیوں بیٹھے ہیں؟“ فیاض صاحب نے حیرت سے ایک بار پھر پوچھا۔

”بھئی..... یہ پورا مہینہ ختم ہونے کو آ رہا ہے، ابھی تک کہیں سے مزید کوئی خبر نہیں آئی۔“ جنید صاحب نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

عزہ فیصل، قصور

صحیح طریقہ

ایک صاحب اپنی گاڑی کے پاس بیٹھے آرام سے سگریٹ پی رہے تھے جبکہ ان کی بیگم پسینے میں شرابور گاڑی کی سروس میں مصروف تھیں، اتنے میں ان کا ایک دوست ادھر آیا اور اس نے جب یہ منظر دیکھا تو ان صاحب کو مبارک باد دیتے ہوئے کہا۔

”تم یہ کام کس طرح اپنی بیوی سے کرانے

میں کامیاب ہوئے ہو؟“

ان صاحب نے لاپرواہی سے منہ سے دھوئیں کا مرغولہ چھوڑتے ہوئے جواب دیا۔

”معمولی سی بات ہے، ایک دن میں نے بیگم سے کہا کہ جب میں گاڑی کی سروس کرتا ہوں تو میرا وزن ایک پونڈ کم ہو جاتا ہے، بس اسی دن سے بیگم نے یہ کام اپنے ذمے لے رکھا ہے۔“

نور انور، فیصل آباد

کم ظرفی

مشہور افسانہ نگار راجندر سنگھ بیدی ریل میں سفر کر رہے تھے، دوران سفر ٹکٹ چیکر نے ان سے ٹکٹ مانگا تو بیدی صاحب نے اپنی جیبیں ٹٹولیں، مگر ٹکٹ کا پتا نہ تھا۔

ٹکٹ چیکر بیدی صاحب کو پہچانتا تھا، کہنے لگا۔

”مجھے آپ پر بھروسہ ہے، آپ نے یقیناً خریدا ہوگا۔“

بیدی صاحب پریشانی سے بولے۔
”بھائی! بات آپ کے بھروسے کی نہیں، مسئلہ تو سفر کا ہے، اگر ٹکٹ نہ ملا تو یہ کس طرح معلوم ہوگا کہ مجھے کہاں اترنا ہے۔“

فارہ سلیم، شرقپور

مشورہ

دلہن رخصت ہو رہی تھی، خواتین آنسو بہا رہی تھیں، تیز آواز میں ریکارڈنگ رہا تھا۔

”چھوڑا بابل کا گھر، موہے پی کے نگر، آج جانا پڑا۔“ مہمانوں میں ایک لڑکی ایسی بھی تھی، جو رونے کی بجائے کونے میں کھڑی دانت پیس رہی تھی۔

”کیا بات ہے، تم یہاں کیوں کھڑی ہو؟“ اس کی سہیلی نے پوچھا۔

”تمہیں ریمہ کی رخصتی کا دکھ نہیں ہو رہا؟“

”دکھ کرے میری جوتی، ریمہ نے میرے ساتھ جو سلوک کیا ہے، ایسا سلوک تو بڑے سے بڑا دشمن بھی نہیں کر سکتا۔“ لڑکی نے جواب دیا۔

”وہ مجھے ایک ہی مشورہ دیتی تھی کہ عامر سے جتنی ترش روی سے پیش آؤ گی، وہ تم سے اتنی ہی محبت کرے گا۔“

”یہ عامر کون ہے؟“ سہیلی نے پوچھا۔

”وہ جو سہرا باندھے ریمہ کا بازو پکڑے ہوئے پھولوں سے آراستہ کار کی طرف جا رہا ہے۔“ لڑکی نے افسردگی سے کہا۔

سارا حیدر، ساہیوال

ہیڈنگ

نوجوانی کمانڈر ایک سارجنٹ کے ساتھ نئے بھرتی ہونے والوں کے سامنے پہنچا، اس نے تعارفی تقریر شروع کی، چند تعارفی کلمات کے بعد وہ بالوں کی حجامت کے موضوع پر آیا۔

”بالوں کے معاملے میں آپ بالکل آزاد ہیں۔“ لے لے لے لے بالوں والوں نے اطمینان کی سانس لی، کمانڈر نے کہا۔

”آپ لوگ اپنی پسند کے بال رکھ سکتے ہیں، مگر ان کی لمبائی میرے بالوں سے زیادہ۔“ اس نے اپنے سر سے ٹوپی اٹھا کر اپنی سولجر کٹ حجامت دکھائی۔

”اور سارجنٹ کے بالوں سے کم نہ ہو۔“ سارجنٹ نے بھی اپنی ٹوپی اٹھائی، وہ گنجا تھا۔

ساجدہ احمد، ملتان

دوراندیش

ایک نوجوان نے اپنے دوست سے پوچھا۔
”تم نے اس کمپنی میں نوکری کیوں نہیں کی،

جہاں تم انٹرویو میں کامیاب ہو گئے تھے؟“
”مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہاں میرا کوئی

مستقبل نہیں ہے۔“ دوست نے جواب دیا۔
 ”یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟“ نوجوان نے
 حیرت سے پوچھا۔

”کمپنی کے مالک کی بیٹی پہلے سے شادی
 شدہ تھی۔“ دوست نے جواب دیا۔

صفہ خورشید، لاہور

مداخلت

بچہ ماں سے۔

”امی جان! آپ نے فرمایا تھا نا کہ انسان
 کو امید کا دامن کبھی نہیں چھوڑنا چاہیے؟“

”ہاں کہا تھا۔“ ماں نے جواب دیا۔

”آپ نے یہ بھی کہا تھا کہ خدا کے کاموں

میں دخل نہیں دینا چاہیے۔“

”لیکن بات کیا ہے تم کیوں پوچھ رہے

ہو؟“ ماں نے زچ ہو کر پوچھا۔

”بات صرف یہ ہے کہ میں امتحان میں فیل

ہو گیا ہوں۔“ بچے نے معصومیت سے جواب

دیا۔

عابدہ حیدر، بہاول نگر

خوف

بارش ہوئی تو ایک شخص نے خوشی کا اظہار

کرتے ہوئے کہا۔

”اب ہر طرف ہریالی ہی ہریالی نظر آئے

گی اور چند دنوں میں زمین کے اندر دبی اشیاء

باہر نکل آئیں گی۔“

”یا اللہ خیر۔“ دوسرے نے بدحواس ہو کر کہا۔

”میری تین بیویاں زمین میں دبی ہوئی ہیں۔“

آصفہ نعیم، نورث عباس

احسان مند

دعوت میں ایک ڈاکٹر کی ملاقات ایک

نوجوان لڑکی سے ہوئی لڑکی مسکرا کر کہنے لگی۔

”ڈاکٹر صاحب! آپ کے علاج سے جو

فائدہ مجھے پہنچا ہے میں اس کے لئے زندگی بھر

آپ کی احسان مند رہوں گی۔“

ڈاکٹر نے خوب صورت لڑکی کو دیکھ کر حیرت

انگیز لہجے میں کہا۔

”مجھے جہاں تک یاد پڑتا ہے میں نے کبھی

آپ کا علاج نہیں کیا۔“

”جی ہاں۔“ لڑکی نے جواب دیا۔

”دراصل میرے چچا آپ کے زیر علاج

تھے اور آج میں ان کی جائیداد کی تنہا وارث

ہوں۔“

فرینہ اسلم، میاں چنوں

ارادہ

ایک لڑکی نے اپنی سہیلی سے کہا۔

”میں طے کر چکی ہوں کہ جب تک میری

عمر بیس سال نہیں ہو جائے گی میں اس وقت تک

شادی نہیں کروں گی۔“ سہیلی نے کہا۔

”میں بھی طے کر چکی ہوں کہ جب تک

میری شادی نہیں ہو جاتی میں اس وقت تک ہرگز

بیس سال کی نہیں ہوں گی۔“

مہین آفریدی، ایبٹ آباد

دوراندی کی

”مجھ سے شادی کرلو۔“ نوجوان لڑکے نے

خوشامدانہ انداز میں ایک حسن فتنہ پرور سے کہا۔

”میرے والد کی تین کروڑ کی جائیداد ہے،

ان کی عمر ننانوے سال ہو چکی ہے، زیادہ سے

زیادہ سال چھ مہینے زندہ رہیں گے، میں ان کی

واحد اولاد ہوں، والد کے انتقال کے بعد ساری

دولت مجھے ملے گی۔“

ایک ہی ہفتے میں حسن فتنہ پرور نوجوان

لڑکے کی امی بن گئی۔

راحیلہ فیصل، سرگودھا

☆☆☆

عابدہ حیدر -----
مہکے سدا بہار کی صورت تیرا وجود
تو مسکرائے شام کی رعنائیوں کے ساتھ
خوشیاں تیرے نصیب کا حصہ رہیں سدا
وابستہ تیرا نام رہے شہنائیوں کے ساتھ

انتقاماً سمجھ کو وہ درس وفا دے جائے گا
زخم دے کر اک درد آشنا دے جائے گا
کس قیدِ رنادم ہوا ہوں میں برا کہہ کر اسے
کیا خبر تھی جاتے جاتے وہ دعا دے جائے گا

ہم بھی کیا لوگ ہیں خوشبو کی روایت سے الگ
خود پر ظاہر نہ ہوئے تجھ کو چھپانے کے لئے
آصفہ عظیم -----
دل میں تھی ویرانی ہم بھی تھے خاموش بہت
تم آئے تو جان گئے ہم موسمِ کتنا پیارا ہے
باتوں باتوں میں آؤ اس شخص کی بات کریں
جس کی خاطر اب دنیا کا ہر دکھ ہمیں گوارا ہے

ہم نے تو آنکھ سے آنسو رواں ہمارے ہوئے
کہ ہم پہ دوست بہت مہرباں ہمارے ہوئے
بہت سے زخم ہی ایسے جو ان کے نام کے ہیں
بہت سے قرض سر دوستاں ہمارے

نہ دید ہے نہ سخن اب نہ حرف ہے نہ پیام
کوئی بھی چیلہ تسلیں نہیں اور آس بہت ہے
امید یار نظر کا مزاج درد کا رنگ
تم آج کچھ بھی نہ پوچھو کہ دل اداس بہت ہے
فریادِ اسلم -----
میاں چنوں

ہر بار کی طرح تیرا یہ بے وفا سا وعدہ
معلوم ہے کہ جھوٹا مگر اعتبار لازم

میری بھیکتی پلکوں کے جو خواب ہیں ٹوٹے
تو تیری یادوں کے سب گلاب ہیں سوکھے
نیند میری پلکوں سے دور ہو گئی
جب سے تیرے سارے خواب ہیں روٹھے

آئینے میں غبار اتر آیا
عکس نکرا رہے ہیں پتھر سے
میں تھکن اڑھ کے کدھر جاؤں
آسمان ہٹ گیا ہے میرے سر سے
مہینِ آفریدی -----
آنکھوں میں بھر کے سادہ محبت کی ڈوریاں
منہ میں بند کر کے دل و جاں کی چوریاں
دھڑکی کو لوٹتی ہیں تبسم کی اوٹ سے
چالاک کس قدر ہیں یہ گاؤں کی گوریاں

ٹھہر جا آبلہ پا دن ذرا کچھ اور ڈھلنے دے
سلگتی ریت پر چلنا بڑا دشوار ہوتا ہے
جدائی کی رتوں نے ہی نہیں مارا مجھے
کسی کی یاد کا آسیب بھی خونخوار ہوتا ہے

اس شبنم وفا کو جو دل کی شکست پر
اک پل کو آکے رو گئی میں ڈھونڈتا پھرا
بے مہر آسمان کے تلے رسمِ دوستی
کسی دل میں جا کے سو گئی میں ڈھونڈتا پھرا
راحیلہ فیصل -----
سرگودھا
اس اذیت سے کسی طور رہائی تو ملے

اس کے لکھے ہوئے خطوط آج جلا ڈالتے ہیں
روگ تم دل کو لگا لیتے ہو اور لوگ بشیر
رہنما بھی ہو دو دن میں بھلا ڈالتے ہیں

ہم جو روئے تو انہیں کہنا پڑا
اس طرح کرتی ہے برسات سفر

تھی میری تباہی میں کچھ درختوں کی بھی سازش
ورنہ یہ اجڑنے کا موسم تو نہیں تھا
آمنہ خان

محبت تو ازل سے ہے محبت تا ابد ہو گی
اسے میں عصر حاضر کا عقیدہ کہہ نہیں سکتا
کتاب زندگی میں ہے رقم باب محبت بھی
مگر کتنی ہیں سطریں خط کشیدہ کہہ نہیں سکتا

کچھ میں ہی جانتا ہوں جو مجھ پہ گزر گئی
دنیا تو لطف لے گی میرے واقعات میں
میرا تو جرم تذکرہ عام ہے مگر
کچھ دھجیاں ہیں میری زینخا کے ہاتھ میں

ہر اک بار یہ سوچ کے دل بھر آیا ہے
اپنی عمر میں کیا کھویا کیا پایا ہے
صابرہ سلطانہ رشتی بھی آگ سے بجاتے ہیں
اب تو ٹوٹی رشتی بھی آگ سے بجاتے ہیں
ہاں کبھی تھا نام اپنا بخت آزماؤں میں
صرف اس تکبر میں اس نے مجھ کو جیتا ہے
ذکر نہ ہو اس کا بھی کل کو نارساؤں میں

عمر بھر سنگ زنی کرتے رہے اہل وطن
یہ الگ بات کہ دفنائیں گے اعزاز کے ساتھ

اپنی اپنی انا کے قیدی تھے
ہمارے بیچ کوئی دوسرا نہ تھا
حناشاہین

وہ تعلق توڑ کر مہربانی کر گیا
رہنما جو فانی تھا اس کو غیر فانی کر گیا
میں سمجھا تھا کہ مل کر داستان پوری ہوئی
وہ تو پتھر کر پھر بڑی لمبی کہانی کر گیا

تیرے گرد ہے میری دعاؤں کا دائرہ
میں تیری عافیت کی مبارک لکیر ہوں

چکانے ہیں وہ قرضے سطح پر ہیں کہیں زیر زمین ہیں
ابھی اس خاکوں میں تم بھی زندہ ہو رہے ہم بھی نہیں ہیں
ابھی میدان میں ہم اپنے پیروں پر کھڑے ہیں ہار کیسی
ابھی تو ٹھیل کا آغاز ہے تم بھی نہیں ہم بھی نہیں ہیں
سدرہ خانم

ایک مہینے بعد ملا تو نام بھی میرا بھول گیا
جس نے چلتے وقت کہا تھا یاد بہت تم آؤ گی

مل گئی جو محبت یاراں غنیمت جانے
پھر نہیں آتے پلٹ کر جب چلے جاتے ہیں دن
وقت اس کے ساتھ کچھ محسوس ہوتا ہی نہیں
جانے کس بل میں نہ جانے کب گزر جاتے ہیں دن

شہر طلب کرے اگر تم سے علاج تیرگی
صاحب اختیار ہو آگ لگا دیا کرو
آسیہ فرید
زندگی گزر جائے گی بہر صورت
تو کوئی شرط زندگی تو نہیں

ہم اپنے آپ میں یوں گم ہوئے ہیں عرصے سے
ہمیں تو جیسے کسی کا بھی انتظار نہیں
کسی کو ٹوٹ کے چاہیں کہ چاہ کر ٹوٹیں
ہمارے پاس تو اتنا بھی اختیار نہیں

یہ پھیلی ہوئی رات ڈھلے یا نہ ڈھلے
یہ یورش حالات ٹلے یا نہ ٹلے

روشن کر چراغ دہر و کعبہ
پر شمع خرابات چلے نہ چلے
مریم انصاری

میں نے جیسا ہے گلے مل کے پھنڑنے کا عذاب
میرے معبود کسی کو یہ سزا مت دینا

وہ یوں ملا ہے کہ جیسے کبھی ملا ہی نہ تھا
ہماری ذات پہ جس کی عنایتیں تھیں بہت
ہمیں خود اپنے ہی یاروں نے کر دیا رسوا
کہ بات کچھ بھی نہ تھی اور وضاحتیں تھیں بہت

ایک بیٹھا درد بھی دل میں کبھی پیدا ہوا
کیا اکیلے میں کسی دن آپ نے سوچا ہمیں؟
تو سمندر ہے ہماری پیاس کی کچھ لاج رکھ
یوں نہ اک دو گھونٹ پانی کے لئے ترسا ہمیں
عزہ فیصل

وہ جو اپنی جاں سے گزر گئے انہیں کیا خبر ہے کہ شہر میں
کسی جاں نثار کا ذکر کیا کوئی سو گوار بھی اب نہیں

خاک اڑاتی نہ تھی اس طرح تو ہوا اس کو کیا ہو گیا
دیکھو آواز دیتا ہے اک سانحہ شہر والو سنو
عمر بھر کا سفر جس کا حاصل ہے اک لمحہ مختصر
کس نے کیا گھو دیا کس نے کیا پالیا شہر والو سنو

میری آنکھوں میں آنسو پگھلتا رہا چاند جلتا رہا
تیری یادوں کا سورج ٹکلتا رہا چاند جلتا رہا
یہ دسمبر کہ جس میں کڑی دھوپ بھی پیٹھی لگنے لگی
تم نہیں تو دسمبر سلگتا رہا چاند جلتا رہا
نور انور

نیند سے خواب میں اتر جائے
آدی خامشی سے مر جائے
اک طرف آگ اک طرف پانی
آدی جائے تو کدھر جائے

دوستوں کے ہجوم شخص میں ناصر
میرے اندر کا شخص تنہا ہے

ان سبے ہوئے شہروں کی فضا کچھ کہتی ہے
کبھی تم بھی سنو یہ دھڑکی کچھ کہتی ہے
کبھی بھور بھٹے کبھی شام ٹرے کبھی رات گئے
ہر آن بدلتی رت کی ہوا کچھ کہتی ہے
فارہ سلیم

اس عہد میں الہی محبت کو کیا ہوا
چھوڑا وفا کو اس نے مروت کو کیا ہوا
امید وار وعدہ دیدار مر چلے
آتے ہی آتے یارو قیامت کو کیا ہوا

کسی کا یوں تو ہوا کون عمر بھر پھر بھی
یہ حسن و عشق تو دھوکا ہے سب مگر پھر بھی
ہزار بار زمانہ ادھر سے گزرا ہے
نئی نئی سی ہے کچھ تیری رہگور پھر بھی

سارا حصول عشق کی ناکامیوں میں ہے
جو عمر رائیگاں ہے وہی رائیگاں نہیں
ہوتا ہے راز عشق و محبت انہیں سے فاش
آنکھیں زباں نہیں ہیں مگر بے زباں نہیں
سارا حیدر

جہاں بدلا مگر آداب میخانہ نہیں بدلے
کبھی اسے گردش دوراں ادھر بھی آگئی ہوتی
مقام عاشقی دنیا نے سمجھا ہی نہیں ورینہ
جہاں تک تیرا غم ہوتا وہیں تک زندگی ہوتی

کوئی صورت نہیں ہے زندگی سے بچ نکلنے کی
غم و آلام کے ماروں کو بھی مرنے نہیں دیتی
مجھے معلوم ہے وعدہ نبھانا سخت مشکل ہے
مری کم ہمتی انکار بھی کرنے نہیں دیتی

حیدر رضا
اس کو کچھ تو بنا دیا ہے
ہم نے تھوڑا سا دھیان دے کر

خاک اڑتی ہے رات بھر مجھ میں
کون پھرتا ہے در بدر مجھ میں
مجھ کو مجھ میں جگہ نہیں ملتی
وہ ہے موجود اس قدر مجھ میں

مجھ کو تہذیب کے برزخ کا بنایا وارث
یہ الزام بھی میرے اجداد کے سر جائے گا
قاعدہ عبدالمنان
خلقت نہیں ہے ساتھ تو پھر بخت بھی نہیں
کچھ دن ہی رہے گا تو یہ تخت بھی نہیں
مایوس ہو کے دیکھ رہے ہیں خلا میں گھر
اتنی تو یہ زمین مگر سخت بھی نہیں

تھک گیا ہے دل وحشی مرا فریاد سے بھی
جی بہلتا نہیں اے دوست تیری یاد سے بھی
اے ہوا کیا ہے جو اب نظم چمن اور ہوا
صید سے بھی ہیں مراسم ترے صیاد سے بھی

میرے حق میں مخالف میں کبھی کچھ کہا تو ہو گا
مجھے چھوڑ جانے والا مجھے سوچتا تو ہو گا
یہ اداس اداس پھرنا یہ کسی سے بھی نہ ملنا
ہے یونہی نہیں یہ سب کچھ کوئی سانحہ تو ہو گا
حقیقہ منیر
نہیں اس میں کوئی منطق ہے یقین کی بات ساری
کہ جہاں رکھا ہے پاؤں وہاں راستہ تو ہو گا
کوئی درمیاں نہیں تھا کوئی درمیاں نہیں ہے
تو پھر ایسی قربتوں میں کہیں رابطہ تو ہو گا

کہا نہ تھا اسے مت ضبط کرنا
وہ آنسو اب سمندر ہو گیا نا !

یہ دکھ نہیں ہے کہ وہ سمجھا نہیں مرے فن کو
مخالفت کا سلیقہ نہیں تھا دشمن کو
میں کس مقام سے بولوں میں کس سے بات کروں
کہ خواہشات کا کارہ ملا ہے اسلم تن کو
صائمہ سلیم

اگرچہ تجھ سے بہت اختلاف بھی نہ ہوا
مگر یہ دل تری جانب سے صاف بھی نہ ہوا
تعلقات کے برزخ میں ہی رکھا مجھ کو
وہ میرے حق میں نہ تھا اور خلاف بھی نہ ہوا

نہ جانے کون سا فقرہ کہاں رقم ہو جائے
دلوں کا حال بھی اب کون کس سے کہتا ہے
میرے بدن کو کی کھا گئی ہے اشکوں کی
بھری بہار میں کیا مکان ڈھلتا ہے

لب خاموش چشم خشک کیا سمجھائیں گے تجھ کو
جو بارش دل میں ہوتی ہے جو دریا دل میں بہتا ہے
نازیہ جمال
وہ اک سایا جو تجھے میں دیا تھا اس کو خوابوں نے
وہی اب اس کا آپٹل ہے وہی اب اس کا گہنا ہے
لکھا تھاریت پر اک دوسرے کا نام کیوں ہم نے
نتیجے میں جو صدمہ ہے وہ ہم دونوں کو سہنا ہے

سنتا ہوں اب کسی سے وفا کر رہا ہے وہ
اے زندگی خوشی سے کہیں مر نہ جاؤں میں
اک شب بھی وصل کی نہ مرا ساتھ دے سکی
عہد فراق آ کہ تجھے آزماؤں میں

اپنا ہی تھا قصور کہ طوفانوں میں گھر گئے
اک موج تھی کہ جس کو کنارہ سمجھ لیا
سمن رضا
کبھی سا بیاں نہ تھا بہم کبھی کہکشاں تھی قدم قدم
کبھی مکاں کبھی لامکان مری آدمی عمر گزر گئی

بچ در بچ سلسلے دل کے
مجھے تیری تجھے کس کی تلاش

سکون ملتا ہے رونے سے دل کو بھی آذر
شدید ہو کبھی موسم تو بارشیں مانگوں
فائدہ عبدالمنان ---- کراچی
گفتگو کرنے کا کچھ اس میں ہنر ایسا تھا
وہ میری بات کا مفہوم بدل دیتا تھا

جنون میں ہوش کے سب سلسلے بھی ساتھ رکھتا ہے
وفا کرتا ہے لیکن فاصلے بھی ساتھ رکھتا ہے
کوئی آب و ہوا تو اس آئے گی کبھی اس کو
محبت کی ساری منطقیں بھی ساتھ رکھتا ہے

دھیان رکھنا ہر اک آہٹ سر پر
محببتوں میں میری بد حواسیاں نہ گنیں
عقیدہ منیر ---- سیالکوٹ
اسے کہو بہت نامراد شے ہے جنوں
اسے کہو کہ مجھے ہے بہت جنوں اس کا

خواہشوں کی محرمیاں مت پوچھ میرے ہم نفس
کہ میری نس نس میں خوابوں کا زہر اترتا ہے

ہم ہی کریں کوئی صورت انہیں بلانے کی
سنا ہے ان کو تو عادت ہے بھول جانے کی
جفا کے ذکر پہ تم کیوں سنبھل کے بیٹھ گئے
تمہاری بات نہیں بات ہے زمانے کی
صائمہ سلیم ---- کجرات

پانی پہ بھی ریت یہ تڑپی جتنی گئی
بتی رہی ہے دکھ کا چمبھی عنوان محبت
ہم نے پڑھے ہیں اتنے فسانے کہ بس

لگتا ہے ہر فسانے کی ہے جان محبت

رشتوں کو توڑنے میں ذرا احتیاط کرنا
رخ اپنا موڑنے میں ذرا احتیاط کرنا
ایسا نہ ہو کہ ایک دن پچھتاؤ ہر گھڑی
تم مجھ کو چھوڑنے میں ذرا احتیاط کرنا

اپنا آپل سنبھال کر چلنا
چھیڑ خانی ہوا کی عادت ہے
نازیہ جمال ---- چکوال
دل کو تمہاری یاد کے آنسو عزیز تھے
دنیا کا کوئی درد سمونے نہیں دیا
ناصر یوں اس کی یاد چلی ہاتھ تھام کر
میلے میں اس جہاں کو کھونے نہیں دیا

جو لگ چکی ہے گرہ دل میں کھل نہیں سکتی
تو لاکھ ملتا رہے ہم سے دوستوں کی طرح

مختصر لفظوں میں ہے اب یہ مزاج زندگی
رابطہ سب سے ہے مگر واسطہ نہیں
سمن رضا ---- چیچہ وطنی
ہر چارہ گر کو چارہ گری سے گریز تھا
ورنہ ہمیں جو دکھ تھے بہت لادوا نہ تھے

وہ ریت کر کے میرے خواب کی زمینوں کو
میرے وجود میں دریا تلاش کرتا ہے
گنوا کے مجھ کو کسی عہد خوش گمانی میں
وہ شاید اب کوئی مجھ سا تلاش کرتا ہے

تم نے گم کر دیا تھا دانستہ
اب بھرے شہر میں مجھے ڈھونڈو

چائیز سوپ

چھان کر ایک بڑی ساس پین میں ڈال دیں اور دوبارہ دھیمی آنچ پر رکھ دیں، ٹینڈے کے اوپر سبز چھلکا اتار کر اندر سے گودا بھی نکال دیں اور اس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر لیں، سبز پیاز کو بھی ایک ایک آنچ برابر کاٹ لیں، گھی میں میدہ ڈال کر سرخ کریں، اس میں سبز پیاز، ٹینڈا اور گوشت کے سلائس ڈال کر فرائی کریں، ساتھ ہی سویا ساس بھی ملا دیں، سوپ ڈال کر چند منٹ تک تمام اشیاء کو ابا لیں، ابلتے ہوئے سوپ میں گرینڈ کیا ہوا آمیزہ بھی ملا دیں، سوپ تیار ہو جائے تو سبز دھنیا کاٹ کر چھڑک دیں اور نوش فرمائیں۔

پوٹیشو سوپ

اشیاء
نخنی
آلو
پیاز
لہسن
ادرک
نمک
سیاہ مرچ پاؤڈر
گھی
میدہ
سلاد کے پتے
دودھ
ڈبل روٹی
ترکیب
آٹھ پیالی
ایک پاؤ
دو عدد
چھ پوٹھی
ایک ٹکڑا
آدھا کھانے کا چمچہ
آدھا چائے کا چمچہ
آدھا کپ
ایک کھانے کا چمچہ
آدھا کپ
ایک پیالی
دو سلائس

اشیاء
چکن ثابت ہیں
گھی
دودھ
پانی
سویا ساس
شلغم
ٹینڈا
پیاز سبز
ادرک
لہسن
پیاز خشک
سبز دھنیا
سیاہ مرچ پاؤڈر
نمک
میدہ
ترکیب
ایک عدد
آدھا کپ
ایک کپ
حسب ضرورت
دو کھانے کے چمچ
ایک عدد
ایک عدد
چار عدد
ایک پین
آدھی پوٹھی
ایک عدد
چند پتے
آدھا چائے کا چمچہ
آدھا چائے کا چمچہ
ایک چائے کا چمچہ

ثابت مرغی کے چار ٹکڑے لے لیں، اسے دو لیٹر پانی میں ڈال کر پکائیں، اس میں ایک عدد خشک پیاز، چار ٹکڑے کر کے ڈال دیں، ثابت لہسن، ادرک کا ایک ٹکڑا، نمک اور سیاہ مرچ شامل کر دیں، اس کے ساتھ شلغم چار ٹکڑے کر کے ڈال دیں اور ایک گھنٹہ تک ان سب کو ابا لیں، سوپ تیار ہو جائے تو گوشت کو نکال کر ایک ایک آنچ چوڑے ٹکڑے کر لیں، سوپ میں شامل تمام اشیاء کو گرینڈ کر کے پیسٹ بنالیں اور سوپ کو

بخنی میں ایک عدد پیاز، لہسن، ادرك، نمك، مریج اور ڈبل روٹی کے سلائس ڈال کر آدھا گھنٹہ تک ہلکی آنچ پر پکا میں، جب چھ پیالی پانی رہ جائے تو میدہ بھون کر ڈال دیں، پانچ منٹ بعد دودھ بھی ملا دیں، آلو کو ابال کر پیس کر پیسٹ بنالیں، بخنی میں اس پیسٹ کو ملا کر مکچر میں مکس کریں اور دوبارہ چولہے پر اس آمیزے کو چند منٹ ابالیں، سوپ تیار ہو جائے تو سلاڈ کے پتے ملا کر پیش کریں۔

گرین پیس سوپ

لیٹر پانی ملا کر پکانیں، دو گھنٹے بعد بخنی کو چھان لیں، ایک عدد پیاز کو بھی میں سرخ کریں اور اس میں دودھ اور میدے والا آمیزہ ڈال دیں، آخر میں پسے ہوئے مٹر ڈال کر مزید پندرہ منٹ تک پکانیں۔

چائیز سوپ

اشیاء

چکن

آدھا کلو

چار کھانے کے چمچ

ایک عدد

دو عدد

ایک چائے کا چمچ

ایک کھانے کا چمچ

دو عدد

حسب ذائقہ

حسب ذائقہ

کارن فلور

پیاز باریک کٹی ہوئی

انڈے صرف سفیدی

کالی مریج پس ہوئی

اجینو موتو

ہری مریج

سویا ساس

نمک

ترکیب

چکن کے پیس اچھی طرح دھولیں، ایک ساس پین میں چکن، باریک کٹی ہوئی پیاز، سیاہ مریج، نمک اور پانی ڈال کر بخنی تیار کریں، گوشت گل جائے تو بخنی چھان کر الگ نکال لیں، ابلی ہوئی بوٹیوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر لیں، ایک پیالی پانی میں کارن فلور کا آمیزہ اور چھوٹے چھوٹے گوشت کے ٹکڑے ڈال کر دھیمی آنچ پر چند منٹ تک پکانیں، جب سوپ آپ کی پسند کے مطابق گاڑھا ہو جائے تو انڈے کی سفیدی ملا دیں اور چمچ سے سوپ میں خوب اچھی طرح مکس کریں، لیچھے سوپ تیار ہے۔

چلی ساس بنانے کی ترکیب

اشیاء

سرخ مریج پس ہوئی

دو کھانے کے چمچ

دو کھانے کے چمچ

مرکہ

اشیاء
مٹر تازہ دانے
بخنی کے لئے ہڈی
گاجر
شلغم
پیاز
ادرك
لہسن
آلو
سبز دھنیا
میدہ
کھلی
پانی
دودھ
سیاہ مریج، نمک
سفید زیرہ
دارچینی
ترکیب

منروں کے دانے ابال کر پیس لیں، میدہ اور دودھ کو الگ رکھ دیں، گوشت کی ہڈی کے ساتھ پیاز، ادرك، لہسن، دارچینی، نمک، مریج، آلو، شلغم اور سبز دھنیا کاٹ کر ڈال دیں اور دو

نمک
چینی
ترکیب

سرخ مرچ کے پاؤڈر کو تھوڑے سے پانی
اور سرکہ میں گاڑھا گھول کر اس میں چینی اور نمک
ملا دیں اور ساس تیار کر لیں۔
چکن کارن سوپ

انڈوں کی سفیدی پھینٹ کر ملا دیں، بہترین
مزے دار سوپ تیار ہوگا۔
چکن کارن سوپ اور چلی ساس

اشیاء
چکن ابلّا ہوا
نخنی
مکئی کا دلیہ
پیاز باریک کتر لیں
لہسن
ادرک
سرکہ
سویا سوس
پانی
مسٹرڈ پاؤڈر رائی
کوکنگ آئل
نمک
چلی ساس
ترکیب

گوشت جو آپ ابال چکی ہیں اور اس کی
نخنی الگ کر چکی ہیں اس کے ریشے کر لیں کوکنگ
آئل کو ساس پین میں گرم کریں اور اس میں
باریک کترا ہوا پیاز مل لیں، خیال رکھیں کہ پیاز
سرخ نہ ہونے پائے، اب اس میں مکئی کا دلیہ ڈال
کر بھونیں ساتھ ہی لہسن، ادرک، سویا سوس،
مسٹرڈ پاؤڈر، سرکہ اور نمک ڈال کر نخنی بھی ملا دیں
اور پکنے دیں، پکتے ہوئے سوپ میں گوشت کے
ریشے ڈال کر سوپ کو پیالوں میں انڈیل لیں اور
چلی ساس شامل کر کے نوش کریں۔
چکن وٹماٹو سوپ

اشیاء
چکن
پیاز باریک کٹی ہوئی
ادرک
ایک عدد

اشیاء
چکن (گوشت)
پیاز
لہسن پسا ہوا
ادرک
سرکہ
انڈے
مکئی کے دانے پسے ہوئے
کارن فلور
سیاہ مرچ پاؤڈر
چینی
کوکنگ آئل
نمک
ترکیب

ساس پین میں دس کپ پانی ڈالیں اس
میں چکن کی بوٹیاں، پیاز، لہسن، ادرک اور نمک
ڈال کر چکن کو ابالیں یہاں تک کہ پانی چار کپ
رہ جائے گوشت اور نخنی کو الگ الگ کر لیں اور
گوشت کے ریشے بنالیں، ساس پین میں کوکنگ
آئل ڈال کر گرم کریں اور مکئی کے پسے ہوئے
دانے ڈال کر بھونیں پھر پانی ڈال کر کچھ دیر ان کو
گلائیں مکئی کے دانے نرم پڑ جائیں تو نخنی، چینی،
کالی مرچ اور گوشت کے ریشے ڈال کر دھیمی آنچ
پر آدھا گھنٹہ تک پکائیں، کارن فلور کو ہلکا سا بھون
کر شامل کر دیں، سوپ گاڑھا ہونے لگے تو

ترکیب
تمام سبزیوں کو دو پیالی پانی ڈال کر ابلنے
کے لئے رکھ دیں سبزیاں ابل جائیں اور پانی
ایک پیالی رہ جائے تو بخنی ملا دیں ساتھ ہی ساتھ
نمک اور سیاہ مرچ موٹی موٹی کٹی ہوئی شامل کر
دیں، آپ کی پسند کے مطابق سوپ گاڑھا ہو
جائے تو سویا سوس بھی ملا کر گرم مسالا چھڑکیں اور
پیش کریں۔

لذیذ چائیز سوپ

اشیاء

بخنی

چار پیالی

ایک عدد

انڈا

سویا سوس

دو کھانے کے چمچ

انگور کی تیل کے خشک پتے

(پاؤڈر بنالیں)

نمک

سیاہ مرچ پاؤڈر

ترکیب

ابلتی ہوئی بخنی میں سیاہ مرچ اور نمک

حسب ذائقہ ملا دیں، انڈے کو اس قدر پھینٹیں

کہ اس کا جھاگ ابھر آئے اب اسے کھولتی ہوئی

بخنی میں دھار باندھ کر آہستہ آہستہ ملا دیں اور

سیٹ ہونے دیں پھر چمچ سے ہلائیں سوپ کے

پیالے میں تیار شدہ سوپ انڈیلیں اس میں سویا

ساس ملائیں اور انگور کے پتوں کا پاؤڈر ڈال کر

نوش فرمائیں۔

☆☆☆

گاجر کش کی ہوئی
نمک
لہسن پیسا ہوا
ادریک پیسا ہوا
ہری مرچ
اجوائن
نمک، کالی مرچ
سفید زیرہ
ترکیب

سوس پین میں مکھن کو گرم کریں اور اس میں
باریک کٹی ہوئی پیاز ڈال دیں جب پیاز تھوڑی
سی سبز ہو جائے تو چکن ڈال کر فرائی کریں چکن
ہلکا سا فرائی ہو جائے تو کش کی ہوئی گاجر، لہسن
اور پیسا ہوا ادریک ڈال کر مزید فرائی کریں سبزیاں
اور گوشت فرائی ہو جائے تو ٹماٹر ڈال کر ڈیڑھ لیٹر
پانی ڈال کر دھیمی آنچ پر سوپ تیار ہونے دیں
سوپ گاڑھا ہونے لگے تو اجوائن، نمک، سیاہ
مرچ اور سفید زیرہ ڈال کر سبز مرچ کٹی ہوئی (تج
نکال کر) شامل کریں اور گرم گرم سوپ نوش
فرمائیں۔

دیجی ٹیبل گرین سوپ

اشیاء

بخنی

دو کپ

آدھا کپ

ایک عدد

آدھا کپ

دو عدد

ایک چائے کا چمچ

سیاہ مرچ ثابت موٹی کوٹ لیں

نمک

ایک چائے کا چمچ

حسب ذائقہ

گرم مسالا پاؤڈر

بالک کتری ہوئی

کھیرا باریک کٹا ہوا

سلاد کتری ہوئی

ٹماٹر گودا

سویا سوس

سیاہ مرچ ثابت موٹی کوٹ لیں

نمک

گرم مسالا پاؤڈر

حسب ذائقہ

گرم مسالا پاؤڈر

السلام علیکم!

بہت سی خوشیوں، کامیابیوں، ناکامیوں اور
آرزو کو اپنے دامن میں سمیٹے ایک اور سال اپنے
اختتام کی طرف رواں دواں ہے۔

سوچنے بیٹھیں تو ابھی کل کی بات تھی کہ دو
ہزار پندرہ کا آغاز ہوا تھا اور آج سال کا آخری
مہینہ دسمبر آ پہنچا۔

ابھی تو بہت سے کام ادھورے پڑے ہیں
جو کہ کرنے تھے ابھی تو ناراض دوستوں کو منانا تھا،
کچھ کے لاڈ اٹھانے تھے اور بہت سے پیاروں
کے مان بھرے شکوں کو منانا تھا، ابھی تو کچھ
پچھڑے جان شاروں کو ڈھونڈ کر عمر رفتہ کو آواز
دینی تھی، آج نہیں کل، کل نہیں پرسوں اس ہفتے
نہیں اگلے ہفتے ابھی بہت وقت بڑا ہے، کر لیں
گے، یہی کرتے کرتے تین سو پینسٹھ دن گزر
گئے۔

ابھی تو سامنے کی دیوار پر لگے ان گزرتے
بارہ ماہ کے اعداد شمار بتانے والے کلینڈر کی تازگی
نہی ماند نہیں پڑی کہ سال کے اختتام کا گھنٹہ بج
گیا، یوں لگتا ہے وقت کو جیسے پر لگ گئے ہوں،
تیزی سے گزرتا یہ وقت ہی انسان کی سب سے
قیمتی متاع ہے اور حیرت کی بات یہ ہے کہ یہ
حضرت انسان اس قیمتی متاع سے ہی سب سے
زیادہ غافل ہے، جبکہ ہم یہ جانتے بھی ہیں کہ اس
کے لئے ایک دن جواب دہ ہونا پڑے گا، کہ ہم
نے وقت کن کاموں میں صرف کیا۔

خوب سے خوب تر کی تلاش انسان کو

دوڑائے رکھتی ہے اور اس تک دو میں انسان یہ
بھول جاتا ہے کہ اس کے ہاتھ کیا پھسلتا جا رہا
ہے، زندگی کتنی بھی طویل کیوں نہ ہو، پیچھے مڑ کر
دیکھو تو خواب لگتی ہے، اس بھاگتی دوڑتی زندگی
میں کچھ بھی مستقل نہیں ہاں یہ طے ہے اختتام اہل
ہے اور مہلت جو دی ہے اس کا حساب کتاب بھی
ایک ہا مقصد زندگی اور اچھے اعمال ہی روشنی ہے،
ورنہ انسان تو خسارے میں ہی ہے۔

آئیے اللہ تعالیٰ کے حضور دعا کریں کہ وہ
ہمیں ہا مقصد اور صالح زندگی گزارنے کی توفیق
عطا کرے آمین یا رب العالمین۔

اپنا بہت سا خیال رکھیے گا اور ان کا بھی جو
آپ کا خیال رکھتے ہیں، جو آپ سے محبت کرتے
ہیں۔

چلیں اب آپ کے خطوط کی محفل میں چلتے
ہیں حسب عادت درود شریف، کلمہ طیبہ اور
استغفار کا ورد کرتے ہوئے۔

یہ پہلا خط ہمیں چیچہ وطنی سے آمنہ
سیماب کا موصول ہوا ہے وہ لکھتی ہیں۔

نومبر کا شمارہ سات تاریخ کو خوبصورت
سرورق سے سجایا، مہربان سید نے اپنی سحر انگیز
شخصیت کی بدولت ٹائٹل کو چار چاند لگا دیئے،
”کچھ باتیں ہماریاں“ میں سردار صاحب نے
وقت کی ضرورت کے مطابق بہت اچھی باتیں
کی، حمد و نعت اور پیارے نبی کی پیاری باتیں حنا
کا بہترین سلسلہ ہے یقیناً جس کام کے شروع
میں اللہ کا نام لیا جائے وہ بہترین ہوتا ہے، انشاء

جی ”کچھ حسب حال“ کے ساتھ موجود تھے، باخدا ان کا لکھا ہوا ایک ایک لفظ موجودہ حالات کی عکاسی کر رہا تھا، ”ایک دن حنا کے ساتھ“ میں مبشرہ انصاری صائبہ کی روداد سنی، معذرت کے ساتھ نہ جانے کیوں وہ کچھ کچھ خود پسندی لگیں، خیر آگے بڑھے ”پر بت کے اس پار کہیں“ پہنچے اس امید کے ساتھ کہ شاید نایاب جیلانی اپنی مخصوص انداز تحریر کے ساتھ مل جائے، مگر نہ جی وہی سفر نامے کا انداز، کہانی پڑھتے وقت کوئی مزہ نہیں آیا یہ میں ہی نہیں اور بہت سے لوگ بھی کہتے ہیں۔

پلیئر نایاب جی کچھ نیا پن اور اپنا مخصوص انداز لائیں ناول میں، ام ایمان کا ناول ”اندھیرے چھٹ گئے“ بے حد پسند آیا، ام ایمان مبارک باد قبول کریں، حنا میں ہم آپ کی مزید تحریروں کے منتظر رہیں گے، اب بات ہو جائے فاطمہ خان کے ناول ”ہارے بھی تو بازی بات نہیں“ فاطمہ خان کا نام اس سے پہلے دیکھنے کو نہیں ملا، اگر یہ ان کی پہلی تحریر تھی تو بے حد اچھی تھی، اگرچہ ناول میں کہیں کہیں تحریر گرفت سے باہر تھی مگر اس کے باوجود دلچسپی برقرار رہی، لیکن کیا تھا کہ مصنفہ ریحام کو اگر زندہ رہنے دیتی اور حسن کی زندگی میں خوشیاں بکھیر دیتیں، ہماراؤ کے ناولٹ کا آخری حصہ پسند آیا، اس ناولٹ کا اینڈ ہمارے ویسا ہی کیا جیسا ہماراؤ کا انداز تھا یعنی پی پی پی، ونڈر فل ہمارا آپ کی مزید تحریروں کا انتظار رہے گا۔

سدرۃ المنتہی کے ناول ”اک جہاں اور ہے“ میں پہنچے، پڑھتے ہوئے نظر اس مراسلے پر پڑی جس میں سدرۃ المنتہی کے والد صاحب کے انتقال کی خبر تھی، بے حد افسوس ہوا دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ سدرۃ المنتہی کے والد کو جنت میں اعلیٰ مقام

دے اور سدرۃ کے گھر والوں کو صبر جمیل عطا کرے بلاشبہ والدین ایسی نعمت ہیں جس کا نعم البدل کوئی بھی نہیں، سویرا فلک کا ناولٹ ”تمہاری وفا ہی کافی ہے“ کوئی خاص تاثر نہ چھوڑ سکا، افسانوں میں رمشا احمد کا افسانہ ”یہ دل کے رشتے“ اس ماہ کی بہترین تحریر تھی جبکہ کنول ریاض کا افسانہ ”اک عام سی کہانی“ پڑھ کر ایک مرتبہ دل کانپ کر رہ گیا، مصنفہ نے بالکل سچ لکھا ہے کہ لوگ بیٹے کے لئے دعا کرتے اور اصرار کرتے ہیں جیسے یہ بہو کے بس میں ہو، اسی لئے تو بزرگوں کا کہا کہ اولاد کے لئے جب بھی دعا مانگو اس کی صحت و سلامتی اور مکمل اعضاء کے ساتھ دنیا میں آنے کی مانگو، سیمیں کرن کا افسانہ ”مکمل“ بھی بہترین تھا۔

نورین شاہد کی تحریر ”ہلکی سی مسکراہٹ“ پڑھ کر بے حد مزہ آیا، حنا اصغر کا افسانہ بھی پسند آیا، مستقل سلسلے بھی بہترین تھے، حاصل مطالعہ میں قارئین کے بہترین ذوق کا آئینہ دار تھا جبکہ میری ڈائری اور بیاض میں انتخاب بہترین تھا، رنگ حنا نے ہمیشہ کی طرح مسکراہٹوں کے پھول بکھیرے، افراح طارق حنا کے دسترخوان میں اپنے بہترین سکھڑاپے کا مظاہرہ کیا، کس قیامت کے یہ نامے میں ہمیشہ کی طرح فوزیہ آپی مسکراتی ہوئی سب کو دیکھ کر کہتی ملیں، خطوط کے صفحات اگرچہ کم ہوتے ہیں مگر جتنے بھی ہوں مزہ آتا ہے اس سلسلے کو پڑھ کر۔

آمنہ سیما ب خوش آمدید دل و جان سے اس محفل میں، نومبر کے شمارے کو پسند کرنے کا شکریہ آپ سب دوستوں کی یہ محبتیں ہی ہمارا حوصلہ بڑھاتی ہیں اور ہم حنا کو مزید بہتر بنانے کی کوششوں میں لگ جاتے ہیں، آپ کی تعریف و تنقید اس سطور کے ذریعے مصنفین کو پہنچائی جا

رہی ہیں، اپنی رائے سے آگاہ کرتی رہے گا، ہم آئندہ بھی آپ کی رائے کے منتظر رہیں گے شکریہ۔

رابعہ انور: سرگودھا سے آئیں ہیں وہ اپنی رائے کا اظہار کچھ یوں کر رہی ہیں۔

نوزیہ آبی میں ایک عرصے سے حنا کی قاری ہوں اکثر سوچتی تھی کہ میں بھی نامے کی اس محفل میں شرکت کروں مگر بس سوچ کر رہ جاتی تھی، اس مرتبہ مجھے سدرۃ المنتہی کے والد صاحب کی وفات کی خبر نے قلم اٹھانے پر مجبور کر دیا، یقین کریں سدرۃ المنتہی آپ کے والد کے بارے میں پڑھ کر مجھے بے حد افسوس ہوا آپ میری پسندیدہ مصنفہ ہیں، آپ کا دکھ مجھے اپنا دکھ محسوس ہوا میں آپ کے لئے بہت زیادہ دعا گو ہوں کہ اللہ پاک آپ کو دکھ کے ان لمحوں میں ہمت اور صبر عطا کرے، اللہ کی رضا کے سامنے ہم سب سر تسلیم خم ہیں اللہ پاک انکل کو جنت میں بہترین جگہ عطا کرے آمین۔

اب آپ حنا کی تحریروں کے مطلق بھی بات کر لوں اس ماہ یعنی نومبر کے شمارے کی بہترین تحریر فاطمہ خان کا مکمل ناول ”ہارے بھی تو بازی مات نہیں“ تھا، بہت خوب فاطمہ آپ نے بے حد اچھی تحریر لکھی آخر میں آنکھوں میں بے اختیار آنسو آگے ریحام کی موت پر، ساری کہانی آرمی والوں کی محبت میں ڈوب کر لکھی گئی تھی، یقیناً فاطمہ خان حنا میں اچھا اضافہ ہیں، ام ایمان کا مکمل ناول بھی بہترین تھا بس اس کا عنوان کچھ خاص نہیں تھا ورنہ اس کی اسٹوری بہترین تھی، سویرا ٹلک اور ہماراؤ کا ناول بھی پسند آیا، جبکہ افسانے بھی اچھے تھے سلسلے دار ناولوں میں سدرۃ المنتہی کے ناول کی تو کیا ہی بات ہے ایک ایک لفظ دل میں اترتا ہے، جبکہ نایاب جیلانی بھی بہترین

لکھ رہی ہیں، مستقل سلسلے بھی بہترین تھے، آپ حنا کی مصنفین میں طیبہ ہاشمی، عقیلہ ہاشمی، صائمہ محبوب، مناہل بٹ، سمیع جبین وغیرہ کدھر غائب ہیں ایک عرصہ ہو گیا ان نے حنا میں حاضری نہیں لگائی۔

رابعہ انور خوش آمدید ڈیر آپ نے اتنا عرصہ کیوں سوچتی رہی شرکت کے لئے، جبکہ ہم بار بار کہتے ہیں کہ یہ آپ سب کا اپنا ماہنامہ ہے اس میں آپ سب بلا جھجک چلے آیا کریں، آپ کے جذبات سدرۃ المنتہی تک ان سطور کے ذریعے پہنچائے جا رہے ہیں، حنا کو پسند کرنے کا شکریہ اپنی رائے اور محبتوں سے حنا کو نوازی رہے گا ہم منتظر رہیں گے شکریہ۔

عابد محمود: ایک عرصے بعد اس محفل میں شرکت کے لئے آئے ہیں وہ لکھتے ہیں۔

نومبر کا شمارہ عمدہ سرورق کے ساتھ سجایا انکل سردار محمود کی باتیں ہمارے لئے لمحہ فکریہ ہیں کاش ہم لوگ ان باتوں پر عمل کر سکیں، حمد و نعت اور پیارے نبی کی باتیں پڑھ کر روحانی پاکیزگی حاصل ہوئی، ایک دن حنا کے ساتھ میں مبشرہ انصاری سے ملاقات خوب رہی۔

طویل تحریروں میں ”پر بت کے اس پار کہیں“ نایاب جیلانی، ”اک جہاں اور ہے“ سدرۃ المنتہی، ”ہارے بھی تو بازی مات نہیں“ فاطمہ خان، ”پچھڑنا بھی ضروری تھا“ ہماراؤ بے حد پسند آئیں ان کے رائٹرز کو مبارکباد پیش کرتا ہوں، معروف رائٹر سدرۃ المنتہی کے والد فیاض احمد شاہ کی ناگہانی موت پر انتہائی دکھ ہوا اللہ سائیں مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں رکھے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے آمین۔

کالم کس قیامت کے یہ ناموں میں آپ نوزیہ نے ٹھیک ہی تو کہا ہے کہ نفرت اور تعصب

کی آندھی نے انسانی قدروں کو پامال کر دیا ہے، کاش لوگ آپس میں اخوت، رواداری اور محبتوں کو فروغ دیں تو معاشرے کی ماحولاریاں ختم ہو جائیں۔

بھائی عابد محمود خوش آمدید ایک طویل وقفے کے بعد آپ نے اس محفل کو رونق بخشی، حنا کو پسند کرنے کا شکریہ آپ کی رائے مصنفین کو پہنچائی جا رہی ہے، شکر یہ قبول کریں ان کی طرف سے بھی، مستقل سلسلوں میں آپ کا انتخاب دیر سے موصول ہونے کی وجہ سے شائع نہیں ہو سکا انشاء اللہ اگلے ماہ شائع کریں گے، اپنی قیمتی رائے سے آگاہ کرتے رہا کریں شکریہ۔

فرزانہ علی بیگ نپائے مختصر سے تبصرہ کے ساتھ حاضر ہوئیں ہیں وہ بھی ہیں۔

ماہ نومبر کا شمارہ ملا سرورق بہت ہی پیارا تھا، مگر نومبر کے حنا میں آپ نے کوئی تحریر نہ لکھ کر اس قدر مایوسی ہوئی کہ کیا بتاؤں، مگر پھر یہ سوچا کہ مایوسی گناہ ہے اور پھر حنا میں اپنی تحریروں کے ساتھ حاضر ہیں باقی تمام سلسلے بھی لا جواب تھے، پیارے نبی کی پیاری باتیں ایمان افروز تھیں، انشاء نامہ کچھ حسب حال لا جواب تھا افسانوں میں ہلکی سی مسکراہٹ محبت ایک روشن دیا اچھے تھے، سلسلے وار ناول ”پر بت کے اس پار کہیں“ اچھا لگا، ناولٹ ”تمہاری وقا ہی کافی ہے“ اچھا تھا، سارہ حیدر کا اشعار بہت اچھا تھا، حاصل مطالعہ میں عالیہ بٹ کی تحریر بہت پسند آئی، عین عین کی محفل میں آسیہ فرید کا سوال اچھا رہا پورا شمارہ قابل تعریف تھا، اس کے ساتھ ہی اجازت دیں۔

فرزانہ بیگ خوش آمدید، ہمیں افسوس ہے کہ نومبر کے شمارے میں آپ کو اپنی کوئی تحریر نظر نہ آئی، اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کی مستقل سلسلوں

نے آپ کی تحریریں دیر سے موصول ہونے کی وجہ سے رہ جالی ہیں، لیکن ہم ضائع نہیں کرتے، انشاء اللہ اگلے ماہ شائع کریں گے، حنا کے لئے پسندیدگی کے لئے شکریہ۔

سیدہ فاطمہ عروج کی ای میل ملتان سے موصول ہوئی ہے وہ بھی ہیں۔

پہلی مرتبہ کسی ماہنامے میں اپنی رائے کا اظہار کر رہی ہوں، ماہنامہ حنا کا شمار لاہور سے شائع ہونے والے ماہناموں میں سے بہترین ہے، نومبر کے شمارے میں بھی مصنفین کی تحریریں پسند آئیں۔

حنا کی خاص بات اس کی ای میل سروس ہے جس میں جب بھی میل کرو فوراً ریپلائی ملتا ہے اس کے علاوہ حنا میں شرکت کرنے کے لئے اگر کچھ پوچھا جائے تو بے اچھی رہنمائی کی جاتی ہے، دعا گو ہوں کہ اللہ پاک حنا کو مزید کامیابیوں سے نوازے آمین۔

سیدہ فاطمہ عروج خوش آمدید، ماہنامہ حنا کو پسند کرنے کا شکریہ، آئندہ ہم آپ کی تفصیلی رائے کے منتظر رہیں گے شکریہ۔

☆☆☆

(نوٹ)

نومبر کے شمارے میں پیاری بہن سدرۃ المنسی کے والد فیاض احمد شاہ صاحب کی وفات کی خبر شائع ہوئی، بہت سی بہنوں نے ہمیں فون ای میل اور خطوط کے ذریعے سدرۃ المنسی سے دکھ اور افسوس کا اظہار کیا، صفحات کی کمی کی بناء پر ہم سب کے مراسلے شائع نہیں کر سکے لیکن ان کے جذبات ہم سدرۃ المنسی تک ان صفحات کے ذریعے پہنچا رہے ہیں۔